



اسلامیات

برائے ڈگری کلاسز

مصنف

مفتي اعظم پاکستان

مفتي منیب الرحمن

ناشر وطبع

مکتبہ فنریدی کراچی

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	تعارف مصنف (جسٹ علامہ مفتی سید شجاعت علی قادری)	17
2	نقش اول	19
3	کچھ اس کتاب کے بارے میں	21
4	نظر ثانی شدہ ایڈیشن	22
5	نصاب اسلامیات (لازی)	23
6	باب اول	25
7	قرآن مجید	25
8	قرآن کیا ہے	25
9	قرآن ناسخ الکتب	25
10	اسماء قرآن	26
11	قرآن پر ایمان فرض عین	28
12	قرآن کی آیات اور سورتوں کی تعداد	28
13	قرآن مجید کی پہلی اور آخری وحی	29
14	قرآن کی ترتیب	29
15	حافظتِ قرآن و اعجازِ قرآن	30
16	قرآن کارسم الخط	30
17	الفاظ و معانی کا مجموعہ	30

31	مکی و مدنی سورتیں	18
32	ترتیب نزولی و توقیفی	19
32	سبب نزول و شانِ نزول	20
33	قرآن کا چینچ	21
34	قرآن مجید کی تحدیات یا چینچ کئی مراحل پر مشتمل ہیں	22
41	تدوین قرآن	23
43	تعداد آیات میں اختلاف	24
44	سُورَةُ الْفُرْقَان (ترجمہ و تشریح)	25
61	سُورَةُ الْحُجَّرَات (ترجمہ و تشریح)	26
61	ابتدائی خاکہ	27
91	حدیث و سنت	28
91	تعريف حدیث	29
91	سنۃ کا مفہوم	30
93	ضرورتِ حدیث	31
93	حجیت حدیث	32
98	منتخب احادیث (یہ احادیث کراپی کے تمام کالجوں کے لیے منتخب کی گئی ہیں)	33
98	حدیث نمبر: 1، نعمتوں پر شکر ادا کیا جائے	34
102	حدیث نمبر: 2، خلاف واقعہ بات کہنے کی رخصت کب ہوتی ہے؟	35
105	حدیث نمبر: 3، انسانی شرف و فضیلت کے دو معیار	36
108	حدیث نمبر: 4، بیتیم کی کفالت	37
110	حدیث نمبر: 5، حقیقی مسکین	38

113	حدیث نمبر: 6، بیٹیوں کی کفالت پر اجر	39
116	حدیث نمبر: 7، کمزوروں کی مدد کرنے کی فضیلت	40
118	حدیث نمبر: 8، اہل و عیال پر خرچ کرنے کی فضیلت	41
120	حدیث نمبر: 9، دینے والا ہاتھ بہتر ہوتا ہے	42
123	حدیث نمبر: 10، اللہ کی راہ میں پسندیدہ چیز دینا	43
126	حدیث نمبر: 11، حلال و حرام واضح ہیں	44
130	حدیث نمبر: 12، نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے	45
130	حدیث نمبر: 13، نیکی اور بدی کی ظاہری کیفیت	46
134	حدیث نمبر: 14، مشکوک اور مشتبہ امور سے دوری کی تعلیم	47
136	حدیث نمبر: 15، تواضع اور انکسار کی فضیلت	48
136	حدیث نمبر: 16، تواضع اور انکسار کی عملی مثال	49
140	حدیث نمبر: 17، حسن اخلاق کی فضیلت	50
142	حدیث نمبر: 18، تقویٰ اور اچھے اخلاق کی اہمیت	51
144	حدیث نمبر: 19، اچھے اخلاق کی اہمیت	52
146	حدیث نمبر: 20، اختیاری معاملات میں آسانی کو اختیار کرنا	53
 منتخب احادیث		54
149	(صرف کراچی یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے)	
149	حدیث نمبر: 1، آخرت کے اجر کا مدار تقویٰ و اخلاص پر ہے	55
152	حدیث نمبر: 2، غیظ و غصب پر قابو پانے والا ہی حقیقت میں بھادر ہے	56
154	حدیث نمبر: 3، جہت و جہنم کے راستے	57
157	حدیث نمبر: 4، نیکی کو حقیر نہ جانو	58
159	حدیث نمبر: 5، نیکی کے لیے سبقت کرنا	59

161	حدیث نمبر: 6، قبر میں اعمال ساتھ دیتے ہیں	60
163	حدیث نمبر: 7، کامل ایمان کا معیار	61
165	حدیث نمبر: 8، دنیا میں حد سے زیادہ رغبت کی ممانعت	62
166	حدیث نمبر: 9، برا یوں کورو کرنے کا حکم	63
168	حدیث نمبر: 10، صدقہ جاریہ	64
171	حدیث نمبر: 11، منافق کی نشانیاں	65
174	حدیث نمبر: 12، ایمان کی متعدد شاخیں	66
177	حدیث نمبر: 13، مومنوں کے آپس میں تعلق کی مثال	67
178	حدیث نمبر: 14، جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم	68
181	حدیث نمبر: 15، مسلمان کی جان و مال کی حرمت	69
183	حدیث نمبر: 16، توبہ کی اہمیت	70
186	حدیث نمبر: 17، بیٹیوں کی عمدہ تربیت کا اجر	71
188	حدیث نمبر: 18، ہر شخص جواب دہ ہے	72
191	حدیث نمبر: 19، پڑوی کی اہمیت	73
193	حدیث نمبر: 20، صلہ رحمی کی برکات	74
197	منتخب احادیث (سنده یونیورسٹی کے منظور شدہ نصاب کے مطابق)	75
197	حدیث نمبر: 1، بندے پر نعمت کے اثرات	76
198	حدیث نمبر: 2، اپنے سے کمتر کو دیکھ کر شکر ادا کرنا	77
200	حدیث نمبر: 3، دینی بھائی سے محبت کا اظہار	78
201	حدیث نمبر: 4، پڑوی کا خیال رکھنا	79
203	حدیث نمبر: 5، بہترین جہاد انصاف کی بات	80

	حدیث نمبر: 6، مناسیب میں شانیاں	81
205		
207	حدیث نمبر: 7، حرص و لامج سے بچو	82
209	حدیث نمبر: 8، نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے	83
209	حدیث نمبر: 9، جنت اور دوزخ کے راستے	84
211	حدیث نمبر: 10، اپنی اولاد کو نماز کا حکم دینا	85
211	حدیث نمبر: 11، دوست بنانے کا معیار	86
213	حدیث نمبر: 12، عقلمند شخص کون؟	87
214	حدیث نمبر: 13، حقیقی طاقتوں	88
216	حدیث نمبر: 14، اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو	89
217	حدیث نمبر: 15، نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والے کا اجر	90
218	حدیث نمبر: 16، صلہ حمی کرنے پر رزق اور عمر میں اضافہ	91
219	حدیث نمبر: 17، اصل مالداری دل کا غنی ہونا ہے	92
220	حدیث نمبر: 18، تقویٰ اور اچھے اخلاق کی اہمیت	93
220	حدیث نمبر: 19، دینے والا ہاتھ بہتر ہوتا ہے	94
220	حدیث نمبر: 20، اختیاری معاملات میں آسانی اختیار کرنا	95
221		
222	سوالات	96
222	باب دوم: دین اسلام	97
222	توحید	98
222	وجود باری تعالیٰ کے دلائل	99
224	۱۔ نظام کائنات کے نظم و ضبط سے استدلال	100

226	۳۔ جانوروں کے دودھ سے استدلال	102
226	۲۔ ہوا اور پانی سے استدلال	103
228	۵۔ انقطاری اسباب سے استدلال	104
228	۶۔ انسانی وجود اور اس کے تخلیقی مرحلے سے استدلال	105
230	توحید کے دلائل	106
232	شرک کی تعریف	107
233	دہریوں کا عقیدہ	108
233	وجود باری تعالیٰ اور علومِ جدیدہ	109
234	انفرادی اور اجتماعی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات	110
234	خالق کی بندگی سے نجات	111
235	۲۔ مقام انسانیت کا ادراک	112
235	۳۔ اصلاح نفس اور عدل سخاوت اور شجاعت ایسی صفات سے آرائی	113
236	۴۔ عالمگیر انسانی اخوت کی بنیاد	114
237	۵۔ دنیوی اور آخری نجات کا ضامن	115
238	رسالت	116
238	ضرورت نبوت	117
238	منصب نبوت و رسالت	118
242	۱۔ شارح کتاب اللہ	119
243	۲۔ شارع احکام خداوندی	120
243	۳۔ قاضی اور حکم مطلق	121
244	۲۔ معلم کتاب و حکمت	122
245	ایمان بالرسول کے تقاضے	123

247	۱۔ مجت رسول	124
248	۲۔ اتباع و اطاعت رسول	125
249	انبیاء کرام کی خصوصیات	126
249	۱۔ عصمت	127
250	۲۔ وہبیت	128
251	۳۔ بشریت	129
253	۴۔ تعلیمات منجانب اللہ	130
255	ختم نبوت	131
260	آخرت	132
261	آخرت کے بارے میں باطل نظریات کا عقلی تجزیہ	133
261	۱۔ مادہ پرستوں یاد ہریوں کا نقطہ نظر	134
262	منکرین آخرت کا رد اور قرآنی دلائل	135
262	۱۔ آخرت تقاضائے فطرت	136
264	۲۔ منکرین آخرت کی غلط فہمی کا ازالہ	137
266	منکرین آخرت کا جزا و سزا کا زوالہ فلسفہ	138
268	۳۔ عقیدہ تناسخ (آواگون)	139
269	۵۔ یہود و نصاریٰ کا عقیدہ آخرت اور اس کا تجزیہ	140
273	۶۔ اعمال انسانی کا ریکارڈ	141
275	عقیدہ آخرت کے انسانی زندگی پر اثرات	142
275	۱۔ احساس جواب دہی	143
276	۲۔ نفس اور باطن کی اصلاح	144
276	۳۔ اللہ کی نیازمندی، غیر اللہ سے بے نیازی	145

	167
	168
	168
	169
	170
	171
	172
	173
	174
	175
	175
	176
	177
	178
	179
	180
	181
	182
	183
	184
	185

279	۲۔ اخلاقِ عمل اور تہیت	146
277	عبادات	147
277	عبادت، معنی و مفہوم	148
277	اسلام کا تصور عبادت	149
280	نماز	150
280	نماز کے معنی	151
280	نماز کی اہمیت	152
281	اسلام میں نماز کی تاریخ	153
282	فرائض و سنن	154
284	نماز کی دینی، اخلاقی اور روحانی حکمتیں اور فوائد	155
284	۱۔ اللہ کی بارگاہ میں عجز و نیاز اور خشوع و خضوع	156
284	۲۔ محمرات و منوعات سے اجتناب	157
285	۳۔ نماز با جماعت اخوت و مساوات کا عظیم مظاہرہ	158
285	۴۔ بے نمازوں کی مفہی سوچ	159
287	زکوٰۃ	160
287	زکوٰۃ کی اہمیت	161
287	احکام زکوٰۃ	162
288	مصارف زکوٰۃ یا مستحقین زکوٰۃ	163
289	شرح زکوٰۃ	164
290	زکوٰۃ کے مقاصد	165
291	روزہ	166
295		

295	روزے کی اہمیت	167
297	روزے کے مسائل	168
298	روزے کے مقاصد	168
298	۱۔ تقویٰ	169
299	۲۔ اخلاص اور للہیت	170
299	۳۔ روحانی ارتقاء اور ضبط نفس کی تربیت	171
300	انسانی ہمدردی کی ترغیب و تحریض	172
301	حج	173
301	حج کا معنی و مفہوم	174
301	استطاعت سے مراد	175
302	حج کی اقسام	175
302	اصطلاحات کی تشریع	176
302	حرام	177
302	میقات	178
303	طواف	179
303	سعي	180
303	وقوف عرفہ	181
303	رمی جمرات	182
303	نحر اور حلق	183
303	زيارة روضۃ بنوی صلی اللہ علیہ وسلم	184
304	حج کی اہمیت	185

306	حج کے مقاصد اور حکمتیں	186
306	۱۔ ذریعہ مغفرت و نجات	187
306	۲۔ اسلامی وحدت ملی کا عظیم مظاہرہ	188
307	۳۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا بے ساختہ اظہار	189
308	۴۔ حج کی شان جامعیت	190
309	جہاد	191
309	جہاد کے معنی و مفہوم	192
311	جہاد کی مختلف صورتیں یا قسمیں	193
311	۱۔ جہاد بِالنفس	194
312	۲۔ جہاد بالسان والقلم یا جہاد بالعلم	195
313	۳۔ جہاد بالمال	196
313	۴۔ جہاد بالسیف	197
315	اہم سوالات	198
318	باب سوم: اسوہ حسنہ	199
318	حضرور ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ	200
318	ولادت سے پہلے دُنیا کی حالت	201
319	ولادت سے بعثت تک کے واقعات	202
319	حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ	203
320	ولادت با سعادت	204
321	رضاعت	205
322	حضرت آمنہ کی وفات	206
323		

323	عبدالمطلب اور ابوطالب کی کفالت	207
323	شام کا پہلا سفر	207
323	حرب فارمیں شرکت	208
324	حلف الفضول	209
324	شام کا دوسرا سفر	210
325	حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح	211
326	اولاد امجاد	212
326	تعمیر کعبہ	213
327	طلوع آفتاب رسالت یعنی بعثت نبی صلی اللہ علیہ وسلم	214
329	تبیغ کی ابتداء	215
330	اعلائیہ تبلیغ کا حکم	216
331	صحابہ کرام پر کفار مکہ کا ظلم و ستم	217
333	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی ذہنی و جسمانی اذیتیں	218
334	۶۔ مجزات کامطالہ	219
335	ہجرت جبše	220
335	حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام	221
335	۷۔ تاؤ انبوی	222
336	شعب ابی طالب میں محصوری	223
336	سفر طائف	224
337	واقعہ معراج	225
337	طفیل بن عمر و دویٰ اوابو ذر غفاری کا قبول اسلام	226
337	طریقہ تبلیغ	227

338	۱۔ قول فعل میں مطابقت	228
338	۲۔ حکمت اور موعظہ حسنہ	229
339	۱۔ حکمت	230
339	ب۔ موعظہ حسنہ	231
339	۲۔ حکیمانہ بحث و مناظرہ	232
341	۳۔ ظاہری ناکامی سے دل برداشتہ نہ ہونا	233
342	ابلاغ عامہ کے تمام ممکنہ ذرائع کو اختیار کرنا	234
343	۶۔ دین کو ہل انداز میں پیش کرنا	235
343	۷۔ اسوہ حسنہ	236
344	11۔ نبوی تابعیت	237
344	بیعت عقبہ اولیٰ	238
345	ہجرت	239
348	قبائل و رود مسعود	240
348	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی	241
348	مدینہ میں نزول رحمت	242
348	مواخات	243
349	بیت المقدس	244
352	فتح مکہ	245
353	حجۃ الوداع	246
356	خطبہ حجۃ الوداع	247
357	مدینہ منورہ میں سیرۃ طیبہ کے اہم واقعات	248
359		

359	غزوات	249
360	اہم سوالات (اسوہ حسنہ)	250
361	باب چہارم: اخلاقی اقدار اور اسلامی معاشرہ کے بنیادی اوصاف	251
363	اخلاق	252
365	صدق	253
369	توکل	254
370	تقویٰ	255
372	ایفائے عهد	256
374	سادگی	257
377	والدین اور بزرگوں کا احترام	258
382	رواداری اور وسعت نظر	259
386	اسلامی معاشرہ	260
386	کسب حلال	261
389	انسانی وقار	262
389	شرف انسانیت کا مفہوم	263
389	قرآن کا تصورِ انسان	264
390	خلافت و نیابتِ الہی	265
390	انسان کے بارے میں اسلام کا نظریہ	266
391	انسان کے بارے میں دیگر مذاہب کے نظریات	267
391	اسلام انسانی مساوات اور وحدت کا علمبردار	268
392	اسلام میں احترام نسوں	269
393	غلاموں کا احترام	270

اجتیمی عدل	271
معاشرتی عدل	272
قانونی عدل	273
سیاسی عدل	274
معااشی عدل	275
شوریٰ	276
اہم سوالات	277
باب پنجم: تہذیب انسانی کی تعمیر میں اسلام کا حصہ	278
تہذیب کا معنی مفہوم	279
تہذیب انسانی کے ارتقاء کا مادی یا تاریخی تجزیہ	280
تہذیب انسانی کے ارتقاء کا اسلامی نظریہ	281
تہذیب انسانی کی تعمیر میں اسلام کا حصہ	282
مقام انسانیت کا عرفان	283
شرف انسانیت	284
وحدت انسانیت اور اخوت اسلامی	285
غلامی کا بند رنج خاتمه	286
عورتوں کے حقوق کی پاسداری	287
مندی بھی رواداری	288
فروع علم	289
مسلمانوں کی علمی خدمات	290
اہم سوالات	291

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تعارف

تحریر: جسٹس علامہ مفتی سید شجاعت علی قادری
نج و فاقی شرعی عدالت پاکستان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالْعَاقِبةُ لِلْمُتَّقِينَ وَلَا عُذْوَانَ إِلَّا عَلَى الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

زیب نظر کتاب مولانا نیب الرحمن صاحب کی تازہ کاؤش کا شمرہ ہے۔ مولانا علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، آپ سلیمانی ہوئے خطیب، درس نظامی کے مسلم اسٹاد، علامہ اقبال کالج کے پروفیسر، ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ مقرر اور شہر کراچی کے ممتاز عالم دین کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، حکومت پاکستان کی طرف سے اسلامیات کے تمام درجات کے نصاب تعلیم میں بحیثیت لازمی مضمون کے شامل ہو جانے کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ علماء مختلف کلاسوں کے طلبہ کا معیار مدنظر رکھتے ہوئے اسلامیات پر کتابیں تصنیف کریں، کورس کے لیے جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ ان میں اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے اور کورس کے لیے ایسا کیا جانا ضروری ہے، مگر ایک طالب علم کے لیے لازم ہے کہ وہ کورس کی کتاب پر اکتفانہ کرے بلکہ اپنے علم کو بڑھانے کی خاطر متعلقہ موضوع پر وسیع مطالعہ کرے، اسی نقطہ نگاہ سے ہر موضوع پر کورس کی امدادی کتب تصنیف کی جاتی ہیں، مولانا موصوف نے اس سے قبل ایل ایل بی کے لیے ”قانون شریعت“ اور ”اصول فقه اسلام“ کے نام سے کتب تصنیف کیں، جن سے طلبہ نے بہت استفادہ کیا، اور مختلف حلقوں نے مولانا کے علم اور انداز نگارش کی بر ملا تعریف کی، نیتیجاً ان کتب کی کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے، بعض حضرات نے اس قسم کی امدادی کتب لکھنے کو بطور پیشہ اختیار کیا ہوا ہے، چونکہ یہ ناچیز بھی عرصہ

دراز تک کالج کی تدریس سے متعلق رہا ہے اور اس قسم کی کتابیں نظر سے گزری ہیں، اس لیے بلا خوف تر دید کرتا ہے کہ عام طور پر کتابیں بعض اردو کتب سے نقل کی جاتی ہیں اور اس نقل میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا ہے، نفس مضمون میں تشکیل کے علاوہ اغلاط سے پر ہوتی ہیں اور کار و باری عجلت کے باعث ان کی تصحیح بھی نہیں کی جاتی ہے یا کی جاتی ہے تو ناقص، ان افسوس ناک حالات میں مولانا کی طرف سے اس تصنیف کا آنا طلبہ پر انتہائی نوازش ہے اور بسا غنیمت ہے، کتاب ظاہری اور باطنی حسن سے مرضع ہے۔ وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور صرف طلبہ ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر قاری کے لیے معلومات سے لبریز ہے اور اس لائق ہے کہ ہر گھر اور علمی درس گاہ میں موجود ہو۔

میری دعا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ، مؤلف علامہ کو اس سلسلہ کی مزید کتب کی تصنیف کی توفیق عطا فرمائے اور اس تصنیف کو ان کی سابقہ تصانیف کی طرح قبول عام اور شہرت تام مرحمت فرمائے، آمین بجاه النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّی وَنُسَلِّمُ عَلَیْ حَبِّیبِہِ الْکَرِیمِ

نقشِ اول

پاکستان کی نظریاتی اساس، تحریک پاکستان کی روحِ رواں، قیامِ پاکستان کی بناء، پاکستان کی بقاء اور قائمِ ودامہ رہنے کا جواز صرف اور صرف اسلام ہے۔

تحریک پاکستان، قیامِ پاکستان اور بقاء پاکستان جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا اللہ سے کیا ہوا ایک عہد تھا، ایک امانت تھی اور اس خداداد سرز میں پراللہ کے دین کو مکمل اور جامع شکل میں نافذ کرنے کی ایک عظیم ذمہ داری تھی جسے ہم نے اخذ و قبول کیا تھا۔

ہم اس عہد کو نجھانے، اس امانت کی حفاظت کرنے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام ہوتے چلے گئے۔ قدرت ہمیں بار بار موقع دیتی رہی اور ہم گناہاتے چلے گئے، یہاں تک کہ جب اللہ کی جنت پوری ہو گئی تو ۱۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مسلماناں پاکستان نے دیکھ لیا کہ پاکستان اپنی اصلی شکل میں قائم نہ رہ سکا اور آبادی کے لحاظ سے اس کا نصف سے زائد حصہ ہماری غلطیوں، کوتا ہیوں اور قومی و ملی جرامیں کی سزا کے طور پر ہم سے کٹ گیا۔ یہ قدرت کی طرف سے ایک تازیانہ تھا اور وارنگ تھی کہ اگر خدا نخواستہ ہم اب بھی خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے، لغزشوں، کوتا ہیوں اور غلطیوں کا اعتراف کر کے ان کی تلافی نہ کی اور جادہ مستقیم پر گامزن نہ ہوئے تو خاکم بد ہن ہمارا قومی تشخيص اور ملی وقار خطرے میں پڑ سکتا ہے اور اللہ نہ کرے ایسا مرحلہ بھی آسکتا ہے:

ع تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

موجودہ حکومت نے بلاشبہ اسلام سے اپنی وابستگی اور اسلام پر اپنے غیر متزلزل ایمان کا مملکت و حکومت کے ہر فرم اور ہر پلیٹ فارم پر بر ملا اظہار کیا ہے اور اس ضمن میں اس کارویہ معدurat خواہانہ کبھی نہیں رہا اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اس کے عملی نفاذ Practical Enforcement کے لیے کچھ پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ یہ امر اس حد

تک تو باعثِ اطمینان ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ "سمت قبلہ درست ہو گئی ہے"۔ مگر اس کی رفتار ہرگز باعثِ اطمینان نہیں ہے، گویا "شانِ راہ" تو ہم نے پالیا ہے مگر منزلِ مقصودِ بھی بہت

دور ہے۔

موجودہ حکومت کے قابل تعریف اقدامات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اسکول کے درجہ اول سے لے کر ڈگری کی سطح تک "تعلیماتِ اسلامی" کو "نصابِ تعلیم" کا جزو لازم قرار دیا ہے اور میرک تاڈ گری کلاسوس کی سطح تک مطالعہ پاکستان کو بھی لازمی مضمون کی حیثیت سے شاملِ نصاب کر لیا ہے۔

اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اس نصابِ تعلیم کے ذریعے ہمارے کالجوں سے مسترد اور ثقہ علماء دین تیار ہو کر نکلیں گے، کیونکہ یہ ایک الگ کل وقتی اور مستقل کام ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنی ملی تاریخ، تہذیبی پس منظر، نظریاتی اساس کا ایک اجمالی مگر سیر حاصل تعارف حاصل ہو جائے گا، وہ دین سے بے بہرہ نہیں رہیں گے، ان کے خیالات، افکار اور نظریات میں جوانسوار ہے، وہ ان شاء اللہ رفع ہو جائے گا۔ وہ تشکیک کی منزل سے آگے نکل کر ایمان و ایقان کی دولت سے مالا مال ہوں گے اور ان کے اذہان و قلوب عرفانِ الہی کے نور سے منور ہوں گے۔ لا دین (Secular)، دین سے برگشتہ اور اسلام دشمن عناصر نوجوانوں کے اذہان کو پرا گندہ اور زہرآلود کرنے کے لیے جو مجرمانہ اور مکارانہ پروپیگنڈا کرتے ہیں، یہ اس کے جال میں نہیں پھنسیں گے۔

یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ ہماری جامعات اور کالجوں سے فاغ التحصیل ہو کر نکلنے والے نوجوان جہاں سائنس، طب، انجینئرنگ، معدیشٹ اور زندگی کے دیگر مختلف شعبوں میں کمال حاصل کر کے نکلیں، وہاں وہ اچھے مسلمان بھی ہوں تاکہ وہ اپنی عملی زندگی کی دوڑ میں جہاں کہیں بھی ہوں اور قسمت انہیں جہاں بھی لے جائے، ان کی شناخت، ان کی پہچان اور ان کا تعارف ایک اچھے مسلمان اور ذمہ دار شہری کی حیثیت سے ہو، یہی ہماری آرزو ہے، یہی ہماری تمنا اور یہی ہمارا مقصود ہے، بقول اکبرالا آآ بادی:

تم شوق سے کانج میں پڑھو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ ٹھولو

بس ایک سخن بندہ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو
یعنی زندگی کے کسی بھی موز پر مردِ مومن کا رشتہ اسلام، اللہ اور اس کے رسول کرم ﷺ
سے ٹوٹا نہیں چاہیے، خواہ وہ میدانِ سیاست میں ہو، کریٰ عدالت پر ہو، ایوانِ اقتدار میں ہو
یا صنعت و تجارت یا منیشہت کے کسی اور شعبے سے وابستہ ہو۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

وفاقی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان نے ڈگری کلاسز کے لیے تعلیماتِ اسلامی (لازمی) کا جو نصابِ ملک کی تمام جامعات کے لیے تجویز کیا ہے، وہ آپ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

زیرِ نظر کتابِ مجوزہ نصاب کے عین مطابق ہے اور مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہے:

- ☆ کتابِ مختصرِ مکر جامع ہے تاکہ طلبہ اور اساتذہ کرام کے لیے یکساں طور پر مفید ہو۔
 - ☆ انداز بیاں سہل مگر معیاری ہے جہاں جہاں ممکن ہو اور ضرورت محسوس کی گئی وہاں علمی اور اسلامی اصطلاحات کا انگریزی تبادل بھی درج کر دیا گیا ہے۔
 - ☆ ہم نے الحمد للہ اس کتاب کو اغلاط سے پاک رکھنے کی مقدور بھروسی کی ہے اور امید ہے آپ ان شاء اللہ اسے مقابلتاً بہترین اور اغلاط سے پاک کتاب پائیں گے۔
 - ☆ بالخصوص قرآن و حدیث کا حصہ یا مختلف عنوانات کے تحت جہاں جہاں قرآن و حدیث کے اقتباسات دیے گئے ہیں، ان کی صحت پر پوری توجہ دی گئی ہے۔ اسی طرح یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ کتاب لفظی اور معنوی اغلاط سے بھی پاک ہو۔
- کراچی یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی نے نصاب کے لیے جوبیں بیس احادیث تجویز کی ہیں، ان سب کا متن مع ترجمہ و تشریح درج کر دیا گیا ہے، اس لیے پاکستان کی تمام جامعات کے تحت ڈگری سطح کے طلبہ کے لیے بالعموم اور پورے صوبے سندھ کے طلبہ کے لیے بالخصوص یہ ایک مکمل جامع کتاب ہے۔

ہم نے اسے صوری و معنوی ہر اعتبار سے بہتر اور خوب تر بنانے کی مقدور بھروسی کی ہے اور امید ہے ان شاء اللہ! آپ اسے نبٹا ایک بہتر پیشش پائیں گے۔

ہم نے اپنی الہیت اور صلاحیت کے مطابق پوری دیانت سے اسے مرتب کیا ہے، تاہم یہ نقشِ اول ہے، حرفِ آخر نہیں، اس لیے ہم ہر طرح کی تعمیری تنقید اور ثابت تجوادیز کو خندہ پیشانی سے قبول کریں گے، اساتذہ کرام اور طلبہ دونوں طبقوں کی رائے کا ہم خیر مقدم کریں گے۔

نظر ثانی شدہ ایڈیشن

الحمد للہ! یہ کتاب کا تازہ ایڈیشن ہے۔ پوری کتاب پر نظر ثانی کی گئی ہے اور مفید اضافات بھی کیے گئے ہیں۔ احادیث مبارکہ کے اصل مأخذ سے حوالہ جات بھی دیے گئے ہیں اور اب ماشاء اللہ یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے۔

میرے رفیق مولانا بختیار علی نعیمی نے اسے از سرنوکمپوز کیا ہے اور صحیح و اضافات بھی کیے ہیں، میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، مولانا محمد ناصر خان چشتی نے بھی اس کی صحیح اور کتابی سینگ کی ہے، ان کا شکر یہ ادا کرنا بھی مجھ پر لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے ان دونوں رفقاء کو دنیا و آخرت کی کامیابیاں عطا فرمائے۔

آخر میں دعا ہے اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے اور اس کی افادیت کو عام فرمائے، طویل و قصے کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کرنے اور اس کتاب کو قارئین تک پہنچانے میں میرے کرم فرما جناب عید محمد فریدی صاحب نے جو مخلصانہ تعاون کیا ہے، اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں اور ان کی صحت و عافیت اور خیر و برکت کے لیے دعا گو ہوں۔

آپ سب کی نظر عنایت کا متنی
مفہومی میب الرحمن

نصاب اسلامیات (لازمی)

برائے ذکری کلاسز

۱۔ کتاب و سنت

(الف) قرآن مجید

۱ فضائل قرآن

۲ سورۃ الحجرات، متن اور ترجمہ کے ساتھ

۳ سورۃ الفرقان ”عبدالرحمن“ الی آخر السورة، (آیات ۶۳ تا ۷۷)۔

(ب) سنت

۱ سنت کی اہمیت

۲ متن و ترجمہ احادیث

۳ دین اسلام: آیات قرآنی اور احادیث نبویہ ﷺ کی روشنی میں

۱۔ توحید ۲۔ رسالت ۳۔ آخرت ۴۔ نماز

۵۔ روزہ ۶۔ زکوٰۃ ۷۔ حج ۸۔ جہاد

۲۔ اسوہ حسنہ

(الف) حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ

(ب) رسول اکرم ﷺ کی کلی زندگی، ولادت تابعثت و بحرث، طریقہ تبلیغ

(ج) رسول اکرم ﷺ کی مدنی زندگی، مواخات، میثاق مدینہ، فتح مکہ، حجۃ الوداع

۳۔ اسلام کے اخلاقی اقدار اور اسلامی معاشرے کے بنیادی اوصاف

(الف) تعمیر کردار، بلندی اخلاق کا مفہوم، اخلاقی فاضلہ مثلاً صدق، توکل، تقوی،

ایفاۓ عہد، سادگی، والدین اور بزرگوں کا احترام، رداداری اور وسعت نظر

- (ب) اسلامی معاشرہ، کسب حلال، انسانی وقار، اجتماعی عدل، شوریٰ
 (ج) تہذیب انسانی کی تعمیر میں اسلام کا حصہ
 (د) ہمارے مسائل اور آن کا حل

ہمارا مستقبل، وحدت، سیاسی استحکام (تفصیلات کے متعلق جامعات کو اختیار حاصل ہے)

نوٹ:

اسلام کے اخلاقی اقدار اور اسلامی معاشرے کے بنیادی اوصاف کے ضمن میں کسب حلال، تعمیر کردار، انسانی احترام و وقار، سادگی، رواداری اور وسعت نظر کے ساتھ اپنے خصوصی علمی قسمی مسائل کی مناسبت سے اسلام کے اخلاقی، تعمیری نیز اصلاحی اقدار کی طرف رہنمائی کی جائے۔

باب اول

قرآن مجید

قرآن کیا ہے:

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے آخری، قطعی، جامع اور کامل ضابطہ حیات کے طور پر جو کلام اپنے آخری نبی سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا، جو کتابوں میں لکھا ہوا ہے اور آپ ﷺ سے تو اتر کے ساتھ نقل ہوتا آیا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی اگњائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩﴾ عَلَيْكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿٢٠﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ“^{۹۵}

ترجمہ: ”(اے محمد! ﷺ) اس (کلام) کو جریل امین نے واضح عربی زبان میں، آپ کے قلب (انور) پر نازل کیا تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔“

(اشعراء: 193-195)

قرآن ناسخ الکتب:

حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں اور قرآن اللہ کی آخری کتاب ہدایت، آپ کی نبوت اور رسالت تمام سابق انبیاء کرام و رسول عظام علیہم السلام کی نبوتوں کے لیے ناسخ اور سلسلہ نبوت و رسالت کی خاتم ہے اور قرآن مجید تمام سابق آسمانی کتابوں کے لیے ناسخ ہے۔ آپ پر سلسلہ نبوت و رسالت اور قرآن کریم پر ضابطہ رشد و ہدایت کی تکمیل ہوئی۔ آپ کی نبوت پر ایمان اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ از آدم تا عیسیٰ علیہم السلام تمام انبیاء کرام و رسول عظام کی نبوت و رسالت کی تصدیق کی جائے اور قرآن پر ایمان اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ تمام کتب آسمانی اور صحف سماوی کی تصدیق کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر فرمایا:

(۱) ”نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابُ بِالْحَقِّ مُصَدِّقٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ“ -

ترجمہ: ”اس نے حق کے ساتھ آپ پر کتاب نازل کی جو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، (آل عمران: ۳)۔“

(۲) ”لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ قَمِ شَارِلِهِ“ -

ترجمہ: ”هم ایمان لانے میں ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، (البقرہ: 285)۔“

یعنی ہم ایمان لانے میں رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے کہ معاذ اللہ! کسی پر ایمان لا سکیں اور کسی کی نبوت کا انکار کریں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا۔

اسماء قرآن:

(۱) **الْقُرْآن:** اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب مقدس میں خود اس کے متعدد اسماء مذکور ہیں، ان میں سے ”قرآن“ کو علم یعنی Proper Noun کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور باقی اس کے صفاتی نام ہیں، جو اس کی صفات و خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں، سطور ذیل میں ہم بعض اسمائے قرآن کا باحوال ذکر کر رہے ہیں، مثلاً:

(۱) ”إِنَّهُ لِقُرْآنٌ كَرِيمٌ ﴿٢﴾ فِي كِتَابٍ مَكْتُوبٍ ﴿٣﴾۔“

ترجمہ: ”بے شک یہ بہت معزز قرآن ہے، محفوظ کتاب میں (موجود ہے)۔“

(الواقعہ: 77-78)

(۲) ”بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ﴿٤﴾ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ﴿٥﴾۔“

ترجمہ: ”بلکہ وہ بہت معظم قرآن ہے۔ لوح حفظ میں (لکھا ہوا ہے)۔“

(البروج: 21-22)

قرآن مجید میں اٹھاون مرتبہ ”القرآن“ کا ذکر ہے، دس مرتبہ قرآن کا ذکر ہے اور دو مرتبہ ”قرآنہ“ کا بے طور مصدر ذکر ہے۔ قرآن کا لفظ قراءت سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہے: ”پڑھنا“ چونکہ اس کو بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے اس لیے اس کو قرآن کہتے ہیں۔ نیز

”قُرْءَان“ کا معنی ہے: ”جمع کرنا“ اور چونکہ قرآن مجید میں سورتیں اور آیات باہم مبین ہیں، اس لیے اس کو قرآن کہتے ہیں۔

(۲) الْفُرْقَان: فرقان کا ذکر اس آیت میں ہے:

”تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا“۔

ترجمہ: ”بہت برکت والا ہے جس نے اپنے (محبوب) بندہ پر ”فرقان“ کو نازل کیا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو، (الفرقان: ۱)۔“

فرقان، فرق سے ماخوذ ہے اور کیونکہ یہ کتاب حق و باطل، ایمان اور کفر اور خیر اور شر کے درمیان فرق کرتی ہے، اس لیے اس کا نام فرقان ہے۔

(۳) الْكِتَاب: کتاب کا ذکر اس آیت میں ہے:

(۱) ”ذُلِكَ الْكِتَابُ لَا رَبَّ يَرِيبُ ثُلَّتُهُ“۔

ترجمہ: ”یہ وہ عظیم کتاب (ہے)، جس میں شک کی گنجائش نہیں (ہے)، (البقرہ: ۲)۔“

(۲) ”قَالُوا يَقُولُ مَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزَلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى“۔

ترجمہ: ”جنات نے کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب کو سنایا ہے، جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، (الاحقاف: ۳۰)۔“

کتاب کے لفظی معنی ہیں: ”جمع کرنا“، اس میں مختلف فصص، آیات اور احکام کو جمع کیا گیا ہے، اس لیے اس کا نام کتاب ہے، کتاب ”مکتب“ یعنی نوشته (Scripture) اور لکھی ہوئی۔

(۴) الْذِكْر: اس آیت میں مذکور ہے:

”إِنَّا هُنُّ نَزَّلْنَا اللَّذِي كُرِّرَ إِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ“۔

ترجمہ: ”بے شک ہم ہی نے ”ذکر“ نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، (الحجر: ۹)۔“

ذکر کے معنی نصیحت کے ہیں اور چونکہ قرآن مجید میں بہت زیادہ نصیحتیں بیان کی گئی ہیں، اس لیے اس کا نام ذکر ہے۔

(۵) الْتُّور: کا ذکر اس آیت میں ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرُّ هَانٌ مِّنْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُّورًا أَمْبِينَا“۔
ترجمہ: ”اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے مسحکم دلیل آگئی اور
ہم نے تمہاری طرف بیان کرنے والا نور نازل کیا، (النساء: ۲۷)۔“

نور اس کو کہتے ہیں جو خود ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرے اور قرآن مجید بھی
خود بھی ظاہر ہے اور بہت سی اخبار، احکام اور اسرار اس کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔

ذکورہ اسماء کے علاوہ قرآن مجید کو مصحف بھی کہتے ہیں، مصحف کا معنی ہے: جس میں
صحیفوں کو جمع کیا گیا ہو اور صحیفہ چرمی نکلے یا کاغذ کے ورق کو کہتے ہیں۔ علامہ نیشاپوری نے
لکھا ہے: ”حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو جمع کرنے کے بعد اس کا نام
رکھنے کے متعلق لوگوں سے مشورہ کیا اور پھر اس کا نام مصحف رکھا۔“

(غائب القرآن و رغائب الفرقان، ج: ۱، ص: ۲۷، دارالكتب العلمية بیروت، ۱۹۶۱ھ)

اسی طرح قرآن کو ”ہڈی“ یعنی ہدایت دینے والا بھی کہا گیا ہے۔

قرآن پر ایمان فرض عین:

قرآن چونکہ رسول اکرم ﷺ سے تواتر اور قطعیت کے ساتھ منقول ہے اور اس
میں شک و شبه کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے اس کی ایک ایک سورۃ، ایک ایک آیت اور
ایک ایک کلمے (لفظ) پر ایمان لانا، باس معنی کہ یہ کلام خداوندی ہے، فرض عین ہے اور اس کا
منکر کافر ہے۔

قرآن کی آیات اور سورتوں کی تعداد:

قرآن مجید کی سورتوں کی تعداد ۱۱۴ ہے اور آیات کی تعداد ۶۲۳۶ ہے، کل
رسول اکرم ﷺ سے یہی منقول ہیں، اس لیے کوئی شخص اپنی عقل یا اجتہاد سے انہیں
بدل نہیں سکتا۔

قرآن مجید کی پہلی اور آخری وحی:

قرآن مجید کی پہلی وحی بالاتفاق ”إِنَّا أَنْذَلْنَا عَلَيْكُمْ رَّحْمَةً مِّنْ أَنْدُنَا“ یعنی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات ہیں، مشہور یہ ہے کہ آخری وحی سورۃ المائدہ کی درج ذیل آیت ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی:

”الْيَوْمَ أَكَلَمْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَّتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَاضَيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا“۔

ترجمہ: ”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا، (المائدہ: 3)“۔

زیادہ تحقیقی بات یہ ہے کہ احکام و فرائض کے نزول کے اعتبار سے آخری وحی پہی ہے، یعنی اس کے بعد حلال و حرام کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ البتہ مطلق ترتیب نزول ٹھیک اعتبار سے حضرت جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آخری آیت یہ ہے:

”وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ شُوَفُوا كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ“۔

ترجمہ: ”اور اس دن سے ڈروجس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، (البقرہ: 281)“۔ یہ آیت وصال مبارک سے ۹ دن پہلے نازل ہوئی، (صحیح البخاری: 2085، باب بنو كل الرّبّا)“۔

قرآن کی ترتیب:

قرآن مجید کی ترتیب نزولی و نہیں ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے ”مصحف“ یعنی مرتب کتاب کی شکل میں موجود ہے، کیونکہ قرآن مجید دیگر کتب سماوی کی طرح بیک وقت نازل نہیں کیا گیا، بلکہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی زندگی میں تقریباً 22 سال 5 ماہ کی مدت میں بتدریج حسب ضرورت اور حسب حکمت الہی نازل کیا گیا، تاہم اس کی موجودہ ”ترتیب مصحف“، بھی صحابہ کرام یا بعد کے مسلمانوں کی خود ساختہ نہیں، بلکہ ”توقینی“ ہے اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل اور سمع پر موقوف ہے۔

حافظت قرآن و اعجاز قرآن:

قرآن دنیا کی واحد مذہبی والہامی کتاب ہے، جس میں ساڑھے چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود ایک لفظ کی کمی یا زیادتی، تحریف یا ترمیم، تنسخ یا تبدیلی نہیں ہوئی، جبکہ دیگر آسمانی کتب میں سے بعض ناپید ہیں اور جو ہیں (مثلاً تورات اور بخیل) تو ان میں بھی مسلم طور پر تحریف ہو چکی ہے اور وہ سو فصد اپنی اصلی شکل میں نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی آسمانی والہامی کتاب کی حفاظت اپنے ذمہ نہیں لی اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”إِنَّا هُنَّ نَزَّلْنَا الِّذِيْ كُرْوَ إِنَّا لَهُ لَحَفْظُونَ“ -

ترجمہ: ”ہم ہی نے اس ذکر (قرآن) کو اتنا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، (البجر: 9)۔“

چنانچہ قرآن دنیا کی واحد بے مثال اور منفرد (Unique) کتاب ہے، جو کروڑوں کی تعداد میں صحیفوں میں مکتوب اور مطبوعہ شکل میں تمیوز ہے ہی، مزید یہ کہ بلاشبہ لاکھوں کی تعداد میں حفاظت و قراءہ کے سینوں میں بھی محفوظ ہے۔ حادث زمانہ (خدانخواستہ) صحیفوں میں لکھی ہوئی کتاب کو توحیح کر سکتے ہیں، مگر سینوں اور دل و دماغ میں جو کتاب نقش ہے، اسے ہرگز نہیں مٹا سکتے اور یہ قرآن کا ایک ظاہر و باہر اور ناقابل تردید مججزہ (Miracle) ہے۔

قرآن کا رسم الخط:

قرآن کا رسم الخط بھی استقرائی (Inducted) اور قیاسی نہیں، بلکہ تو قیفی ہے یعنی جیسا رسول اکرم ﷺ سے منقول ہے، ویسا ہے، مثلاً: لفظ ”رحمۃ“ قرآن مجید میں ایک کے سواتھ تمام مقامات پر تائے مذہرہ ”ۃ“ کے ساتھ ہے، مگر ایک مقام پر تائے مبسوطہ، نکے ساتھ ہے، کوئی شخص ایک کو دوسرے پر قیاس کر کے اس میں تبدیلی نہیں لاسکتا۔

الفاظ و معانی کا مجموعہ:

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن ”الفاظ و معانی“ دونوں کے مجموعے کا نام ہے اور جس طرح قرآن کے الفاظ اللہ کے نازل کیے ہوئے ہیں، اسی طرح اس کے معانی و مطالب بھی

اللہ کی طرف سے نازل کیے ہوئے ہیں، جو رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک "ترجمان وحی" اور عمل مبارک یعنی "سنت متواترہ مشہورہ" سے ہمیں معلوم ہوئے۔ لہذا قرآن کے جن معانی کی مزید توضیح اور شافی و کافی تفسیر خود قرآن میں ہمارے مقامات پر کر دی گئی ہے یا سنت متواترہ اور اجتماعی امت سے ثابت ہے، ان کا انکار کفر ہے، مثلاً: صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، اور حج کی فرضیت وغیرہ اور جن معنی کا ثبوت سنت مشہورہ یا اخبار آحاد سے ہے، ان کا انکار فتن، گمراہی اور گناہ کبیرہ ہے۔ جن الفاظ کی تفسیر و تشریع اور معانی کے تعین کی جانب مندرجہ بالا ذرائع یا حدیث سے صراحت یا اشارہ نہیں ہے، ان میں ایسی تاویل و تفسیر کی مخالفش ہے جو قرآن و سنت کی تصریحات، نصوص اور روح کے منافی نہ ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الِّذِي كُرِّلُتُبَيْنَ لِلثَّالِسِ مَائِرُولَ إِلَيْهِمْ وَأَعْلَمُهُمْ يَسْقُكُرُونَ"۔

ترجمہ: "اور (اے حبیب!) ہم نے آپ کی طرف ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا تاکہ آپ (ان احکام کو) لوگوں کے لیے کھوں کر بیان کر دیں، جو ان کی جانب نازل کیے گئے ہیں، شاید کہ وہ (اس پر) غور کریں، (انخل: 44)"۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے احکام قرآنی کی وضاحت میں جو ارشاد فرمایا، اپنے عمل سے اس کی جو تفسیر و تشریع فرمائی، وہی قرآن کا معنی و مفہوم ہے، اسی کو قرآن کی دوسری آیات میں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن کی اس قولی و عملی تعبیر کو "سنت" کہتے ہیں، علامہ اقبال کے اس شعر سے یہی مراد ہے:

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآن وہی فرقان وہی یسمیں وہی طہ

مکی و مدنی سورتیں:

قرآن مجید کی بعض سورتیں "مکی" ہیں اور بعض "مدنی" اور رسول اکرم ﷺ کی

نبوت کے دو دور ہیں:

اے مکی دور:
یہ بعثت سے لے کر ہجرت تک ہے اور اس کی مدت تقریباً 13 سال ہے۔

۲۔ مَدْنَى دور:
یہ ہجرت سے لے کر وصال مبارک تک ہے اور اس کی مدت تقریباً 10 سال ہے۔
قرآن مجید کی جو سورتیں ہجرت سے پہلی نازل ہوئیں، وہ مکی کہلاتی ہیں اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں، وہ مدّنی کہلاتی ہیں، خواہ مدینہ منورہ سے باہر کسی سفر کے موقع پر، ہی کیوں نہ نازل ہوئی ہوں۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک سورۃ بحیثیت مجموعی ”مکی“ کہلاتے اور اس میں ایک یا چند آیات مدّنی ہوں یا سورۃ بحیثیت مجموعی مدّنی کہلاتے مگر اس میں ایک یا چند آیات مکی ہوں۔

نوٹ: مکی اور مدّنی سورتوں کی دوسری تعریفات بھی علماء سے منقول ہیں مگر ہم نے وہ تعریف درج کی ہے جو جمہور مفسرین اور سلف صالحین کے نزدیک مختار اور پسندیدہ ہے، مکی سورتوں کی تعداد 87 اور مدّنی کی تعداد 27 ہے۔

ترتیب نزولی و توقیفی:

توقیفی کے معنی ہیں: جو رسول اکرم ﷺ سے سماع اور نقل پر موقوف ہے، اس میں انسانی عقل کا کوئی دخل نہیں ہے، پس مصحف مقدس یعنی دو جلدوں کے درمیان آج جو قرآن کریم کتابی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے، اس کی ترتیب وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے خود تعلیم فرمائی ہے۔ اس کے برعکس ترتیب نزولی سے مراد یہ ہے کہ جس کے مطابق قرآن کریم نازل ہوا، اس کے مطابق پہلی وحی ربانی سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیاتِ مبارکہ ہیں جو ”إِقْرَا“ سے شروع ہوتی ہیں اور آخری وحی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 281 ہے جو ”وَاتَّقُوا“ سے شروع ہوتی ہے۔

سبب نزول و شان نزول:

قرآن کی بعض آیات مخصوص موقع پر نازل ہوئیں، کسی صحابی یا جماعت صحابہ

نے کوئی بات یا کوئی مسئلہ دریافت کیا، اسی موقع پر اللہ کا حکم بصورتِ قرآن نازل ہو گیا، کوئی اہم واقعہ رونما ہوا، قرآن کی آیت نازل ہو گئی۔ کسی نے اعتراض کیا، قرآن ناطق ہوا اور اس کا رد فرمایا وغیرہ۔

جو واقعہ یا پس منظر کسی آیت یا آیات کے نزول کا سبب بنا، اُسے ”سبب نزول“ یا ”شانِ سبب“ کہتے ہیں۔ مفسرین کرام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ آیات کی توضیح و تفسیر کے ضمن میں ایسے واقعات، سبب یا پس منظر کو شانِ نزول یا سبب نزول کے طور پر ذکر کرتے ہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے آیت کے معانی و مطالب، احکام اور حکمت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور شرعی و فقہی احکام اخذ کرنے میں بھی سہولت ہوتی ہے۔ عام طور پر اگر کوئی وجہ تخصیص نہ ہو تو نازل شدہ حکم اس موقع کے لیے خاص نہیں ہوتا، بلکہ عام ہوتا ہے اور قیامت تک کے تمام مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہوتا ہے، اس لیے اصول فقہ کا قاعدہ ہے: ”سبب“ خاص ہوتا ہے، مگر ”حکم“ عام ہوتا ہے۔

قرآن کا چلتیج:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کلامِ نفسِ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ قرآن مجید نے اپنے کلامِ الہی ہونے کے بارے میں شک کرنے والوں کو مختلف انداز سے تحذیات کیں، یعنی چلتیج دیے۔ مصحف مبارک کی ترتیب کے مطابق قرآن نے سورۃ البقرہ کی ابتداء ہی میں دعویٰ کیا: ”ذلِکَ الْكِتَابُ لَا رَبِّ يَبْدِئُ فِيهِ“، ترجمہ: ”(یہ) وہ (عظمیم المرتب) کتاب ہے، جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے، (البقرہ: 2)۔ اس آیت کی تفسیر میں علامہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

”اس کے معنی یہ ہیں: اپنے معنی پرواضح ہو۔ اور اپنی برهان کے غالب ہونے کے سب قرآن کا مقام یہ ہے کہ اس میں غور و فکر کرنے کے بعد کسی بھی عقلمندان انسان کے دل و دماغ میں اس بارے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ یہ وحی ربیٰ ہے اور یہ کلام اعجاز کی اُس رفعت کو پہنچا ہوا ہے، جس سے آگے کوئی اور مقام نہیں ہے۔ الغرض یہ باری تعالیٰ کا مججزہ

ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کبھی کسی نے اس میں تک کیا ہی نہیں، کیونکہ باطل پرست ہے۔ اس کرتے رہے ہیں، یہی سبب ہے کہ ازالہ تک کے لیے قرآن مجید نے ان کو چیخ کیا اور تک کرتے رہے ہیں، یہی سبب ہے کہ ازالہ تک کا ازالہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی انگلی وہ طریقہ بتایا کہ اس پر غور کر کے ہر قسم کے تک کا ازالہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی تمام تر عقلی، علمی اور لکھری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے اس کا مقابلہ کرنے کی انتہائی کوشش کر کے دیکھ لیں اور جب وہ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ جائیں گے، تو ان پر یہ بات آشکار ہو جائے گی کہ اس میں کسی تک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(تفسیر بیناوى، ج: 1، ص: 36، ملخصاً، دارالحياء للتراث العربي، بيروت)

قرآن مجید کی تحدیات یا چیخ کئی مرحل پر مشتمل ہیں:

(۱) قُلْ لَيْلِنَ اجْتَسَعَتِ الْأَنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِوْشِلٍ هُذَا الْقُدْرَانُ لَا يَأْتُونَ بِوْشِلِهِ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا۔

ترجمہ: ”(اے نبی کرم ﷺ!) کہہ دیجیے: اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں، تو وہ اس کی مثل نہیں لاسکیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں، (بنی اسرائیل: 88)

اس مرحلے پر پورے قرآن کی مثل لانے کا چیخ دیا گیا اور جب فصحائے عرب نے اس چیخ کو قبول نہ کیا تو اس میں تھوڑی زمی کی اور فرمایا:

(۲) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأَتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ بِمُثْلِهِ مُفْتَرَاهٍ وَ ادْعُوا مِنِ اسْتَطْعَمْ قِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُلُّنَمْ صَدِيقُنَّ۔

ترجمہ: ”کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں (یعنی نبی کریم ﷺ) نے اس قرآن کو خود گھر لیا ہے، آپ کہیے: پھر تم بھی اس جیسی گھری ہوئی دس سورتیں (بانا کر) لے آؤ اور (اپنی مدد کے لیے) اللہ کے سوا جس کو بلا کتے ہو، بلا لو، اگر تم (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو (کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے)، (ہود: 13)۔“

پھر اس چیخ کا بھی فصحائے عرب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا، تو قرآن نے اور

زی کی اور فرمایا:

(۲) الف: وَإِنْ كُلْتُمْ فِي تَرَيْبٍ قَبَّلَنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأُتُوا بِسُرَّاتٍ قِنْ مُثْلِهِ^۱
وَادْعُوا شَهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُلْتُمْ صَدِيقَيْنَ^۲ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا ذَلِكَ
تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي دَفَقَدَفَالثَّامُ وَالْجَاهَةُ^۳ أَعْذَثَ لِلْكُفَّارِيْنَ^۴.

ترجمہ: ”اور اگر تمہیں اس (کتاب کے کلامِ الہی ہونے) میں کوئی مشک ہے، جس کو ہم نے
اپنے (محبوب) بندے پر نازل کیا ہے، تو اس کی مانند کوئی ایک سورت (بنाकر) لے آؤ اور
اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لواگرتم سچے ہو، سوا گرم (یہ) نہ کر سکو اور تم ہرگز نہ کر
سکو گے، تو اس آگ سے بچو! جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جسے کافروں کے لیے
تیار کیا گیا ہے، (البقرہ: 23-24)۔“

ب: قُلْ فَأُتُوا بِسُرَّاتٍ مُثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُلْتُمْ
صَدِيقَيْنَ^۵۔

ترجمہ: ”آپ کہہ دیجیے، اس جیسی ایک سورت (بنाकر) لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلا سکتے ہو
بلا لوا، اگر تم (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو (کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے)، (یونس: 38)،“
ابنی نصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والے فصحائے عرب کی طرف سے اس چیخ کا
بھی کوئی جواب نہ آیا، تو قرآن نے مزید نرمی بر تی اور فرمایا:

(۳) أَمْ يَقُولُونَ تَقَوْلَةٌ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ^۶ فَلَيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مُثْلِهِ إِنْ كَانُوا
صَدِيقَيْنَ^۷۔

ترجمہ: ”کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی طرف سے اس قرآن کو گھٹر لیا ہے، بلکہ وہ ایمان
نہیں لارہے، پس اگر وہ (اپنے دعوے میں) سچے ہیں تو اس جیسی کوئی بات (یا آیت) بناؤ کر
لے آئیں، (الطور: 33-34)۔“

تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کی ان توحیدیات کو کسی نے قبول نہیں کیا اور اس کے مقابل
چیخ کرنے کے لیے اپنا کلام بناؤ کرنہیں لاسکے، کیونکہ ان کا بعض وعداوت اور ساری ابلیسی

چالیں جو عداوتِ مصطفیٰ ﷺ میں انہوں نے اختیار کیں، سب تاریخ میں مذکور ہیں۔
 قرآن نے اپنے بارے میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ یہ لسانِ عربی میں ہے، عربی میں
 میں ہے اور مندرجہ ذیل آیاتِ مبارکہ اس دعوے پر شاہد ہیں:
 ”الْخَلُّ: 103، الشَّرَاء: 195، يُوسُف: 2، الرَّعِد: 37، طٰ: 113، الزَّمْر: 28،“

”حُمَّ الْسَّجْدَة: 3، الشُّورَى: 7، الزَّخْرَف: 3، الْأَلْحَافَ: 12.“

ایک مقام پر میں نے پڑھا تھا کہ مشرکین مکہ طویل مشاورت اور منصوبہ بندی کے بعد یہ چیز لے کر آئے: قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ فصح عربی میں نازل ہوا ہے اور ہم نے دیکھا کہ اس میں تین کلمات ایسے ہیں جو فصح عربی کے معیار پر پورا نہیں اترتے اور وہ یہ ہیں:

(الف) سُحْرِيَاً: ”أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَاحِتَ رَاهِيَكَ لَنَخْنُ قَسْنَا بِيَهُمْ مَعِيشَتُهُمْ فِي الْحَيَاةِ
 الدُّنْيَا وَرَاقَعُنَا بَعْضُهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَاجَتٍ لَيَشْخُنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُحْرِيَاً وَ رَاحِتَ
 رَاهِيَكَ حَيْثُ قَنَا يَجْمَعُونَ، (الزَّخْرَف: 32).“

(ب) عَجَابٌ: ”أَجَعَلَ الْأَلَهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ، (ص: 5).“

(ج) كُبَارًا: ”وَ مَكْرُودًا مَكْرُورًا كُبَارًا، (نوح: 22).“

رسول اللہ ﷺ نے اُن سے فرمایا: اس خطے میں تمہارے نزدیک سب سے زیادہ فصح و بلیغ شخص کون ہے، جسے عربی کی فصاحت و بлагت میں جگت (Authority) مانا جاتا ہے، انہوں نے آپ میں مشورہ کرنے کے بعد کہا: ”شہر سے باہر دور ایک بستی میں ایک بزرگ شخص رہتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اُسے بلااؤ، وہ اُسے آپ کے سامنے بلا کر لے آئے، آپ نے اس بزرگ شخص سے فرمایا: بیٹھ جاؤ، پھر فرمایا: کھڑے ہو جاؤ، آپ نے یہی بات تین بار فرمائی، اس پر اس شخص کو غصہ آگیا اور اس نے غصے میں آ کر کہا: ”أَتَشْخُنُنِي سُحْرِيَاً وَ أَنَا شَيْخُ كُبَارٍ، إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ،“

ترجمہ: ”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں، حالانکہ میں بزرگ آدمی ہوں، بے شک یہ بڑی عجیب بات ہے۔“

الغرض جن تین کلمات قرآنی کو قریش مکہ نے چیلنج کیا تھا کہ یہ عربی کے معیار
فصاحت پر پورا نہیں اترتے، اللہ تعالیٰ نے وہی کلمات اُس شخص کی زبان پر جاری کر دیے،
جو ان کے نزدیک عربی فصاحت و بلاغت پر اتحاری مانا جاتا تھا، پس وہ لا جواب ہو گئے،
کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے گھر سے قرآن مجید کی حقانیت کی شہادت فراہم فرمادی، وَمَا
ذِلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعِزْيٰزٍ۔

قریش مکہ نے قرآن پر ایک شبہ یہ وارد کیا:

وَقَالَ رَبُّ الْأَسَاطِيرُ إِلَّا وَلِيُّنَ اكْتَبَهَا فَهِيَ شُمُلٌ عَلَيْهِ بَكَرٌ لَّا وَأَصِيلٌ۔

ترجمہ: ”اور انہوں نے کہا: یہ گزشتہ لوگوں کی (افسانوی) کہانیاں ہیں، جن کو اس (رسول)
نے (کسی سے) لکھوا لیا ہے، جو اس پر صبح و شام اپڑھی جاتی ہیں، (الفرقان: 5)۔“

اس آیت میں قرآن نے اس ممکنہ الزام کا رد کیا ہے کہ سابق الہامی کتابوں کا کوئی
خزینہ یا دفینہ آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے اور آپ اُس میں سے وقتاً فوقتاً پڑھ پڑھ کر سناتے
ہیں، اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت میں اس امکان کو بھی رد کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا كُنْتَ تَشْلُوْا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كَثِيرٍ وَلَا تَحْتُلُهُ بِمَيْسِيْنَ إِذَا لَأْرَتَابَ الْمُبْطِلُونَ۔

ترجمہ: ”اور آپ اس (نزول قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی اسے
اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے، ورنہ باطل پرست شک میں پڑ جاتے، (العنکبوت: 48)۔“

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ کرم ﷺ کو اپنی حکمت کے تحت اُتھی رکھا تاکہ
آپ پر یہ الزام نہ لگ سکے کہ الہامی کتابوں کا کوئی سابق دفینہ یا خزینہ آپ ﷺ کے ہاتھ
آگیا ہے، جسے آپ وقتاً فوقتاً پڑھ کر سناتے ہیں۔

نوٹ: واضح رہے کہ ”اُتھی“ کے معنی جاہل یا ان پڑھ کے نہیں ہیں، بلکہ اس کے معنی ہیں:
”جس شخص نے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو“، یعنی نہ وہ لکھ سکتا ہو اور نہ لکھے ہوئے کو پڑھ سکتا ہو۔

امام الحدیثین والملفوسین علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تفسیر تبیان القرآن
میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ بعد میں نبی کریم ﷺ نے لکھا بھی ہے اور

آپ کے ہوئے کو پڑھ بھی سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اسی استاذ کے سامنے زوالِ تکمذہ کیے بغیر یہ ملکہ آپ کو عطا فرمایا تھا۔

قرآن مجید نے اپنی حقانیت کی ایک دلیل یہ بھی پیش کی کہ قرآن تضادات (Contradictions) سے پاک ہے، اگر یہ کام بشر ہوتا تو اس میں کہیں نہ کہیں کوئی نکوئی تضاد نہ لفین کوں جاتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۖ وَلَوْ كَانَ مِنْ عَيْنِكُنْزِيرِ اللَّهِ لَوْ جَدَدُ افْنِيدَ اخْتِلَافًا كَثِيرًا“۔

ترجمہ: ”تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، اگر یہ قرآن اللہ کے غیر کے پاس سے آیا ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے، (النساء: 82)۔“

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا تضادات سے پاک ہونا اس کے کام اللہ ہونے کی دلیل ہے اور اسی لیے مفسرین نے کہا: قرآن کا بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے اور تفسیر کا اعلیٰ درج بھی یہی ہے کہ خود قرآن اپنی تفسیر بیان کرے۔ اسی طرح قرآن نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اس میں باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی، ارشاد فرمایا:

”لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ“۔

ترجمہ: ”اس میں باطل کہیں سے نہیں آسکتا، نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے، یہ کتاب بہت حکمت والے حمد کیے ہوئے (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے نازل شدہ ہے، (حمد السجدہ: 42)۔“

قرآن مجید کی ایجاز آفرینی اور بے پناہ تاثیر کو دیکھ کر مشرکین مکہ کو رسول اکرم ﷺ سے تنفس کرنے کے لیے قرآن کے حوالے سے طرح طرح کے حر بے استعمال کرتے، کبھی کہتے: یہ جادو گر ہیں، یعنی قرآن کی سحر آفرینی پر جادو کا لیبل لگا کر لوگوں کو اس سے دور کرتے، کبھی کہتے: یہ مجنون ہیں، کبھی کہتے: یہ شاعر ہیں، کبھی کہتے: یہ کاہن ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان تمام باطل الزامت کو سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات پاک سے دور فرمایا، ارشاد ہوا:

(۱) ”كَذِيلَكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قُنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا بَسَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ“۔

ترجمہ: ”اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کی طرف بھی جب کوئی رسول آیا، تو انہوں نے

(یہی) کہا: یہ جادوگر ہے یاد یوانہ ہے، (الذاریات: 52)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ منکرین وحی ربانی اور تمام حبِ الہی کے منکرین کا دتیرہ ایک جیسا رہا ہے اور بالعموم تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایک جیسے الزام عائد کرتے رہے ہیں، چنانچہ فرمایا:

(۲) "فَذَكَرْ فَنَا أَنْتَ بِنُعْمَتِ رَبِّكَ بِجَاهِنَّ دَلَامَجْهُونَ ۖ أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ
نَّكَرَبُصُ بِهِ رَأْيُبُ الْمَوْتِينَ ۚ"۔

ترجمہ: "سو آپ نصیحت کرتے رہے، کیونکہ آپ اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون، یا وہ (کفار) کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں، ہم ان پر مصائب زمانہ (یعنی ان کی موت) کا انتظار کر رہے ہیں، (الطور: 29-30)"۔

اور باری تعالیٰ نے فرمایا:

(۳) "وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۖ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ۖ وَ لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۖ قَلِيلًا مَا
تَدَكَّرُونَ ۖ تَثْزِيئُلٌ قِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۚ"۔

ترجمہ: "بے شک یہ قرآن ضرور رسولِ کریم کا قول ہے اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم بہت کم ایمان لاتے ہو، اور نہ ہی کسی کاہن کا قول ہے، تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو، یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے، (الحاقة: 40-43)"۔

الغرض قرآن نے اپنی ناموس کی حفاظت کے لیے حاملِ قرآن سیدنا محمد رسول اللہ ملئ شکیلہ کم پر وارد ہونے والے ہر طعن اور ہر الزام کا رد کیا اور اس حقیقت کو نہایت مدلل اور روشن کر کے پیش کیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور آپ ملئ شکیلہ کم پر مجنون، شاعر، ساحر اور کاہن اور خود ساختگی (انہرا) کے سب الزامات باطل اور بے اصل ہیں اور یہ سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے عہد کے کفار و مشرکین کا حرثہ اور چلا ہوا کارتوں ہیں۔

قرآن کی ایک شانِ اعجاز یہ ہے کہ وہ سائنسی اور طبقی حقائق، جن تک انسانی ذہن کی صدیوں کا علمی، مشاہداتی اور تجرباتی سفر طے کرنے کے بعد پہنچا، قرآن نے وہ حقیقت

روز اول سے بیان کردی تھی اور جوں جوں انسان کا علمی سفر ارتقائی منزلیں طے کرتا رہے گا، قرآنی حقائق کی تصدیق ہوتی رہے گی۔ آج انسان نے یہ دعویٰ کیا کہ ایک جاندار کے خلیے (Cell) سے دوسرا جاندار پیدا کیا جاسکتا ہے، قرآن مجید نے یہ بات صدیوں پہلے بتا دی تھی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذْ قُوَّا بَنِيكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ لُفْسٍ وَاحِدٍ فَإِذَا خَلَقَ مِنْهَا ذُرَّةً فَجَهَاؤُوهُ مِنْهُمَا بِرَبَّ حَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً“ -

ترجمہ: ”اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرتے رہا کرو جس نے تمہیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا (یعنی حوتا کو) پیدا کیا اور ان دونوں سے بہ کثرت مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا، (النساء: 1)۔“

اگرچہ سنتِ الہیہ یہ ہے کہ جانورز اور مادہ اور انسان مرد اور عورت کے اختلاط نے پیدا ہوتے ہیں، لیکن حضرت حوا کو کسی عورت کے واسطے کے بغیر، حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو کسی مرد کے واسطے کے بغیر اور حضرت آدم علیہ السلام کو دونوں واسطوں کے بغیر پیدا کر کے بتا دیا کہ اس کی قدرت ان اسباب کی محتاج نہیں ہے، یہ اس کی سنتِ جاریہ ہے، لیکن وہ خارقِ اسباب بھی اپنی قدرت کا ظہور فرماسکتا ہے اور فرماتا رہا ہے۔ چنانچہ حضرت حوا کسی مرد کے واسطے کے بغیر پیدا کرنا ایسا ہی خارقِ عادت فعلِ الہی ہے، قرآن نے اس سے بحث نہیں کی کہ حضرت حوا کو آدم علیہ السلام کے وجود کے کس حصے سے پیدا کیا، لہذا اس میں توسعہ کی گنجائش موجود ہے۔

مددِ میں قرآن

قرآن جب نازل ہوا تھا، صحابہ کرام اسے اپنے لوح دل پر بھی نوش کرتے تھے اور وہ اصحاب رسول جو لکھتا جانتے تھے اور "کاتبینِ وحی" کہلاتے تھے، وہ اسے چڑے، سمجھو رکھ کی چال یا بڑی پر لکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح یہ غیر مرتب شکل میں تحریری طور پر بھی محفوظ ہو جاتا تھا۔

رسول اکرم ﷺ کے وصال کے بعد فتنہ انکار و ختم نبوت کے خاتمے کے موقع پر "جگ یامہ" میں مسلمہ کذاب سے مقابلہ کرتے ہوئے 70 قراءت قرآن شہید ہو گئے، اس سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو فکر لاحق ہوئی کہ جہاد و شہادت کا سلسلہ تو جاری رہے گا، کہیں کثرت سے حفاظت قرآن کی شہادت سے حفاظت قرآن میں دشواری پیش نہ آجائے۔ سو آپ نے خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس جانب متوجہ کیا کہ قرآن کو مصحف کی صورت میں جمع کر لیا جائے اور آپ نے اس عمل خیر کو "بدعتِ حسنہ" قرار دیا۔ کچھ تردد اور توقف کے بعد وہ اس پر آباد ہو گئے۔ اس طرح قرآن مجید کو "مصحف" کی شکل میں مددوں و مرتب کر لیا گیا، یعنی خلیفہ اول کے پاس رہا پھر خلیفہ دوم کے پاس رہا، پھر امام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے استفادہ کیا اور لغات (Accents) کے اختلاف سے بچنے کے لیے صرف "لغت قریش" پر متعدد نسخے مرتب کر کے مملکتِ اسلامیہ کے اطراف و اکناف میں بھیجے کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ اختلاف لغت اہل عجم کے نزدیک اخلاف، نزاع اور تفریق کا باعث بن جائے، اس لیے آپ کو "جامع قرآن" کہا جاتا ہے۔ پھر بنو امیہ کے عہد حکومت میں جاج بن یوسف نے قرآن پر اعراب لگوائے تاکہ عربی زبان سے ناواقف لوگ اور عام مسلمان تلاوت کی سعادت سے محروم نہ رہیں اور دورانی تلاوت ایسی غلطی نہ کریں جو خدا نخواستہ کفریا

گمراہی کا باعث بن جائے۔ اعراب سے مراد قرآن کریم کے کلمات کے حروف پر حرکات و سکنات (یعنی زبر، زیر پیش اور جزم وغیرہ) اور لفظ کے آخری حرف پر حرکات کو ظاہر کرنا، کیونکہ معنی کو سمجھنے میں اس کا بڑا دخل ہوتا ہے اور صحیح تلفظ کے لیے بھی یہ ضروری ہے۔

کتابتین وحی صحابہ کرام کی تعداد: 40

مدتِ نزول: 22 سال 5 ماہ

منزیل: 7

پارے: 30

سورتیں: 114

رکوع: 558

نوٹ: عام طور پر مشہور یہ ہے کہ قرآن مجید کے رکوعات کی تعداد 540 ہے، لیکن ہم نے مطبوعہ قرآن مجید سے باقاعدہ شمار کر کے یہ تعداد لکھی ہے۔

تعداد آیات: 6236

نوٹ: اس سلسلے میں مختلف کتب میں مختلف روایات درج ہیں، مثلاً: 6666، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے تعداد: 6166 مردی ہے، لیکن ہم مطبوعہ قرآن مجید سے باقاعدہ شمار کر کے یہ تعداد لکھ رہے ہیں اور اسی کو درست سمجھا جائے۔

آیات وعد: 1000، یعنی وہ آیات جن میں جنت یا اجر و ثواب کی بشارت دی گئی ہے۔

آیات وعید: 1000، یعنی وہ آیات مراد جن میں جہنم یا عذاب و عقاب کی خبر دی گئی ہے۔

آیات امر: 1000 آیات نہیں: 1000

قصص و اخبار: 1000 امثال و عبر: 1000

آیات الاحکام: 500

یعنی وہ آیات جن میں حلال و حرام کے شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں۔

آیات دعاء: 100 آیات تبع: 100 منسوخ الحکم (باعتبار شهرت): 12

آیات سجدہ: 14 اختلافی: 1

نوت:- آیت کی یہ اقسام باہم تباہی (Varying) نہیں ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک آیت کا شمار "آیاتُ الْأَمْرُ" میں بھی کیا جائے اور آیاتُ الْحُكْمَ (بیان حلال) میں بھی کیا جائے اس طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک آیت کا شمار آیاتِ نہیں میں بھی کیا جائے اور آیاتُ الْحُكْمَ (بیان حرام) میں بھی کیا جائے، کیونکہ ہر امر بیانِ فرض کے لیے نہیں ہوتا اور ہر نہیں بیان حرام کے لیے نہیں ہوتا۔

تعداد آیات میں اختلاف:

قرآن کے ایک جملے کو آیت کہتے ہیں اور یہ اصطلاح سلف صالحین سے راجح چلی آرہی ہے اور آیت کی علامت کے طور پر چھوٹا سا گول دائرہ "O" بنایا جاتا ہے، "آیت" کے معانی ہیں: "نشان" اور "معجزہ"؛ گویا قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ اس کتاب مقدس کی حقانیت اور نبی مکررم ﷺ کی صداقت کا نمایاں معجزہ ہے۔

آیت کہاں ختم ہوتی ہے اور کہاں سے شروع ہوتی ہے، چند سورتوں میں چند مقامات پر اس سلسلے میں روایات کا اختلاف ہے، اس لیے مجموعی تعداد آیات میں تفاوت ہوتا ہے لیکن فی نفہ قرآن کے کسی کلے میں الحمد للہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔

سُورَةُ الْفُرْقَان

ترتیب مصحف کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی پچیسویں جبکہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے بیالیسویں سورت ہے اور انھار ہویں اور انیسویں پارے میں ہے۔ یہ مکی سورت ہے، اس میں 77 آیات اور 6 رکوع ہیں۔ آخری رکوع کی آیت: 63 تا 77 نصاب میں شامل ہیں اور ان 15 آیات میں ”عِبَادُ الرَّحْمَن“، یعنی اللہ کے محبوب اور پسندیدہ بندوں کی صفات بیان کی گئی ہیں اور جو مومنین اللہ پر توکل کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں سختیوں کو برداشت کرتے ہیں، ان کے محسن اخلاق اور نیک خوبیوں کی مدح کی گئی ہے۔ آخر میں ان کے آخری درجات اور اجر و ثواب کا ذکر ہے اور مومنین کو منفی صفات سے منع کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”وَ عِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَسْعَوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هُنَّا وَ إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَهْلُونَ
قَاتَلُوا سَلَيْلًا⑩ وَ الَّذِينَ يَبِيِّنُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَ قِيَامًا⑪“ -

مشکل الفاظ کے معانی

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
چلتے ہیں	يَسْعُونَ	بندے (عبد کی جمع)	عِبَادُ
رات گزارتے ہیں	يَبِيِّنُونَ	آہستہ، (دبے پاؤں) نزم روی سے	هُنَّا
حال قیام میں کھڑے ہو کر	قِيَامًا	نادان، بے علم (جالیں کی جمع)	جَهْلُونَ
سلام کرنا	سَلَيْلًا	سجدہ کرتے ہوئے	سُجَّدًا

ترجمہ: ”اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستہ آہستہ (فرمی سے) چلتے ہیں اور جب جاہل (ہٹ دھرم لوگ) ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو یہ سلام کہتے ہیں (اور وہ من چھڑا لیتے

ہیں) اور اپنے رب کے حضور (نماز میں) سجدہ اور قیام کرتے ہوئے رات گزارتے ہیں، (الفرقان: 63-64)۔

تفسیر و تشریح:

دنیا کے تمام انسان رحمٰن کے بندے ہیں اور اس آیت میں بندوں کی اللہ کی طرف نسبت کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی محبوبیت اور پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، یعنی رحمٰن کے پسندیدہ بندے زمین پر آہستگی اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں، اتراتے ہوئے، اکڑتے ہوئے اور تکبیر کرتے ہوئے نہیں چلتے۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کی پسندیدہ اداؤں اور خصلتوں کو بیان کیا ہے: ”وَهُوَ مِنْ بَنْدَوْنِي سَعِيْدٌ“، اس سے مراد یہ نہیں کہ ان کی رفتار مست ہوتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی چال میں تواضع، وقار اور انکسار ہوتا ہے اور وہ زمین پر شریفانہ انداز میں چلتے ہیں، تکبر کے ساتھ اور اتر اکڑنے کو اختیار نہیں کرتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اترانے والوں، اکڑ کر چلنے والوں اور تکبیر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا، قرآن کریم میں ہے:

”وَلَا تُصِيرُ حَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمِشِ فِي الْأَرْضِ مَرْحَاطًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ“۔

ترجمہ: ”اور لوگوں کے ساتھ بے رُخی اختیار نہ کرو اور زمین میں اتر اکرنہ چلو، بے شک اللہ تعالیٰ کی اترانے والے شخني خورے کو پسند نہیں فرماتا، (لقمان: 18)۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی سکون اور وقار کے ساتھ چلنے کی تعلیم دی ہے اور وقار کے خلاف چلنے سے منع کیا ہے، خواہ اس میں کوئی تکبر نہ ہو، فرمایا:

”أَتَيْهَا النَّاسُ! عَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ، فَإِنَّ الْبِرَّ لَيْسَ بِالْإِيْضَاعِ“۔

ترجمہ: ”اے لوگو! تم پر سکون اور وقار لازم ہے، کیونکہ نیکی سواری کو تیز دوڑانے میں نہیں ہے، (صحیح البخاری: 1671)۔

بلکہ اگر کسی کی فرض نماز کی رکعت نکل رہی ہو اور اس حال میں بھی وہ دوڑ کر جاتا ہے اور وقار کے منافی چلتا ہے تو اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا:

”إِذَا سَمِعْتُمُ الْإِقَامَةَ، فَامْشُوا إِلَى الصَّلَاةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ وَالْوَقَارِ، وَلَا تُشْرِعُوا، فَهَا أَدْرَكْنَاكُمْ فَصَلُوا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِئُوكُمْ“ -

ترجمہ: ”جب تم اقامت کی آواز سن تو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ چلو اور دوڑو نہیں، (امام کے ساتھ نماز کا جو حصہ) پالو اس کو پڑھو اور جتنا رہ گیا اس کو (امام کے سلام پھیرنے کے بعد) پورا کرو، (صحیح البخاری: 636)۔“

اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا
ترجمہ: ”زمین پر اکڑ کر مت چلو (ایسا کرنے سے) تم نہ توز میں کو چیز سکو گے اور نہ ہی پہاڑ کی بلندیوں کو پہنچ سکو گے، (بنی اسرائیل: 37)“

یعنی اکڑ کر اور تکبر سے چلنے سے کسی کی حیثیت، مقام اور مرتبے میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا یہ محض اس کی نفیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ جب جاہلوں سے ان کا سامنا ہوتا ہے اور وہ ان سے کچھ بخشی کرتے ہیں، الجھتے ہیں، راستہ روک لیتے یا بد تمیزی پر اتر آتے ہیں، تو یہ ان کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیتے، بلکہ سلامتی کے کلمات یا سلام کہہ کر اپنی راہ چل دیتے ہیں۔ جاہل سے مراد بے دین اور متنکرین ہو سکتے ہیں، جن کا شعار اہل ایمان کو ستانا ہے، ہے، کیونکہ ان سے الجھنے میں نہ دینی فائدہ ہے اور نہ دنیوی۔ اس سے سلام مقاطعہ یعنی بایکاٹ اور لا تعلقی بھی مراد ہو سکتی ہے اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پاک سے ہوتی ہے:

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَ قَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا يَنْتَقِي الْجَهَلِينَ -

ترجمہ: ”اور جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں، تم پر سلام ہو، ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے، (القصص: 55)“، یا وہ جاہلوں کو ایسا جواب دیتے ہیں جس میں وہ گناہ سے سلامت اور محفوظ رہتے ہیں۔

تیسرا صفت یہ بیان فرمائی کہ ان کی راتیں غفلت میں اور خواب خرگوش کے مزے لوٹنے میں نہیں بس رہوتیں، بلکہ وہ دن کا سکون اور راتوں کا چین اللہ کے ذکر و فکر پر فدا کر کے قلبی و روحانی سکون و چین کی لازوال نعمت پاتے ہیں۔ اس آیت کا معنی ہے: ”جو لوگ اپنے رب کی رضا جوئی کے لیے رات کو نماز پڑھتے ہیں“، اس سے مراد تہجد کی نماز بھی ہو سکتی ہے اور عشاء اور فجر کی نماز بھی، کیونکہ احادیث مبارکہ میں عشا اور فجر کی نماز باجماعت پڑھنے کو ساری رات کی عبادت کے برابر قرار دیا گیا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مَنْ شَهِدَ الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ، كَانَ لَهُ قِيَامٌ نِصْفٌ لَيْلَةً، وَمَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ فِي جَمَاعَةٍ كَانَ لَهُ كَقِيَامٍ لَيْلَةً“۔

ترجمہ: ”جس شخص نے جماعت کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی تو اس کے لیے آدمی رات کے قیام کا اجر ہے اور جس شخص نے عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو اس کے لیے پوری رات کے قیام کا اجر ہے، (سنن ترمذی: 221)“۔

رات کو اللہ کی رضا کے لیے فرض نماز کے علاوہ نفل نماز پڑھنے کی بڑی فضیلت ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

”مَنْ صَلَّى بَعْدَ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ رُكُوعَتَيْنِ أَوْ أُكْثَرَ، فَقَدْ بَاتَ بِاللَّهِ سَاجِدًا وَقَائِمًا“۔

ترجمہ: ”جس شخص نے اپنے رب کی رضا کے لیے عشاء کی نماز کے بعد دو یا دو سے زیادہ رکعتات (نفل) نماز پڑھی تو گویا اس نے اپنے رب کے حضور سجدہ اور قیام میں رات گزاری“۔

(معالم التزیل: ج: 6، ص: 673)

آیت: 65-66

”وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمْ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ عَرَاماً^۹
إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًا وَمُقَامًا^{۱۰}“ -

مشکل الفاظ کے معانی

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
پھر دے / دور رکھ	اَصْرِفْ	وہ کہتے ہیں	يَقُولُونَ
ہلاکت، شوق، عشق کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ جن ہمیشہ کاروگ ہوتا ہے	عَرَاماً	ہم سے	عَنَّا
ٹھکانا، ٹھہر نے کی جگہ	مُسْتَقَرًا	براہے	سَاءَتْ

ترجمہ: ”اور جو (اپنے رب کے حضور) التجا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم سے جہنم
کے عذاب کو دُور فرمادے، بیشک اس کا عذاب بڑا مہلکہ ہے، بلاشبہ وہ بدترین ٹھکانا اور
نہایت بُری جگہ ہے۔“ -

تفسیر و تشریح:

چوتحی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ تمام تراکسار و تواضع اور شب و روز کی عبادت کے
باوجود عبادات پر ناز نہیں کرتے، بلکہ ان کی سوچ یہ ہوتی ہے:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس لیے ہر وقت اللہ کے عذاب سے اس کی پناہ اور عافیت کے طلب گار ہوتے
ہیں کہ عبادت کی قبولیت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر موقوف ہے اور جہنم سے خلاصی اللہ کی
رحمت سے ہی ممکن ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
نَنْ يَنْجِي أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلَهُ، قَالُوا: وَلَا أَنْتَ يَارَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَيَّدَنِي

”لَنْ يَنْجِي أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلَهُ، قَالُوا: وَلَا أَنْتَ يَارَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَيَّدَنِي

اللَّهُ بِرَحْمَةِهِ، سَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَاغْدُوا وَرُوْحُوا، وَشَنِيْعٌ مِنَ الدُّلْجَةِ، وَالْقَصْدَ تَبَلُّغُوا۔"

ترجمہ: "تم سے کسی شخص کو اس کا عمل نجات نہیں دلا سکے گا، صحابہ کرام نے عرض کی: آپ کو بھی نہیں یا رسول اللہ! فرمایا: مجھے بھی نہیں، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے سامنے میں لے لے، پس تم کو چاہیے کہ درستی کے ساتھ عمل کرو، میانہ روی اختیار کرو، اللہ کے راستے میں صبح اور شام کو چل لیا کرو اور اعتدال کے ساتھ چلا کرو، منزل مقصود کو پہنچ جاؤ گے، (صحیح البخاری: 6463)۔"

"غراام" کے معنی ہیں: چھٹ جانے والا، لازم ہو جانے والا جس سے بچنا مشکل ہو یعنی دائیٰ عذاب، اس کے دوسرے معنی ہیں: "مہلک" جو ترجمہ میں مذکور ہے۔ "غراام" کے ایک معنی ہیں: شدت اور سختی سے مطالبہ کرنا، قرض خواہ اور قرض دار دونوں کو "غیریم" کہتے ہیں دوزخ کے عذاب کو غراام فرمایا، کیونکہ وہ عذاب مجرموں کے ساتھ لازم اور دائم رہے گا اور ان سے بالکل جدا نہیں ہو گا، قرض خواہ کو بھی اس لیے "غیریم" کہتے ہیں کہ وہ مقرض سے چھٹا رہتا ہے اور ہر وقت اپنے قرض کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔

آیت: 67

"وَالَّذِينَ إِذَا آنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَاماً"۔

اللفاظ	معانی	اللفاظ	معانی
إِذَا آنفَقُوا	جب وہ خرچ کرتے ہیں	لَمْ يُسْرِفُوا	اسراف (بے جا خرچ) نہیں کرتے
لَمْ يَقْتُرُوا	بیکنی نہیں کرتے	قَوَاماً	اعتدال، میانہ روی، نہ کم نہ زیادہ

ترجمہ: "اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ توبے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں اور ان کا (طرز عمل) میانہ روی اور اعتدال کا ہوتا ہے۔"

تفسیر و تشریح؟

پانچویں صفت یہ بیان فرمائی کہ اللہ کے خاص بندے اسراف اور اقتار سے گریز

کرتے ہیں۔ اسراف و احتمار کے متعدد معانی ذکر کیے گئے ہیں، ان تمام معانی میں ایک قدر مشترک ضرور ہے اور وہ یہ کہ اسراف کے معنی ہیں: خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا، بے جا خرچ کرنا اور احتمار کے معنی ہیں: بُل کرنا، جہاں ضرورت ہو وہاں خرچ کرنے سے دامن بچانا، لیکن ان دونوں الفاظ کے جملہ معانی جوان کے شرعی مفہوم کو واضح کرتے ہیں، یہ ہیں:

اللہ کی نافرمانی اور معصیت میں مال صرف کرنا "تَبْذِيرٌ" ہے خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ اور مباح کاموں میں حد سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے اور اللہ کی اطاعت میں مال صرف کرنے سے گریز کرنا "إِقْتَارٌ" (بُل) ہے۔ ان دونوں کی درمیانی را "قَوْمٌ" یعنی "اعتدال" ہے اور "اتقہاد" جو شرعاً پسندیدہ امر ہے، یعنی جائز امور میں دل کھول کر صرف کرنا اور ناجائز را میں صرف کرنے سے قطعی طور پر گریز کرنا، حدیث پاک میں ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَا عَالَ مَنْ اتَّصَدَّ"، ترجمہ: "جس نے میانہ روی سے کام لیا، وہ تنگ دست نہیں ہو گا، (مسند احمد بن حنبل: 4269)"۔

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں: "خَيْرُ الْأُمُورِ أَوْسَطُهَا"، ترجمہ: "معاملات میں بہترین عبادت میانہ روی ہے، (مصنف ابن ابی شیبہ: 35128)"۔

آیت: 68-69

"وَ الَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَّا أَخْرَ وَ لَا يَقْتُلُونَ النَّفَسَ الَّتِي حَرَمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَرْزُونَ وَ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَاماً ۝ يَضْعَفُ لَهُ الْعَزَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَ يَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا ۝"۔

مشکل الفاظ کے معانی

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
دوسرा	آخر	نہیں پکارتے	لَا يَدْعُونَ
معبوو	إِلَهٌ	حرام قرار دیا	حَرَمَ
و قتل نہیں کرتے	لَا يَقْتُلُونَ	زنہ نہیں کرتے	لَا يَرْزُونَ

مُحرّق کے ساتھ (یعنی شرعاً و مُفْحَض ”مِبَاح الدَّم“ ہو)	إِلَاؤْلَحْقِي		پائے گا	یَدْقَ
گناہ	أَثَامَ	دُغْنَا كر دیا جائے گا		يُضْعَفُ
ہمیشہ رہے گا	يَخْلُدُ	ذلیل و رسوا ہو کر (اہانت کیا ہوا)	مُهَانًا	

ترجمہ: ”اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبدود قرار دے کر نہیں پکارتے اور اُس انسانی جان کو قتل نہیں کرتے جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ اور زنا نہیں کرتے اور جو ایسا کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا، اس کے لیے قیامت کے روز عذاب دُغْنَا کر دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ اس میں ذلیل و رسوا ہو کر پڑا رہے گا۔“

تفسیر و تشریح:

ان دو آیات میں اللہ کے خاص بندوں کی وہ صفات بیان کی گئی ہیں، جو منفی اور سلبی ہیں، یعنی محرمات و ممنوعات کے ارتکاب سے اپنے دامنِ ایمان و عمل کو پاک و صاف رکھنا اور وہ یہ ہیں:

چھٹی صفت شرک سے بچنا ہے، کیونکہ شرک بکیرہ گناہوں میں سرفہرست ہے اور ناقابلِ معافی جرم ہے تا وقتیکہ اس سے توبہ نہ کر لی جائے، قرآن نے اسے ”ظالم عظیم“، قرار دیا ہے اور درحقیقت یہ براہ راست اللہ کی غیرت کو چلتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إِنَّ الشَّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ“، ترجمہ: ”بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے، (قلم: 13)۔“

ہر گناہ کی معافی ہو سکتی ہے، لیکن شرک ناقابلِ معافی گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرِكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنِ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَ إِلَهًا عَظِيمًا“۔

ترجمہ: ”بے شک اللہ اس گناہ کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور جو اس سے کم درجے کے گناہ ہیں، جس کے لیے چاہے اسے بخش دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو یقیناً اس نے بہت بڑے گناہ کا بہتان باندھا، (النَّاس: 48)۔“

حضرت معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
 ”یَا مَعَاذْ! أَتَدْرِی مَا حَقُّ اللَّهِ عَلَى الْعِبَادِ، قَالَ: أَللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: أَنْ يَعْبُدُوا
 وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، أَتَدْرِی مَا حَقُّهُمْ عَلَيْهِ، قَالَ: أَللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: أَنَّ لَهُ
 يُحَدِّبَهُمْ“۔

ترجمہ: ”حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:
 اے معاذ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ کا اس کے بندوں پر کیا حق ہے، انہوں نے کہا: اللہ اور
 اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت
 کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ بندوں کا اللہ
 پر کیا حق ہے، عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، فرمایا: یہ ہے کہ وہ انہیں
 عذاب نہ دے، (صحیح البخاری: 7373)۔“

ساتویں صفت یہ کہ وہ انسان اپنے جان کو قتل نہیں کرتے، کیونکہ قتل بھی گناہ کبیرہ ہے اور
 انتہائی قابل نفرت اور گھنا و ناجرم ہے، یہ دنیا میں بھی قابلِ سزا جرم ہے اور آخرت میں بھی،
 قتلِ عمد (دانستہ کسی کو قتل کرنے) کی سزا قصاص ہے یا اگر مقتول کے ورثاء راضی ہوں تو
 دیت ادا کر کے صلح کر سکتے ہیں اور قتل خطا کی سزادیت ہے۔ ”إِلَآ بِالْحَقِّ“ کہہ کر قرآن نے
 ان صورتوں کا استثناء فرمایا ہے جہاں تقاضائے شریعت کے تحت قتل نفس کی اجازت ہے،
 مثلاً کفار و مشرکین سے جب جہاد ہو رہا ہو یا قصاص لینے کے لیے قاتل کو قتل کرنا یا زانی کو
 سنگار کرنا یا مژید کو قتل کرنا وغیرہ حضرت عبد اللہ بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا:
 ”لَا يَحِلُّ دَمُ مُسْلِمٍ إِلَّا بِأَحْدَى ثَلَاثَةِ: النَّفْسُ بِالنَّفْسِ وَالثَّيْبُ الرَّزَانِ وَالثَّارِكُ
 لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلنَّجَاعَةِ“۔

ترجمہ: ”مسلمان کا خون تین میں سے کسی ایک صورت کے سوا حلال نہیں ہے: (۱) جان کے
 بد لے جان، (۲) شادی شدہ زانی، (۳) دین حق سے پھر جانے والا اور جماعت سے علیحدگی
 اختیار کرنے والا (یعنی بااغی کہ ان کا خون شرعاً مباح ہے)، (صحیح ابن حبان: 5977)۔“
 آٹھویں صفت یہ ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے، یہ بھی بدترین کبیرہ گناہ ہے، اس کی

مز اشریعیت میں معین کردی گئی ہے جسے "حد زنا" کہتے ہیں۔ زانی یا زانیہ اگر شادی شدہ ہوں تو ان کی سزا رجم یا سنگار کرنا ہے اور غیر شادی شدہ ہوں تو سوکڑے ہیں۔ ان سزاوں کے نفاذ کے باوجود جب تک صدق دل سے توبہ نہ کی جائے، آخرت کی سزا سے نہیں بچ سکتے،

حضرت عبد اللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

"أَنَّى لِلَّهِ بِأَعْظَمِ عِنْدَ اللَّهِ، قَالَ: أَنْ تَجْعَلَ لِلَّهِ نِدَا وَهُوَ خَلَقَكَ، قُلْتُ: إِنَّ ذَلِكَ لَعَظِيمٌ، قُلْتُ: ثُمَّ أَنَّى، قَالَ: وَأَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ تَخَافُ أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ، قُلْتُ: ثُمَّ أَنَّى، قَالَ: أَنْ تُزِّلِّي حَلِيلَةَ جَارِكَ"۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کوششیک ٹھہراو، حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے، میں نے کہا: بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے، میں نے کہا: پھر کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے بیٹے کو اس خوف سے قتل کر دو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانا کھائے گا!، میں نے کہا: پھر کون سا گناہ زیادہ بڑا ہے؟، فرمایا: تم اپنے پڑوسن کی بیوی سے زنا کرو، (صحیح البخاری: 4477)۔ یہ حدیث اس آیت کریمہ کی تائید کرتی ہے، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سب سے بڑا گناہ شرک ہے اس کے بعد کسی مسلمان کو ناقص قتل کرنا اور اس کے بعد بڑا گناہ زنا کرنا ہے۔

آیت: 70-71

"إِلَّا مَنْ تَابَ وَأَمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحًا فَأُولَئِكَ يُبَرَّأُنَّ اللَّهُ سَيِّدُ الْعِبَادِ
حَسْنَتٌ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّاحِيمًا① وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ
إِلَى اللَّهِ مَتَابًا②"۔

مشکل الفاظ کے معانی

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
ایمان لا یا	امَنَ	جس نے توبہ کی	مَنْ تَابَ

تہذیل کر دے گا، بدل دے گا (تہذیل کی تجھ)	تہذیل تہذیل کر دے گا، بدل دے گا (تہذیل کی تجھ)	تہذیل کر دے گا، بدل دے گا (تہذیل کی تجھ)	تہذیل کر دے گا، بدل دے گا (تہذیل کی تجھ)
توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا	توبہ توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا	توبہ توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا	توبہ توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا توبہ کرتا ہے تو بے کر دے گا
مٹاپا (خَنَّثٌ کی تجھ) مٹاپا کر کے بخشش مانع کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنا۔	مٹاپا (خَنَّثٌ کی تجھ) مٹاپا کر کے بخشش مانع کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنا۔	مٹاپا (خَنَّثٌ کی تجھ) مٹاپا کر کے بخشش مانع کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنا۔	مٹاپا (خَنَّثٌ کی تجھ) مٹاپا کر کے بخشش مانع کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنا۔

ترجمہ: "مگر وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے، تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے تبدیل فرمادے گا اور اللہ بہت بخشنے والا ہے حدر حرم فرمانے والا ہے اور جس نے توبہ کی اور نیک عمل کیے تو بے شک وہ اللہ کے حضور پھر توبہ کرتا ہے۔"

تفسیر و تشریح:

ان دو آیات میں عباد الرحمن کی نویں صفت "توبہ" بیان کی گئی ہے۔ توبہ کے انوی معنی ہیں: "رجوع کرنا"، قرآن میں یہ لفظ بندے کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے اور مبالغہ کے ساتھ اللہ کی صفت کے طور پر بھی۔ لفظ توبہ کی نسبت اگر بندے کی طرف ہو تو بندے کا بخشش، معافی اور رحمت طلب کرنے کے لیے اللہ کی طرف متوجہ ہونا، گناہ پر نادم و پشیمان ہونا مراد ہوگا اور اگر اس کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو معنی ہوں گے: "اللہ کا اپنی رحمت، عافیت اور مغفرت کے ساتھ بندے کی طرف توجہ فرمانا، بندے کی ندامت اور توبہ کو قبول کرنا"۔

اسان خطا کا پتلا ہے، خطاء در گناہ کا اس سے سرزد ہونا بعید نہیں ہے۔ اسلام نے اسی لیے "توبہ" کی منجاش رسمی ہے تاکہ خدا نخواستہ اگر انسان سے بشری تقاضے کے تحت غلطی ہو جائے تو وہ ہمیشہ یا س و قتوطیت میں بدلانہ ہو جائے، بلکہ اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کے لیے نہ صرف دامسی کاراستہ خلا ہے، بلکہ رحمت پروردگار اس کی منتظر رہتی ہے، علامہ اقبال نے کہا ہے:

ہم تو مائل ہے کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھائیں کے رہرو منزل ہی نہیں
چھی تو بے، جسے قرآن نے "توبۃ النصوح" کہا ہے، انسان کے ماضی کے گناہ

معاف ہو جاتے ہیں، حدیث پاک میں ہے: "الثَّابِتُ مِنَ الذَّنْبِ كَمْ لَا ذَنْبَ لَهُ"۔
 ترجمہ: "گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جو یا اس نے گناہ ہی نہیں کیا، (ابن ماجہ: 4250)"۔
 بلکہ اس آیت میں توبہ کرنے والے کے لیے بہت بڑی بشارت ہے: "اللَّهُ أَنَّكُمْ كَانُوكُمْ كَمْ
 نَيْكُوْنُ مِنْ بَدْلٍ دَعَاهُ"، یعنی صرف گناہوں سے معافی ہی نہیں ملے گی، بلکہ گناہوں کے
 بدله میں اللہ تعالیٰ نیکیاں عطا فرمائے گا، اس کے متعدد مفہوم بیان کیے گئے ہیں:
 ایک تو یہ ہے کہ سچی توبہ سے اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور آئندہ اے
 نیکیوں کی توفیق نصیب ہوگی۔

دوم: یہ کہ خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے کہ توبہ کی برکت سے گناہوں کو نہ کوئی اعمال
 سے مٹا کر ان کے بدله میں نیکیاں عطا کر دی جائیں، چنانچہ ایک حدیث پاک میں ہے:
 حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"رَجُلٌ يُوقَنُ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيَقُولُ: إِغْرِضُوا عَلَيْهِ صِغَارُ ذُنُوبِهِ وَأْرْفَعُوا عَنْهُ كِبَارَهَا،
 فَتُغَرَّضُ عَلَيْهِ صِغَارُ ذُنُوبِهِ، فَيَقُولُ: عَيْلَتْ يَوْمَ كَذَا وَكَذَا وَكَذَا، وَعِيلَتْ يَوْمَ كَذَا
 وَكَذَا وَكَذَا، فَيَقُولُ: نَعَمْ، لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُنْكِرَ وَهُوَ مُشْفِقٌ مِنْ كِبَارٍ ذُنُوبِهِ أَنْ
 تُغَرَّضَ عَلَيْهِ، فَيَقُولُ اللَّهُ: فَإِنَّ لَكَ مَكَانَ كُلِّ سَيِّئَةٍ حَسَنَةً، فَيَقُولُ رَبِّي، قَدْ عَيْلَتْ
 أَشْيَاءً لَا أَرَا هَا هَا هَا، فَلَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ ضَحِكَ حَتَّى بَدَأَ تَوَاجِدَهُ"۔

ترجمہ: "قیامت کے روز ایک شخص کو پیش کیا جائے گا اور کہا جائے گا: اس کے صغیرہ گناہوں کو
 پیش کرو تو اس کے صغیرہ گناہ پیش کیے جائیں گے اور کبیرہ گناہوں کو مخفی رکھا جائے گا۔ اس
 سے کہا جائے گا: تم نے فلاں فلاں گناہ کیے، وہ اقرار کرے گا اور (دل ہی دل میں) کبیرہ
 گناہوں سے خوفزدہ ہو گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اسے ہر گناہ کے بدله میں ایک ایک نیکی
 دے دو، جب وہ رحمتِ الہی کا یہ عجیب و غریب نظارہ دیکھے گا، تو کہے گا: میرے تو اور بہت
 سے گناہ ہیں جو آج یہاں پیش نہیں کیے گئے، یعنی وہ توقع کرے گا کہ ان کے بدله میں بھی
 اُسے آج نیکیاں ملیں، (راوی نکھتے ہیں): میں نے دیکھا، (بندے کی خطا اور رب کی
 شانِ عطا کی یہ کیفیت بیان فرماتے وقت) نبی ﷺ (فرطِ مسرت سے) پس پڑے

یہاں تک کہ آپ کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے، (صحیح مسلم: 190)۔

توبہ کی قبولیت اور صحت کی بعض شرائط ہیں، جو علماء نے بیان کی ہیں اور وہ یہ ہیں:

یہ کہ گنہگار انسان اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور صدقِ دل سے اس پر نادم

ہو، صرف زبان سے توبہ نہ ہو۔

پھر اللہ ہے اس گناہ کی معافی طلب کرے اور آئندہ کے لیے عہد کرے کہ گناہ کا

اعادہ نہیں کرے گا۔

اگر جرم پوشیدہ طور پر کیا ہے تو تہائی میں اللہ سے توبہ کر سکتا ہے اور اگر جرم علانیہ

طور پر برسیر عام کیا ہے تو اس کی علانیہ توبہ ضروری ہے۔

اور اگر وہ جرم کسی بندے کے حق سے متعلق ہے تو اس کی توبہ کی قبولیت کے لیے

لازماً شرط یہ ہے کہ صاحبِ حق سے معافی طلب کرے اور اس کا جو حق تلف کیا ہو

اس کی تلافی کرے، اگر وہ مرچکا ہے تو اس کے ورثاء سے رجوع کرے، ورنہ اگر

حق تلفی مال سے متعلق ہے تو اس کی طرف سے صدقہ کرے اور اس کے علاوہ کچھ

ہے تو اس کے لیے استغفار کرتا رہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عہد کرنے کے آئندہ اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرے گا، نیز اللہ

سے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق مانگے۔

آیت: 72-73-74

”وَالَّذِينَ لَا يُشَهِّدُونَ الرُّؤْسَأَ وَإِذَا مَرْءُوا بِاللَّغْوِ مَرْءُوا كَمَا أَمَّا وَالَّذِينَ إِذَا
ذُكْرُوا بِإِيمَنِهِمْ لَمْ يَخْرُفُوا عَلَيْهَا صُمَّاً وَعُمَيَّاً وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَاهِئًا
هَبْ لَنَا مِنْ أَذْوَاجِنَا وَذُرِّيَّتِنَا قُرْبًا أَغْدِنُ وَاجْعَلْنَا لِلنَّصِيقِينَ إِمَامًا“۔

مشکل الفاظ کے معانی

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
الله	جوابی نہیں دنتے	الله	جوابی نہیں دنتے	لَا شَهِيدُونَ

بے مقصد کام، بیہودگی، بھیل تماشا	اللَّغْوِ	جب وہ گزرتے ہیں	اِذَا مَرُدا
جب انہیں یاد دلا یا جاتا ہے	إِذَا ذُكِرَوا	بزرگانہ طور پر شرافت اور وقار کے ساتھ	کِرَاماً
بہرے بن کر (اسم کی جمع)	صُنْتاً	نہیں گرپڑتے	لَمْ يَخْرُداً
ہمیں عطا کر، عنایت فرم۔	هَبْ لَنَا	اندھے بن کر	عُمَيَاناً
آنکھوں کی ٹھنڈک (اعین عین کی جمع)	قُرْءَةَ أَعْيُنٍ	ہماری بیویوں سے (زوج کی جمع)	مِنْ أَذْوَادِنَا
پیشوا، رہنمایا	أَمَامٌ	ہماری اولاد	ذُرْيَتَنَا

ترجمہ: ”اور وہ لوگ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب کسی بیہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو عزت و قار کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور جب ان لوگوں کو ان کے رب کی آیات سے نصیحت کی جائے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے اور وہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرم اور ہمیں پرہیز گاروں کا پیشوا بنادے۔“

تفسیر و تشریح:

ان آیات میں ”عبد الرحمن“ کی مزید خصوصیات بیان کی گئی ہیں: دسویں صفت کے طور پر ”لَا يَشَهَدُونَ الرُّؤْرَ“ کے الفاظ بیان فرمائے گئے ہیں۔ شہادت کے دو معنی ہیں: گواہی دینا، حاضر ہونا، اور ”رؤر“ کے معنی ہیں: مجھوٹ، باطل، اس طرح آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھوٹ گواہی نہیں دیتے، ایک حدیث میں جھوٹی گواہی کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہارے میں منقول ہے کہ وہ مجھوٹی گواہی دینے والوں کو 40 کوڑے لگواتے تھے اور ان کا منہ کالا کر کے اُسے بازار میں پھراتے، ہمارے ملک کی عدالتوں میں مقدامات کی بھرمار کا ایک سبب پیش در جھوٹی گواہوں کا وجود بھی ہے، اب پریم کورٹ اس کا سدیہ باب کرنے کی کوشش کر رہی ہے

کہ جان بوجھ کر جھوٹی گواہی دینے والوں کو سزا دی جائے۔
دوسرا معنی یہ ہوں گے کہ وہ باطل مجالس میں حاضر نہیں ہوتے، ان میں شرکت
نہیں کرتے ”مجالسِ ذور“ سے مراد ہو ولعب، شراب و کباب، جتو اونٹ، رقص و سرود،
گانے بجائے اور اسی طرح کی خرافات پر مبنی مجلسیں ہیں۔

آیت کا دوسرا حصہ اسی مفہوم کو تقویت پہنچاتا ہے کہ جب ”لغو“ چیزوں پر اُن کا
گزر ہوتا ہے تو اپنے دامن کو بچاتے ہوئے عزت و قار کے ساتھ وہاں سے گزر جاتے ہیں،
لہجی ان میں شریک ہو کر ان کی رونق بڑھانے کا سبب نہیں بنتے۔

آیت نمبر: ۳۷ میں گیارہویں صفت بیان فرمائی کہ اللہ کے خاص بندوں کے
سامنے جب آیاتِ الہی تذکرہ و نصیحت کے لیے پڑھی جاتی ہیں یا وہ اُنفس و آفاق میں پھیلی
ہوئی آیاتِ الہی کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو اُن سے نصیحت حاصل کرتے ہیں، اندھے اور
بہرے بن کر اُن کو نظر انداز نہیں کرتے، یعنی ایسا نہیں کہ دیکھ کر عبرت حاصل نہ کریں اور من
کر تسلیم نہ کریں، قرآن مجید سننے کے بعد ان کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور ان پر قرآن
مجید کی تلاوت کا اثر ہوتا ہے اور ان کے دل غفلت سے بیدار ہوتے ہیں۔

اگلی آیت میں بارہویں صفت بیان فرمائی کہ اللہ کے خاص بندے وہ نہیں جو دُنیا
سے کنارہ کش ہو کر محض اپنی نجات کی فکر میں لگر رہتے ہیں، بلکہ وہ دُنیا اور دُنیا والوں میں
رہتے ہوئے نہ صرف اپنی فلاح بلکہ اپنے متعلقین اور آئندہ نسلوں کی فلاح و نجات کا سامان
فرماہم کرتے ہیں اور اپنی امکانی جدوجہد کے بعد اللہ سے دُعائے خیر مانگتے ہیں کہ ازواج و
ولاد کی اسے ایسی دولت ملے، جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور قلب کو سکون و قرار نصیب ہو۔
اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کی اولاد بہت حسین و جمیل ہو، بہت مالدار اور دُنیاوی فنون میں
طاق ہو، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اولاد اللہ تعالیٰ کی فرمائی بردار اور عبادت گزار ہو اور نیکیوں
کی پیشوائی کا اعلیٰ ترین منصب نہیں تفویض ہو، یہی دُعائے ابراہیمی بھی ہے۔

آیت: 75-76-77

”أُولَئِكَ يُعْجِزُونَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَ يُلْقَوْنَ فِيهَا تَحْيَةً وَ سَلَامًا لَ خَلِيلِينَ فِيهَا حَسْنَتٌ مُسْتَقْرًا وَ مُقَاماً ۝ قُلْ مَا يَعْبُدُ أَيُّكُمْ رَبِّنِي لَوْلَا دُعَاءُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِرَأْمَامَا“ ۝

مشکل الفاظ کے معانی

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
أُولَئِكَ	وہ لوگ	يُعْجِزُونَ	أُخْسِيْس بَدْلَه دِيَاجَيَّه گا
يُلْقَوْنِ	ان کا استقبال کیا جائے گا	تَحْيَةً	سَلام، درازی عمر کی دُعا دینا
حَسْنَتٌ	اچھی ہے، بھلی ہے	مَا يَعْبُدُ	پروانہیں کرتا
كَذَّبْتُمْ	تم نے جھٹالیا	لِرَأْمَامَا	موت، حساب، فیصلہ، اور چھٹنے والا
الْغُرْفَةَ	بالاخانہ	خَالِدِينَ	ہمیشہ رہنے والے
دُعَاءُكُمْ	تمہاری دُعا، تمہارا پکارنا		

ترجمہ: ”یہی وہ (خوش نصیب) لوگ ہیں، جنہیں ان کے صبر کے صلے میں جنت کی بلند عمارت دی جائیں گی اور وہاں ان کا سلام و دعا سے استقبال کیا جائے گا، وہ اس میں ہمیشہ ایمیشہ کے لیے رہیں گے، وہ ٹھہر نے اور رہنے کی عمدہ جگہ ہے، آپ کہیے! اگر تم میرے رب کی عبادت نہ کرو تو اس کو تمہاری کوئی پروانہیں ہے، پھر بے شک تم نے اس کو جھٹالیا تو اس کا عذاب تم پر ہمیشہ لازم رہے گا۔“

تفسیر و تشریح:

آخری تین آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اعلیٰ ترین صفات کے حامل اُس کے مخصوص بندے جو حق کی خاطر تمام تر مشکلات، رکاوٹوں اور آزمائشوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں، ان کی یہ کوشش، محنت اور ریاضت رائیگاں نہیں جانتے گی، بلکہ

آخرت کی نعمتیں ان کی منتظر ہیں جہاں انہیں ہر طرح کے اعزاز و اکرام سے نوازاجانے گا،
جہاں انہیں وہ سب کچھ میسٹر ہو گا جس کی انہیں تمنا ہو گی، فرشتے ان کو سلام کریں گے یا وہ
آپس میں ایک دوسرے کو سلام کریں گے یا ان کا رب ان پر سلامتی فرمائے گا اور ایک قول
یہ بھی ہے کہ سلام سے مراد یہ ہے کہ وہ آفات اور مصائب سے سلامت رہیں گے اور وہ اس
جنت میں ہمیشہ رہیں گے، وہ ٹھہر نے اور رہنے کی عمدہ جگہ ہے۔

لیکن آخری آیت میں یہ بھی واضح فرمایا کہ جو لوگ ایمان کی دولت سے محروم
ہیں اور اللہ کی عبادت کے سچے جذبے سے سرشار نہیں اور بندے ہوتے ہوئے بھی بندگی کا
حق ادا نہیں کرتے، اللہ کو بھی ان کی کچھ پروانہیں، اللہ ان کی طرف کوئی التفات نہیں فرمائے
گا اور جو اللہ کو یاد نہیں کرتے، نہ اس کو پکارتے ہیں، نہ اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، ایسے
لا تعلق رہنے والوں اور سرکش لوگوں کی طرف رحمت کی نظر نہیں فرمائے گا، انہوں نے جو اللہ
کی آیات کو جھٹالا یا، اس کی پاداش میں انہیں ایسے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا، جس کا
سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا۔

سُورَةُ الْحُجُّرَاتِ

اجمالي خاکہ:

ترتیب قرآنی کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی انچاسویں سورت ہے اور ترتیب
نزوی کے اعتبار سے یہ ۱۰۸ ویں سورت ہے، یہ چھبیسویں پارے میں ہے۔ اس سورہ کی
چوتھی آیت میں چونکہ لفظ ”الْحُجُّرَاتِ“ آیا ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام سورۃ الحجرات
رکھا گیا ہے، اس میں دور کو ع اور اٹھارہ آیات ہیں۔ یہ سورۃ مدنی ہے، اس کی آیات متفرقہ
طور پر نازل کی گئیں، بیشتر احکام کا تعلق نبوت کے مدنی دور کے آخری رسول سے ہے۔
اس سورۃ میں مندرجہ ذیل احکام اور موضوعات پر تعلیمات دی گئی ہیں:

۱۔ عقائد و ایمانیات: آیات نمبر: ۷-۱۴-۸-۱۵-۱۶-۱۷-۱۸

۲۔ آداب بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: آیات نمبر: ۱ تا ۵

۳۔ اخوتِ اسلامی اور مساوات: آیات نمبر: ۱۰-۱۳

۴۔ مسلمانوں کے باہمی تنازعات طے کرنے کا اصول: آیت نمبر: ۹

۵۔ ہر سی سنائی خبر پر بلا تحقیق رو عمل سے گریز کرنے کا حکم: آیت: ۶

۶۔ اسلامی اخلاقیات: آیات نمبر: ۱۱-۱۲

۷۔ اخلاقی برائیوں سے اجتناب کا حکم مثلاً دوسروں کا تمسخر اور مذاق اڑانا، عیب جوئی اور
طعن و تشنیع، تحقیر آمیز نام رکھنا اور ان ناموں سے پکارنا، بدگمانی کرنا، دوسروں کے نجی احوال
کو کریدنا، ٹوہ لگانا اور غیبت کرنا وغیرہ۔ آیات نمبر: ۱۲-۱۱

اس اجمالي تعارف سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ سورۃ الحجرات قرآن کی ایک
جامع سورت ہے اور اس کا اہم موضوع ایمانیات اور اخلاقیات ہے، مگر جو موضوع اس
سورۃ کا عنوان اور جوہر ایمان ہے، وہ ہے مقام نبوت کی تظمیم و توقیر، محبت رسول اور احترام
بارگاہ نبوت۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَ مَرْسُولِهِ وَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلَيْهِمْ ① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَزَفَّوْا أَصْوَاتُكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرٍ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالَكُمْ وَ أَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ② إِنَّ الَّذِينَ يَعْصُونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَئِكَ الَّذِينَ آمْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِتَتَّقَوْىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَ أَجْرٌ عَظِيمٌ ③ إِنَّ الَّذِينَ يُنَادِونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجَّرَاتِ أَكْثُرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ④ وَ لَوْ أَنَّهُمْ صَابِرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۖ وَ اللَّهُ غَفُورٌ سَّاجِيدٌ ⑤“ -

مشکل الفاظ کے معانی

المعانی	الفاظ	المعانی	الفاظ
سنہ والا	سَيِّئُمْ	آگے نہ بڑھو، سبقت نہ کرو	لَا تُقْدِمُوا
اپنی آوازوں کو، آصوات، صوت کی جمع	أَصْوَاتُكُمْ	سامنے، آگے	بَيْنَ يَدَيِ
آوازوں پر کھینچنے کرو	لَا تَجْهَرُوا	بلندنہ کرو	لَا تَرْفَعُوا
تمہارے اعمال (عمل کی جمع ہے)	أَعْمَالَكُمْ	اوپر	فَوْقَ
پیچ کرتے ہیں، پست رکھتے ہیں	يَغْصُونَ	مٹ جائیں گے، ضائع ہو جائیں گے	تَحْبَطَ
پرہیزگاری	تَقْوَىٰ	تمہیں شور نہیں ہوگا	لَا تَشْعُرُونَ
ثواب	أَجْرٌ	اس نے آزمایا، پر کھلایا	إِمْتَحَنَ
کروں کے پیچے سے، یہاں مراد ہے ”باہر سے“	مِنْ وَرَاءِ الْحُجَّرَاتِ	بخشش	مَغْفِرَةٌ
اگر	لَوْ	آپ کو پکارتے ہیں، بلا تے ہیں	يُنَادِونَكَ

انہوں نے صبر کیا، وہ صبر کرتے آپ تکتے، آپ تکنیں مے	صَبَرُوا تَحْمِلُوا	وہ عقل نہیں رکھتے یہاں تک	لَا يَغْلِطُونَ
		ختی جانے والا	عَلَيْهِمْ

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سب کچھ خوب سننے اور بہت جانے والا ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبی کی آواز سے اوپنچی نہ کرو اور نہ ان کے سامنے اتنی بلند آواز سے بولو، جیسے آپس میں (بے تکلفی کے ساتھ) ایک دوسرے سے بلند آواز سے بات کرتے ہو، ورنہ تمہارے سب اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ بے شک جو لوگ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے، انہی کے لیے بخشش اور بڑا جر ہے۔ (اے رسول مکرم!) بے شک جو لوگ آپ کو مجرموں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں اکثر ناس بمحیب ہیں اور اگر وہ صبر کر لیتے حتیٰ کہ آپ خود باہر آجاتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور اللہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے، (الحجرات: 1 تا 5)۔

تفسیر و تشریح:

پہلی آیت میں اللہ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے، پیش قدمی کرنے اور سبقت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، جس کے ظاہری معنی ہیں: آگے بڑھ کر چلا، لیکن یہاں محض ظاہری اور سطحی معنی مراد نہیں ہیں، بلکہ ہمہ گیر اور جامع معنی مراد ہیں اور وہ یہ کہ اہل ایمان پر لازم ہے کہ اپنی دینی و دنیوی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں اللہ اور اس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے سرمواخراف نہ کریں، شریعت کے بیان کردہ حلال و حرام کی پابندی کریں اور یہ حکم فرد سے لے کر ریاست تک سب پر لاگو ہے۔ فردا چنانی انفرادی زندگی میں اللہ کے احکامات کی پابندی کرے اور ریاستی سطح پر قانون سازی اور اس کے نفاذ میں اللہ اور اس کے رسول کی مشاکومقدم رکھے اور کوئی قانون اللہ اور اس کے

رسول کی فشا کے خلاف نہ بنایا جائے، اللہ اور اس کے رسول کی مشا اور رضا معلوم کرنے کے

لیے ہمارے پاس معیار کتاب دست ہے۔
دوسری آیت میں بارگاہِ نبی کے آداب تعلیم فرمائے گئے ہیں، جو یہ ہیں:
نبی ﷺ کی آواز پر اپنی آواز کو پت رکھنا اور نبی کے ساتھ عامیانہ لہجہ اختیار نہ
کرنا۔ نبی ﷺ کی تعلیم و تقویر مومن کے ایمان کا حصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے
رسول اللہ ﷺ سے ہم کلام ہونے کے آداب بھی تعلیم فرمائے، مومن کے لیے جب نبی
ﷺ کے سامنے اپنی آواز سے گفتگو تک کی ممانعت ہے تو کسی اور بے ادبی کا تصور بھی
نہیں کیا جا سکتا۔

شریعت کا عام اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں فرماتا، لہذا جہاں
ایک مسلمان گناہوں پر سزا کا سزاوار ہوگا، وہاں وہ اپنی نیکیوں پر جزا کا بھی حقدار ہوگا، بس
صرف دو گناہ ایسے ہیں جو تمام نیکیوں کو یکسر مٹا دیتے ہیں: ایک گُفروار تعداد اور دوسرا شان
رسالت و نبوت میں گستاخی و بے ادبی، شانِ رسالت ﷺ میں بے ادبی و گستاخی گُفر ہے۔
کوئی شخص درع و تقویٰ، علم و آگہی اور فضل و مکال کے کتنے ہی اعلیٰ مرتبے پر فائز کیوں نہ ہو،
اگر شانِ رسالت میں ادنیٰ سی گستاخی کا بھی مرتكب ہوتا ہے، تو یہ بے ادبی اُسے ذلت و پستی اور
ایمان عمل کی تباہی و بر بادی سے دوچار کر سکتی ہے، وہ اسی عظیم بارگاہ ہے، شاعر نے کہا:

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بايزید ایں جا

ترجمہ: ”آسمان کے نیچے یہ ادب کا مقام ہے، حضرت جنید و بايزید جیسے اللہ کے ولی جب
یہاں حاضری دینے آتے ہیں تو اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔“

چنانچہ صحابہ کرام جو پہلے بھی انہائی حد تک بارگاہِ رسالت کے ادب کا پاس رکھتے
تھے، اس آیت کے نزول کے بعد اور بھی محتاط ہو گئے، یہاں تک کہ ایک صحابی ثابت بن
قیس رضی اللہ عنہ نے، جو قدرتی طور پر بلند آواز تھے، اپنے آپ کو مقید کر لیا اور زار و قطار

روتے رہے اور توبہ کرتے رہے اور ان کی تشفی اُس وقت ہوئی، جب نبی ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے انہیں تسلی دی۔

مفسرین کرام نے اس آیت سے اس پر بھی استدلال کیا ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے سامنے بلند آواز سے بولنا جائز نہیں ہے، اسی طرح آپ کی قبر انور پر جب حاضری ہوتا وہاں بھی آواز پیچی رکھنی چاہیے، لیکن اگر کوئی روضہ رسول کے علاوہ کسی جگہ بارگاہ رسالت میں ملوٹہ وسلام کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے اپنی آواز بلند کرتا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ آپ کی تعظیم میں آواز بلند کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ اسی طرح جب اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کا بیان ہو رہا ہو، آیات قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ کا درس ہو رہا ہو تو اس وقت بھی بلند آواز سے بولنا جائز نہیں ہے۔

تیسرا آیت میں یہ بتایا گیا کہ جو لوگ بارگاہِ نبوی ﷺ کے آداب اور حرمت کو لمحظہ رکھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی تقطیم اور ادب کی وجہ سے آپ کے سامنے اپنی آواز پست رکھتے ہیں کہ کہیں ان کے اعمال صالح نہ ہو جائیں، ان لوگوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوے کے لیے پر کھلایا ہے اور ان کے لیے تین انعامات ہیں:

اول: ان کے قلوب مرکزِ تقویٰ ہیں۔ دوم: ان کے لیے بخشش کی نوید ہے۔

سوم: نیک کاموں پر اجر عظیم کا وعدہ ہے۔

چوتھی آیت کے شانِ نزول میں مفسرین نے لکھا ہے:

بنو تمیم کا ایک وفد میں طبیبہ آیا، یہ لوگ دیہاتی تھے اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے، جب انہوں نے نبی ﷺ کو مسجد نبوی میں نہ پایا تو آپ ﷺ کا مسجد نبوی میں انتظار کرنے کے بجائے بے قراری اور اضطراب کے عالم میں امہات المؤمنین کے مجرات کے باہر ہی سے زور زور سے پکارنے لگے: ”اے محمد! ﷺ باہر آئیے!“، قرآن نے ان کے اس عمل کو نادانی اور جہالت پر محمول کیا کہ ان کا یہ قصور اور بے ادبی دانستہ نہ تھی، تاہم اگر وہ صبر کر لیتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا، لیکن چونکہ ان کی غلطی علمی کی بناء پر تھی، اس لیے اللہ کی جانب سے ان کی بخشش کی امید ہے۔

اس آیت میں ہمیں ایک عظیم معاشرتی ادب سے رذشان کرایا گیا ہے کہ ہر انسان کا اپنا ایک معمول ہوتا ہے، مثلاً: اس کا کام کا وقت، عبادت کا وقت، کھانے کا وقت اور آرام کا وقت، اس لیے کسی کے آرام کے اوقات میں بن بلائے مہمان کی طرح نہیں جانا چاہیے، بلکہ پہلے یہ معلوم کر لیں کہ اس کا معمول کیا ہے، اگر ملاقات کا وقت ہے تو ملاقات کر لیں اور اگر اس کے آرام کا وقت ہے تو انتظار کر لیں اور اس کی باہر آمد پر ملاقات کر لیں۔

آیت نمبر 6 تا 8

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَাসِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا
بِجَهَالَةٍ فَصَبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَدِيمِينَ ① وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيْكُمْ بَرَّاسُولُ اللَّهِ ۚ لَوْ
يُطِيقُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعِنْتُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبِّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَرَيَّتُمْ فِي
قُلُوبِكُمْ وَكَرَهَ إِلَيْكُمُ الْكُفَّرُ وَالْفُسُوقُ وَالْعُصِيَانُ ۖ أُولَئِكَ هُمُ الرَّشِيدُونَ ۖ ②
فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَنِعْمَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَلَيْهِ حَكِيمٌ ③“ -

مشکل الفاظ کے معانی

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
فَاسِقٌ	نافرمان، بدکار،	إِنْ جَاءَكُمْ	اگر تمہارے پاس آئے
بنَبَأٍ	خبر	بِنَبَأٍ	غور کرو، خوب تحقیق کرو
تُصِيبُوا	تم جا پڑو، نقصان پہنچاؤ	جَهَالَةٍ	نادانی، لا علمی
نَادِيمِينَ	شرمندہ، پشیمان	يُطِيقُكُمْ	تمہارا کہماں لیں
سَلَعِنْتُمْ	تو تم ضرور مصیبت میں پھنس جاؤ گے	حَبِّبَ	اس نے محبوب بنالیا
رَيَّتُمْ	اس نے اسے آراستہ کر دیا / مزین کر دیا	كَرَهَ	اس نے ناپسندیدہ بنادیا
نَافِرْمَانَ	نافرمانی	رَاشِدُونَ	ہدایت یافتہ

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق (کسی کے بارے میں) کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق اور چھان بین کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لا علمی میں کچھ لوگوں کو نقصان

پہنچا دو اور پھر انپے کیے پر پچھتا ناپڑے اور جان لو کہ تم میں اللہ کے رسول تشریف فرمائیں، اگر وہ اکثر معاملات میں تمہاری بات مان لیتے تو تم ضرور مشقت میں پڑ جاتے، لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے لیے محبوب بنادیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں خوش نما بنادیا ہے اور گفر، حکم عدوی اور نافرمانی کو ناپسندیدہ بنادیا ہے، یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں، یہ اللہ کا فضل اور نعمت ہے اور اللہ خوب جانے والا، حکمت والا ہے، (الحجرات: 6-7-8)۔

تفسیر و تشریح:

ان آیات کے شانِ نزول کے بارے میں مفسرین کرام نے جو روایات بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے: قبیلہ بنو مُصطفیٰ کا سردار حارث بن ابی لضر ار اسلام لے آیا اور واپس جا کر اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ وقت پر ولید بن عقبہ بن ابی ممعیط کو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا، وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر راستے سے لوٹ آئے اور آکر خبر دی کہ انہوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جوش ایمانی میں بنو مُصطفیٰ کے خلاف فوجی کارروائی کا مطالبہ کر دیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے کی توہین کی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا تأمل کے بعد حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں ایک دستہ ان کی طرف بھیجا، لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تاکید فرمادی کہ کسی کارروائی یا اقدام سے پہلے تحقیق کر لیں کہ آیا یہ خبر درست ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط اور خلاف واقعہ ہے اور ایک روایت کے مطابق حارث نے خود بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر غلط فہمی کا ازالہ کیا۔ بہر کیف مذکورہ دستہ بغیر کسی کارروائی اور گشت و خون کے صحیح سلامت واپس آگیا اور اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں یہ حکم دیا گیا کہ کسی غیر ذمے دار شخص کی خبر بلا تحقیق قبول نہیں کرنی چاہیے اور اس پر کسی کارروائی سے پہلے حقیقت حال معلوم کر لینی چاہیے، نیز یہ کہ جوش ایمانی بجا، لیکن یہ مطالبہ نہ کیا کرو کہ جو بات تمہارے جی میں آئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کے نتیجے میں خود تمہارے

لیے مشکلات پیدا ہوں گی، لہذا تمہیں چاہیے کہ رسول کی ہربات بلا چون و چوڑا تسلیم کر لیا کرو
خواہ وہ تمہاری اپنی سوچ کے برعکس ہی کیوں نہ ہوں۔

فقہی مسائل:

اس آیت سے علماء نے یہ مسائل اخذ کیے ہیں:

- (الف) فاسق کی خبر کی تحقیق کرنا واجب ہے اور بلا تحقیق اس پر عمل کرنا منوع ہے۔
- (ب) ایسے امور جن کا حقوق کے ساتھ تعلق ہے، ان میں فاسق کی شہادت قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ جب عام خبر لائق اعتبار نہیں تو شہادت تو حلفیہ ہوتی ہے اور اس میں مزید تاکید ہوتی ہے۔
- (ج) حدیث میں بھی فاسق کی روایت معتبر نہیں ہے۔
- (د) کسی قانون، کوئی شرعی حکم اور کسی انسان کے حق کو ثابت یا رد کرنے کے لیے بھی اس کی خبر معتبر نہیں ہوگی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر خبر لائق توجہ نہیں ہوتی، پہلے خبر کی تصدیق ہونی چاہیے، خصوصاً شمن کی طرف سے حالتِ جنگ میں لوگوں کے مورال کو گرانے کے لیے جو منفی پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، اس کی طرف توجہ دینے کی بجائے اس کا رد کرنا چاہیے یا حالتِ امن میں دشمنِ معیشت کی تباہی کے لیے منفی پروپیگنڈا کرتا ہے، اس کا شکار نہیں ہونا چاہیے، ان سب سے بچالازم ہے۔ یہ سو شل میڈیا کا دور ہے، اس میں لوگ غیر تصدیق شدہ خبریں پھیلاتے ہیں، اسے سو شل میڈیا کی زبان میں Share کرنا کہتے ہیں اور کئی مرتبہ غلط خبر کو ثواب سمجھ کر پھیلا یا جاتا ہے، من گھڑت احادیث بیان کی جاتی ہیں اور ان کو آگے پھیلا یا جاتا ہے، اسی طرح کسی کی کردار کشی کے حوالے سے خبریں پھیلانا، کسی کی ہٹک اور توہین پر مبنی مواد Share کرنا سب اسی ذمہ میں آئے گا۔ پہلے اس کی تصدیق ہونی چاہیے، اس کے بعد اگر ضروری ہو تو اس کو پھیلا یا جائے، ورنہ گناہ گار ہوں گے، حدیث شریف میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”**كَفَىٰ بِالْمُتَزَعِّمِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَبَعَ**“

ترجمہ: ”کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سی سنائی بات کو بیان کرے، (صحیح مسلم: 4)، سنن ابو داؤد کی حدیث میں جھوٹا ہونے کی بجائے گناہ گار ہونے کے الفاظ مذکور ہیں، (ابوداؤد: 4992)“

آیت نمبر 8 سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام سب کے سب عدوں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ان کے لیے محبوب بنایا ہے اور ہر درجے کے گناہ کو ان کے لیے قابل نفرت بنادیا ہے اور فرمایا: یہی لوگ ہدایت یافت ہیں۔

آیت نمبر 9

”وَ إِنْ طَّالِبَتُنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوهُ بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَعْثَتُ إِلَهُهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتَلُوا الَّتِي تَبَغَّنَ حَتَّىٰ تَفْقَعَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَآءَتُ فَأَصْلِحُوهُ بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ①“

مشکل الفاظ کے معانی

الغاظ	معانی	الغاظ	معانی
طَائِفَةٌ	دو گروہ، دو جماعتیں، طائفة کی جمع	طَائِفَةٌ	وہ آپس میں لڑپڑے
أَصْلِحُوهُ	صلح کرو	أَصْلِحُوهُ	اگر وہ بغاؤت (زیادتی) کرے
تَبَغَّن	(جو جماعت) بغاؤت کرتی ہے	تَبَغَّن	یہاں تک کہ لوٹ آئے
أَقْسِطُوا	النصاف کرو	أَقْسِطُوا	النصاف کرنے والے واحد ”الْمُقْسِطُ“

ترجمہ: ”اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑپڑیں تو ان کے درمیان صلح کرو، پس اگر ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، سو اگر وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرو اور (صلح کے وقت) انصاف کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند

فرماتا ہے۔
تفسیر و تشریح:

آیت میں باہم قاتل کرنے والے مسلمانوں کے دو گروہوں کو "مومنین" کہا گیا ہے، حالانکہ قاتل گناہ کبیرہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مسلمان فاسق و فاجر اور قابل ملامت تو ہوتا ہے، مگر دائرۃِ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ یہ اہلِ سنت و جماعت کا مسلسلہ مسلک ہے، جبکہ خوارج کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتكب دائرۃِ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور معتزلہ کے نزدیک یہ ایمان اور کفر کے مابین ایک درجہ ہے۔

آیت میں مذکور جن دو متصادم گروہوں کا ذکر ہے، اگر وہ کسی اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے حکومت سے نہیں بلکہ باہم بسر پیکار ہوں، تو آیت کی رو سے اس وقت تک مظلوم گروہ کا ساتھ دیا جائے گا، جب تک زیادتی کرنے والا گروہ اپنی زیادتی سے بازنہ آجائے، اگر وہ باز آجائے تو تعصیب اور نفسانیت سے بالاتر ہو کر ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرائی جائے گی۔

اگر کوئی گروہ اسلامی حکومت سے متصادم ہے، مگر بظاہر تعداد اور وسائل کے اعتبار سے وہ اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ انہیں حکومت کے مقابل قرار دیا جائے تو یہ سمجھا جائے گا کہ ان کا مقصد محض لوث مارا اور قتل و غارت گری ہے، لہذا ان لوگوں کے ساتھ باغیوں کا سنا نہیں، بلکہ عام مجرموں ایسا برتاب کیا جائے گا۔

اگر ان کی جمیعت اور قوت اتنی ہے کہ وہ منظم حکومت سے محاذ آرائی کر سکتے ہیں، لیکن ان کا موقف ناحق یا کسی غلط فہمی پر بنی ہے تو اولاً انہیں تفهم کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی جائے، پس اگر وہ اپنی روشن سے باز آجائیں تو ان سے کوئی تعریض نہ کیا جائے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو سمجھانے اور قاتل کرنے کے لیے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا اور بعد میں خود بھی ان سے مکالمہ فرمایا، اس کے نتیجے میں کافی تعداد میں خوارج نے رجوع کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آملا۔

اگر وہ تفہیم اور دلائل سے قائل نہ ہوں اور اپنی غلط روشنی اور بغاوت پر قائم رہیں تو پھر ان سے اس وقت تک قتال کیا جائے کہ وہ ہتھیار ڈال دیں، پس جب وہ ہتھیار ڈال دیں یا مکمل طور پر شکست کھا جائیں تو پھر ان کے ساتھ بعض احادیث کے مطابق اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کی روشنی میں حسب ذیل سلوک کیا جائے گا:

(الف) باغیوں کا مال، مال غیرہ متصر نہیں ہوگا، البتہ زمانہ جنگ میں ان کا سلحہ یاد گیر سامان ضرورت کام میں لایا جاسکتا ہے۔

(ب) ان کے زخمیوں اور قیدیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا، شکست کھا کر بھاگنے والے کا تعاقب نہیں کیا جائے گا۔

(ج) ان میں سے جو امان طلب کرے گا، اُسے امان دیا جائے گا۔

اگر خلیفہ یا حاکم علائیہ طور پر فسق و فجور پر کاربند ہو، اللہ اور اُس کے رسول کی مقررہ حدود سے تجاوز کر رہا ہو اور باعی گروہ اصلاح کا داعی ہو تو اُس صورت میں فقہا میں اختلاف ہے اور حسب ذیل آراء منقول ہیں:

(الف) امام اعظم ابوحنیفہ اور بعض دیگر ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ ایسے حاکم کے خلاف صالح گروہ سے تعاون کرنا چاہیے تاکہ ظالم اور فاسق کو منداقدار سے ہٹا جاسکے۔

(ب) اکثر فقہاء اور محدثین کی رائے یہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک بار خلیفہ بن جائے اور اس کا اقتدار قائم ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت جائز نہیں ہے، کیونکہ اس سے فساد کا اندیشہ ہے، (بدائع الصنائع، ج: 7، ص: 140)۔

آیت نمبر 10

”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْرَجُوا فَاصْلِحُوا بَيْنَ أَخْوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرَحَّمُونَ“

مشکل الفاظ کے معانی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
إِخْرَجُوا	بَيْنَ أَخْوَيْكُمْ	بَيْنَ	(أخم کی جمع) بھائی

ترجمہ: "مون تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، اپنے دو بھائیوں کے مابین صلح کراؤ اور اللہ سے ذرتے رہا کرتا کہ تم پر حرم کیا جائے، (ال مجرات: 10)"۔

تفسیر و تشریح:

اس آیت میں مسلمانوں کے باہمی تعلق کو واضح کیا گیا ہے کہ مونوں کا باہمی رشتہ اخوت ایمانی و اسلامی پر قائم ہے اور اس کے مقابلے میں تمام رشته یعنی ہیں۔ انسان کا باہمی رشتہ اور تعلق کئی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، مثلاً: نسب، رنگ و نسل، زبان، وطن اور عقیدہ و مذہب وغیرہ۔ اسلام درجہ بدرجہ ان تمام رشتہوں کی حقیقت و اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اسلام میں مسلمانوں کے مابین سب سے مستحکم رشتہ دین و ایمان کا ہے، مثلاً: وطن کی محبت مسلم امر ہے، کیونکہ یہ ایک ایسی پناہ گاہ ہوتی ہے جہاں کوئی قوم اپنے دین و ایمان، جان و مال اور عزتِ نفس اور خودی و خودداری کو محفوظ تصور کرتی ہے اور وطن کی سرحدیں ایک طرح کی فصیل کا کام دیتی ہیں، ان کے اندر امن و امان اور اطمینان کی فضاظاً قائم ہوتی ہے، اسی لیے وطن کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کی خاطر قوم کا ہر فرد اپنا تن من وطن سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان سرحدوں کے اندر انسان کو مادی لحاظ سے وہ سب کچھ میسر ہو جس کی وجہ تک رسکتا ہے، مگر اس کا نظریہ حیات، عقیدہ و ایمان اور دین محفوظ نہ ہو، تو پھر وطن کا القدس اس کی نظروں سے گرجاتا ہے اور بسا اوقات وطن کی محبت کو دین پر قربان کرتے ہوئے بھرت پر مجبور ہو جاتا ہے، اسلامی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن اگر دین و ایمان کی اقدار کو پامال ہوتا دیکھ کر پھر بھی کوئی نام نہاد مسلمان وطن کی تقدیس کا دم بھرتا ہے، تو بقول علامہ اقبال یہی کہا جاسکتا ہے:

ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیر ہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

ای طرح دینی رشتہ اخوت کے مقابلے میں نسلی نسبتی قرابتیں اور علاقائی وطنی رشته یعنی ہیں، بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ان سب رشتہوں اور حرمتوں کی تقدیس کو دین کی تقدیس پر قربان کر دینا چاہیے، علامہ اقبال نے کہا ہے:

بیانِ رنگ و خون کو توز کر ملت میں گم ہو جا
نہ تو رانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
دینی اخوت کا رشتہ کسی قسم کی علاقائی اور جغرافیائی سرحدوں اور رنگ و نسل کی حدود
تیود کا پابند بھی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک ابدی، دائمی، عالمگیر، ہے گیر اور آفاقی رشتہ ہے، علامہ
جامعہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

بندہ عشق شدی ترکِ نب کن جائی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

دینی اخوت کی اہمیت کو رسول اللہ ﷺ نے ان احادیث میں بیان فرمایا
ہے، حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
”مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِهِمْ وَتَرَاхِيمْ وَتَعَاوُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ، إِذَا اشْتَكَ مِنْهُ عَفْنُ
تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُشْنِ“۔

ترجمہ: ”ایک دوسرے سے محبت کرنے، ایک دوسرے پر رحم کرنے، ایک دوسرے پر
شفقت کرنے میں مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی ہے کہ جب اس کے ایک عضو کو کوئی
تکلیف ہو جائے تو سارا جسم بخار اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے، (صحیح مسلم: 2586)۔
ملت اسلامیہ کا ہر فرد اپنی جگہ اہم ہے اور ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہے،

حضرت ابو موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
”الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبَنِيَانِ يَشُدُّ بَعْضَهُ بَعْضًا“۔

ترجمہ: ”ایک مون کے دیوار کی مانند ہے، جس کی ہر ایٹھ دوسری
ایٹھ کے لیے تقویت کا باعث ہوتی ہے، (صحیح مسلم: 2585)۔

علامہ اقبال نے کہا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے مرت کے مقدر کا ستارہ

نے فرمایا:

”**الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يُظْلِمُهُ وَلَا يُخْدِلُهُ**“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”**الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يُظْلِمُهُ وَلَا يُخْدِلُهُ**“ ترجمہ: ”ایک مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار دو گارچھوڑتا ہے، (صحیح مسلم: 2564)۔“

آیت نمبر 11-12

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخِرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا يَسْأَءُ قَوْمٌ مِّنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُونُنَّ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا تَلْهِي زَوْجًا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنْهَا بِزَوْجًا لِّإِلْقَابٍ بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يَتَبَّعْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ⑤ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِجْتَنِبُوا كُثُرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَعْتَبِرُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا إِيَّاهُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهُتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَابٌ رَّحِيمٌ ⑥“

مشکل الفاظ کے معانی

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
قریب ہے / ممکن ہے	لَا يَسْخِرُ	مذاق نہ کرے، ہنسی نہ اڑائے	عَسَى
عیب نہ لگاؤ	لَا تَلْهِي زَوْجًا	عورتیں - واحد امراء	نِسَاء
براء ہے	بِئْسَ	تم ایک دوسرے کو برے	لِإِلْقَابٍ
پیسوں پر ہیز کرو	إِجْتَنِبُوا	تو بہ نہ کرے - تو بہ نہ کی	لَمْ يَتَبَّعْ
تفقیش نہ کرو / کھونج نہ لگاؤ	لَا تَجَسَّسُوا	گمان، شک	ظَنٌ
گوشت	لَحْمٌ	غیبت نہ کرو	لَا يَغْتَبُ
توبہ قبول کرنے والا	تَوَابٌ	تو تم اسے ناپسند کرتے ہو	فَكَرِهُتُمُوهُ
		مردہ (حالت میں)	مَيْتًا

ترجمہ: ”اے ایمان والو! مردوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے

کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو، اور نہ (آپس میں) ایک دوسرے کو بُرے القاب سے بلاو، ایمان لانے کے بعد نافرمان کہلانا کتنا برانام ہے اور جو لوگ (ان برے اعمال سے) توبہ نہ کریں تو وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں اور (دوسرے کے پوشیدہ احوال کا) سراغ نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو، کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، سو یقیناً تم اُس کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا بے حد مہربان ہے، (الحجرات: 11-12)۔

تفسیر و تشریح:

ان دو آیات میں ان اخلاقی خرابیوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے، جن سے اسلامی معاشرے کی یگانگت اور وحدت متاثر ہوتی ہے، افراد کے مابین الفت و محبت کی بجائے نفرت وعداوت کے جذبات پر وان چڑھتے ہیں، وہ اخلاقی امراض یہ ہیں:

- ۱۔ ایک دوسرے کا مذاق اڑانا۔
- ۲۔ ایک دوسرے کی عیب جوئی اور طعن و تشنیع کرنا۔
- ۳۔ ایک دوسرے کو بُرے اور تو ہین آمیز ناموں سے پکارنا۔
- ۴۔ ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی کرنا۔
- ۵۔ ایک دوسرے کے پوشیدہ حالات کو کریدنا، ٹوہ لگانا اور حاسوی کرنا۔
- ۶۔ ایک دوسرے کی غیبت کرنا۔

کی کامڈاں اڑانا اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اس شخص کی میرے دل میں کوئی عزت نہیں ہے، جب آپ کسی کی عزت نہیں کریں گے تو وہ بھی آپ کی عزت نہیں کرے گا۔ اس طرح محبت کی بجائے دشمنی کے جذبات پرداں چڑھنا شروع ہو جاتے ہیں جن کا انجام مفساد ہے، اس لیے اسلام نے سیدِ ذرائع کے طور پر مذاق اڑانے کو منوع قرار دیا تاکہ معاشرے میں باہمی احترام برقرار رہے، کسی کے ظاہری حال کو دیکھ کر اس کا مذاق اڑانا انتہائی پست سوچ کی علامت ہے، شاعر کہتا ہے:

خاکسار ان جہاں را بہ حقارت مہ فگر

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ترجمہ: ”معمولی نظر آنے والے لوگوں کو حقارت سے نہ دیکھو، تمہیں کیا معلوم کہ ان میں کوئی صاحبِ کمال ہو۔“

اسلام میں دوسروں کے عیوب تلاش کرنا، طنز و تعریض اور طعن و تشنیع کرنا، یہ سب امور ناجائز ہیں، قرآن نے ”دوسروں پر عیب نہ لگاؤ“ کی بجائے ”لَا تَنْهِيْرُ وَا أَنْفُسَكُمْ“ (اپنے اوپر عیب نہ لگاؤ) کے کلمات استعمال کر کے نہایت بلیغ انداز بیان اختیار فرمایا ہے، گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ تم جس پر طعن کر رہے ہو وہ کوئی غیر نہیں ہے، تمہاری سوسائٹی کا ایک فرد ہے اور دوم یہ کہ اگر تم دوسرے کی عزت سے کھیلو گے اور اسے اپنی بیہودگی کا نشانہ بناؤ گے تو جب اس کا بس چلے گا، وہ بھی تمہیں سر عام رسوا کرے گا، نیز دوسرے کے عیوب وہی تلاش کرتا ہے جس کی اپنے عیوب پر نظر نہیں ہوتی، بہادر شاہ ظفر نے کہا تھا:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے، دیکھتے اور وہیں کے عیب وہ نہ رہا

پڑی اپنی براں پر جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اسلام میں دوسروں کو تو ہیں آمیز ناموں سے پکارنا بھی منوع ہے، بعض اوقات لوگ کسی شخص کی جسمانی کمزوری یا خاندانی نسبت یا کسی خامی کو پیش نظر رکھ کر اس کے مختلف تو ہیں آمیز نام رکھ لیتے ہیں اور اسے ان ناموں سے پکارتے ہیں، یہ شرعاً منوع ہے خواہ وہ

عیب متعلقہ فرد میں موجود ہو یا نہ ہو، جیسے کسی کو لگڑا، اندھا، کانا یا منافق وغیرہ کہنا۔ البتہ بعض اوقات ایسے نام جن سے بظاہر تو ہیں کا پہلو نکلتا ہے کسی شخص کی پہچان کا ذریعہ بن جاتے ہیں، ایسی صورت میں نیک نیتی سے ان ناموں کا استعمال جائز ہے جیسے سلیمان الاعمش (چندھا)، ابو ہریرہ (بلی والے) وغیرہ۔

آیت میں اگرچہ مطلقاً لفظ ”ظن“، استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی گمان کے ہیں۔ لیکن ”إِنَّ بَعْضَ الظَّنِ إِلَّا“ کہہ کر یہ اشارہ فرمایا کہ اس سے ”ظن سوء“، یعنی بدگمانی مراہد ہے، دراصل ”گمان“ کی متعدد صورتیں ہیں اور ہر ایک کا حکم عیحدہ ہے، فقہی اعتبار سے ”گمان“ کی قسمیں یہ ہیں:

(۱) واجب: اللہ تعالیٰ کے ساتھ خُن ظن رکھنا واجب ہے، حدیث میں ہے:
”لَا يَوْمَ أَحَدُ كُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحِسِّنُ الظَّنَّ بِاللَّهِ“۔

ترجمہ: ”تم میں سے ہر ایک کو اس حال میں موت آئے کہ وہ اللہ کے ساتھ نیگ گمان رکھتا ہو، (ابوداؤد: 3113)، ایک اور حدیث قدی میں ہے:
”أَنَا عِنْدَ ظِنِّ عَبْدِيِّيِّ فَلَيَظُنَّ بِي مَا شَاءَ“۔

ترجمہ: ”میرا بندہ میرے بارے میں، جیسا گمان رکھتا ہے میں اس سے ویسا ہی برداشت کرتا ہوں، اب اس کی اپنی مرضی وہ جیسا چاہے میرے بارے میں گمان رکھے، (متدرک: 7603)۔“

اس سے معلوم ہوا کہ جس نے معاذ اللہ، اللہ کے ساتھ بدگمانی کی تو اس کی نجات ناممکن ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات رَحْمَن، رَحِيم، غَفار، سَتَار، وَدُود اور گَيْرِيْم ہر وقت پیش نظر رہنی چاہیے۔

(۲) مستحب: ہر مومن جس کا ظاہری حال اچھا ہو، اس کے بارے میں نیک گمان رکھنا مستحب ہے۔

(۳) مباح: وہ شخص جس کا حال مشتبہ اور مشکوک ہو، اس کے بارے میں بدگمانی رکھنا مباح ہے، لیکن جب تک قطعی ثبوت نہ ہو، اس کے بارے میں کوئی کارروائی کرنا جائز نہیں ہے اور

نہ اس کے احوال کریڈنے کی ضرورت ہے، حدیث میں ہے: "إذْ ظَفَنَّتُمْ فَلَا تَحْقِفُوا"۔
ترجمہ: "اگر تمہیں کسی کے بارے میں بدگمانی ہو جائے تو اس کی تحقیق میں نہ لگ جاو، (الکامل لابن عدی: ج 4، ص 315)"۔

(۲) حرام: اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ بدگمانی رکھنا حرام ہے، قرآن میں عام مسلمانوں کے بارے میں بدگمانی کرنے سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے تا وقتنکہ کسی کے بارے میں بات پایہ تحقیق تک نہ پہنچ جائے، بلا تحقیق یا کسی دلیل و ثبوت کے بغیر کسی پر الزام تراشی کرنا یا تہمت لگانا بھی اس زمرے میں آتا ہے، حدیث میں ہے:

"إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْبَرُ الْحَدِيثِ"۔

ترجمہ: "بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے، (صحیح مسلم: 2563)"۔
اس سے دلوں میں نفرتیں اور کدوں تیں پیدا ہوتی ہیں۔

اسلام میں دوسروں کے مخفی حالات کو کریڈنا، ذاتی احوال کا سراغ لگانا، تجویز کرنا منوع ہے، اس سے دوسروں کی پردہ دری ہوتی ہے جو بہت بڑا اخلاقی جرم ہے، حدیث میں ہے:

"وَلَا تَتَبَعُوا عَوْرَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ مَنِ اتَّبَعَ عَوْرَاتِهِمْ يَتَبَعُ اللَّهُ عَوْرَاتَهُ، وَمَنِ يَتَبَعِ اللَّهُ عَوْرَاتَهُ يَعْصُمُهُ فِي بَيْتِهِ"۔

ترجمہ: "اور مسلمانوں کی پوشیدہ باتوں کا کھونج نہ لگایا کرو، کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے پوشیدہ احوال کو کریڈنے کے درپے ہوگا، اللہ اس کے عیوب کے درپے ہو جائے گا اور اللہ جس کے راز کھولنے کے درپے ہو جائے، اسے اس کے اپنے ہی گھر میں رسوا کر کے چھوڑتا ہے، (سنن ابو داؤد: 4880)"۔

اس کے برعکس ایک اور حدیث پاک میں ہے:

"وَمَنِ سَتَرَ مُسْلِمَاتِهِ سَتَرَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"۔

ترجمہ: "جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کے عیوب پر پردہ

فرمائے گا، (صحیح مسلم: 2580)۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”إِنَّمَا أَتَبْعَثُ عَوَادَاتٍ إِلَّا أَفْسَدُهُمْ أَوْ كِذْبٌ أَنْ تُفْسِدَهُمْ“۔

ترجمہ: ”اگر تم لوگوں کے عیوب تلاش کرو گے تو تم ان کو خراب کر دو گے، (ابوداؤد: 4888)۔

اسلام ہر فرد کی ذاتی زندگی اور اس کے پوشیدہ احوال کو اہمیت دیتا ہے اور کسی کی
نجی زندگی میں دخل اندازی کو منع کرتا ہے، جب تک کہ اس سے معاشرے یا ملک و ملت کو
کوئی نقصان نہ ہو۔

اسلام میں حکومت کو بھی اس امر کا استحقاق حاصل نہیں ہے کہ وہ بلا سبب لوگوں کی
نجی زندگی اور پوشیدہ امور کو کریڈنے کے لیے جاسوسی کا سلسلہ شروع کر دے، اس سلسلے میں
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بڑا ہی سبق آموز ہے:

آپ ایک رات اپنے معمول کے مطابق مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت لگا رہے
تھے کہ ایک گھر سے آپ کو گانے کی آواز سنائی دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شک گز راء دیوار
پھانڈ کر اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے قریب ایک عورت بیٹھی ہے اور
شراب بھی پاس رکھی ہوئی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غصے کے عالم میں کہا: ”اے اللہ
کے دشمن! تو نے سمجھ رکھا ہے کہ اللہ نا فرمانی کے باوجود تیری پرده پوشی فرمائے گا“، اس نے
جو بنا کہا: اے امیر المؤمنین! عجلت سے کام نہ لیں، اگر میں نے ایک نا فرمانی کی ہے تو آپ
نے تین نافرمانیاں کی ہیں: اللہ نے جاسوسی سے منع فرمایا اور آپ نے میری جاسوسی کی، اللہ
کا فرمان ہے کہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہوا اور آپ دیوار پھانڈ کر آئے، اللہ کا فرمان
ہے کہ گھروں میں بلا اجازت نہ آؤ اور آپ بلا اجازت میرے گھر چلے آئے، آپ نے اس
ٹھنڈ سے گناہ سے رجوع کرنے اور اعادہ نہ کرنے کا وعدہ لیا اور واپس چلے آئے۔

(تفیر روح المعانی، جلد 26، ص: 157، بیروت)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت کو مطلقاً اس قسم کا کوئی اختیار نہیں، اگر کہیں ملکی و
ملکی اور دینی مفاد کا تقاضا ہو تو وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن عام حالات میں اس کی ممانعت ہے۔

زیر بحث آیت میں آخری بات جس کی ممانعت فرمائی گئی ہے، غیبت ہے اور اس فعل کے گھناؤ نے پن کو حسی مثال سے واضح فرمایا کہ یہ اتنا قابل نفرت و کراہت فعل ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا، ایک حدیث پاک میں اسے زنا سے بھی بدتر فعل قرار دیا گیا ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”الْغِيَبَةُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا، قَيْلَ: وَكَيْفَ، قَالَ: إِنَّ الرَّجُلَ يَرْجُمُ ثُمَّ يَتُوبُ، فَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِ، قَدْ صَاحِبَ الْغِيَبَةَ لَا يُغْفَرُ لَهُ حَتَّىٰ يَغْفِرَ لَهُ صَاحِبُهُ“

ترجمہ: ”غیبت زنا سے زیادہ سخت گناہ ہے، صحابی نے عرض کیا: وہ کیسے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول کر لیتا ہے اور غیبت کرنے والے کی اس وقت تک مغفرت نہیں ہوتی، جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت کی ہے، (الْمُعَجَّمُ الْأَوَسط: 6590)۔“

حضور اکرم ﷺ کے سفر معراج کے موقع پر آپ کو عالم غیب کے جو مشاہدات کرائے گئے، اس میں بعض حَسَنَات و سَيِّئَات کی جزا اوسرا کا تمثیلی مشاہدہ بھی تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ بعض لوگوں کے تابے کے ناخن ہیں اور وہ اپنے چہروں اور بدن کا گوشت نوج رہے ہیں، آپ ﷺ کے دریافت فرمانے پر جبریل امین نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائی کی غیبت کرتے تھے اور آبرور یزدی کرتے تھے، غیبت کی تعریف مندرجہ ذیل حدیث میں بیان کی گئی ہے:

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَتَدْرُونَ مَا الْغِيَبَةُ، قَالُوا: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: ذِكْرُكُ أَخَاهُ بِمَا يَكْرَهُ، قَيْلَ: أَفَ أَنْتَ إِنْ كَانَ فِي أَخِي مَا أَقُولُ، قَالَ: إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ، فَقَدِ اغْتَبْتَهُ، قَدْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ فَقَدْ بَهَثْتَهُ“

ترجمہ: ”ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے، انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے بھائی کا ذکر (اس کی غیر موجودگی میں) ایسے کرو جو اسے ناگوار ہو، عرض کیا گیا:

اگر میرے بھائی میں وہ بات موجود ہے جو میں کہہ رہا ہوں، تو اس صورت میں آپ کی رائے کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اس میں وہ بات موجود ہو جو تو نے کہی تو، تو نے اس کی نیت کی اور اگر اس میں وہ بات موجود ہی نہیں، تو تو نے اس پر بہتان باندھا (جو غیبت سے بھی بڑا گناہ ہے)، (صحیح مسلم: 2589)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی کوئی ایسی بات نہ ملتے نہ پر بیان کرنا غیبت کہلاتا ہے کہ اگر وہی بات اس شخص کے سامنے بیان کی جائے تو اسے ناگوارگز رے، غیبت جس طرح زبان سے ہوتی ہے، اسی طرح تحریری طوز پر یا اشارات و کنایات میں بھی ہو سکتی ہے۔

غیبت دھرا گناہ ہے، اس میں بیک وقت اللہ کی نافرمانی بھی ہوتی ہے اور جس انسان کی غیبت کی جا رہی ہے اس کی حق تلفی بھی، اس لیے اگر خدا نخواستہ غیبت جیسے گھناؤ نے بُزم کا ارتکاب کر لیا ہے اور انسان اس پر نادم ہو تو اس کی تلافی اور کفارہ یہ ہے کہ علائیہ طور پر توبہ کرے، جس مجلس میں غیبت کی ہے، اس میں اپنی تکذیب کرے اور جس انسان کی غیبت کی ہے، اگر اسے علم ہو گیا ہو تو اس سے معافی طلب کرے۔ ایک حدیث میں غیبت کا کفارہ یہ بتایا گیا ہے کہ جس کی غیبت کی ہے، اس کے لیے ان کلمات سے استغفار کرے:

”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَلَهُ“ (اے اللہ! مجھے اور اسے بخش دے)۔

ان آیات سے یہ واضح ہوا کہ اسلام میں جس طرح انسانی جان کی حرمت کا پاس رکما گیا ہے، اسی طرح انسانی وقار، عزت و آبرو اور ناموس کا بھی تحفظ کیا گیا ہے، کسی کی بے عذتی اور رسولی کی نہ تو اس کے سامنے اجازت ہے اور نہ اس کے پیشہ پیچھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی پرزا کی تہمت لگائے اور پھر اسے شرعی ضابطے کے مطابق چار گواہوں کے ذریعے عدالت میں ثابت نہ کر سکے، تو اسے ”حد قذف“ کا سزاوار قرار دیا جائے گا،⁸⁰ کوڑے ہے اور اگر ”ہتک عزت“ کا جرم اس سے کمتر ہے تو عدالت اپنی صواب دید کے مطابق تعزیر نافذ کر سکتی ہے۔ البتہ بعض صورتیں ایسی ہیں، جن پر بظاہر غیبت کا اطلاق

ہو سکتا ہے، لیکن وہ حرمت اور ممانعت سے مستثنی ہیں۔ بعض علماء نے غیبت کی ان مبارح

صورتوں کو بیان کیا ہے:

(۱) حاکم، قاضی، عدالت یا ایسے فرد یا ادارے کے سامنے جس سے توقع ہو کہ وہ ظلم کا ازالہ کر سکے گا یا ظالم کا ہاتھ روک سکے گا، مظلوم دادرسی کے لیے اور بطورِ شکایت ظالم کی زیادتیوں کو بیان کر سکتا ہے اور یہ جائز ہے۔

(۲) کسی مسئلے کے بارے میں شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے مفتی کے سامنے صورت مسئلہ کا بیان کرنا جائز ہے۔

(۳) کسی شخص یا شخص کے فق و فجور اور شر سے دوسروں کو محفوظ رکھنے اور محظا طارہ نہ کے لیے حقیقتِ حال بیان کرنا جائز ہے۔

(۴) کسی فرد یا افراد کی بد کرداری کا ذکر کرائیے فرد یا افراد سے کرنا، جن سے توقع ہو کہ وہ ان کی اصلاح کر سکیں گے۔

(۵) کوئی شخص کسی شخص کے کردار و اخلاق کے بارے میں اس لیے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ رشتہ کرنا چاہتا ہے یا کاروبار میں اسے شریک بنانا چاہتا ہے یا کوئی اور معاملہ کرنا چاہتا ہے یا اس کے پاس امانت رکھنا چاہتا ہے، تو ان تمام صورتوں میں انسان کو چاہیے کہ اسے صحیح معلومات فراہم کرے اور دیانت دارانہ رائے سے آگاہ کرے تاکہ خدا نخواستہ وہ دھوکا نہ کھائے۔

آیت نمبر 13

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَرَّةٍ فَأُثْنَيْ وَ جَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَ قَبَاعِيلَ لِتَعَاوُنُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتُشْقِيمُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ“۔

مشکل الفاظ کے معانی

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
الفاظ.	معانی	الفاظ	معانی
منْ ذَرَّةٍ فَأُثْنَيْ	ایک مرد اور ایک عورت سے	خَلَقْنَاكُمْ	ہم نے تمہیں پیدا کیا

پہلنا کنم	ہم نے تمہیں بنایا	شُعُوب	تو میں جماعتیں، قبیلہ کی جمع
تمہائل	قبیلے، قبیلہ کی جمع	لِتَعَارِفُوا	تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو
ائٹھ مکم	تم میں سب سے زیادہ	أَتَقَاءُكُمْ	تم میں سب سے زیادہ پر ہیزگار

ترجمہ: ”اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں تو میں اور قبیلے بنادیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، یقیناً تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پر ہیزگار ہے، بے شک اللہ خوب جانے والا بے حد خبر رکھنے والا ہے، (الحجرات: 13)۔“

تفیر و تشریح:

اسلام ایک عالمگیر دین ہے، اس کی دعوت نوع انسانی کے ہر فرد کے لیے ہے اور اس کے دروازے آدم کے ہر بیٹے اور ہر بیٹی کے لیے کھلے ہیں۔ اسلام میں ذات پات رنگ نسل، زبان وطن یا کسی بنیاد پر کوئی اونچی بیچ نہیں ہے جو انسان کے اپنے دائرہ اختیار میں نہ ہو۔ اسلام میں نسلی و نبی، لسانی وطنی یا رنگ و روپ کی بنیاد پر تفاخر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ آیت نسل انسانی کے ہر فرد کو یہ یاد دلا رہی ہے کہ تمہاری اصل ایک ہے، تمہارا مادہ تخلیق ایک ہے، اس لیے ان میں سے کوئی چیز بھی وجہ امتیاز نہیں ہے۔

اس آیت کا سببِ نزول یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر حضرت بلاں جبشی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دو۔ انہوں نے حکم کی قبول کی، یہ منظر دیکھ کر قریش مکہ پر کوہ غم ٹوٹ پڑا، کیونکہ نسلی و لسانی تفاخر اور احساسِ برتری ان کے رنگ و پے میں رچا بسا تھا، وہ اسے کیسے بے آسانی برداشت کر سکتے تھے، چنانچہ عقبہ، حارث، سہیل اور ابوسفیان اپنے جذبات کو ضبط نہ کر سکے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ امیت نازل فرمائکر ان کے بیان رنگ و خون اور زبان وطن کو پاش کر دیا اور واضح فرمادیا کہ جو اسلام کی آغوش میں آنا چاہتا ہے، اسے ان تمام عصیتوں کو ترک کرنا پڑے گا،

کیونکہ اسلام میں اعزاز و اکرام اور فضیلت و مکال کا معیار و مدار ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے اللہ کا تقویٰ۔ انسانی برادری کو قوموں، قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم کرنے میں اللہ کی حکمت ضرور ہے اور وہ ہے ایک دوسرے کا تعارف اور جان پہچان، رشتہوں کا قرب و بعد تقسیم و راثت میں معیار قرار پاتا ہے، اس سے زائد کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) "أَمَا بَعْدُ! أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عَيْبَةَ الْجَاهِلِيَّةِ، وَتَعَاذُلُهُمَا بِآبَائِهِمَا، فَإِنَّ النَّاسَ رَجُلَانِ: مُؤْمِنٌ تَقِعُ كَرِيمٌ، وَفَاجِرٌ شَقِيقٌ مَهِينٌ، وَالنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُو آدَمَ وَخَلَقَ اللَّهُ آدَمَ مِنْ تُرَابٍ"۔

ترجمہ: "شکر ہے اس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور تکبر و رکر دیا، لوگو! انسان بس دو ہی طرح کے ہیں: ایک نیک اور متقیٰ جو اللہ کے نزدیک محترم ہیں اور دوسرا بدکار بدجنت جو اللہ کے نزدیک حقیر ہے، ورنہ سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے، (شعب الانیمان: 4767)"۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۲) "يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَانُكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا! لَا فَضْلَ لِعَرَبٍ عَلَى عَجَمٍ وَلَا لِعَجَمٍ عَلَى عَرَبٍ، وَلَا لِأَجْنَبَرٍ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالْتَّقْوَىٰ، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتُّقَاءُكُمْ"۔

ترجمہ: "اے لوگو! سنو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی کا لے کو گورے پر اور نہ کسی گورے کو کا لے پر کوئی برتری حاصل ہے، بس اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقیٰ ہو، (شعب الانیمان: 4774)"۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(۳) "إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عَيْبَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَحْرَهَا بِالْأَبَاءِ، إِنَّ النَّاسَ بَنُو آدَمَ، وَآدَمُ

مِنْ تُرَابٍ، مُؤْمِنٌ تَّقِعُ وَفَاجِرٌ شَقِيقٌ، لَيَسْتَهِمَّ إِنْ أَقْتُواهُ يَفْخَرُونَ بِرِّجَالٍ، إِلَّا هُمْ فَخُمْ مِنْ
نَّحْمٍ جَهَنَّمَ أَوْ لَيْكُونُنَّ أَهْوَانَ عَلَى اللَّهِ مِنَ الْجِعْلَانِ الَّتِي تُدْفَعُ“۔

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا فخر و غرور اور آباؤ اجداد پر فخر ختم کر دیا ہے، تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے تھے، (لوگ دو طرح ہیں): مومن متqi اور نافرمان بدجنت، لوگوں کو چاہیے کہ اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنے سے بازاً جائیں، کیونکہ وہ جہنم کے کوئلوں میں سے کوئلہ ہیں، ورنہ اللہ کے نزدیک وہ گوبر کے کالے کیرڑے سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل ہوں گے، (سنن ترمذی: 5116)۔“

آپ ﷺ کا فرمان ہے: ”اللہ قیامت کے روز تم سے حسب و نسب کے بارے میں نہیں پوچھے گا“، آپ ﷺ نے فرمایا:

(۲) إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُورِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلِكُنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ۔
ترجمہ: ”اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے، (صحیح مسلم: 2564)۔“

(۳) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إِنْ كُنْتُ سَابِقُكُمْ رَجُلًا وَكَانَتْ أُمَّةٌ أَعْجَبَيْتَهُ، فَعَيَّرْتُهُ بِأُمَّهِ، فَشَكَانَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ، فَقَالَ يَا أَبَا ذَرٍ! إِنَّكَ أَمْرُرٌ فِينَكَ جَاهِلِيَّةٌ۔

ترجمہ: ”میں نے ایک شخص کو گالی دی تھی، اس کی ماں بھی تھی، میں نے اس کی ماں کے غیر عربی ہونے کا اسے طعنہ دیا، اس نے میری شکایت رسول اللہ ﷺ سے کر دی، تو آپ نے ﷺ نے فرمایا: ابوذر! تم میں ابھی جاہلیت (کی بوباتی) ہے، (ترمذی: 5157)۔“

حضرت ابوذر کا غیر عربی ہونے کے طعنہ دینے کے رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی باتیات قرار دیا، یعنی اسلام میں رنگ، نسل، قوم، خاندان، پر فخر و مبارکات کی کوئی منجاشش نہیں، یہ سارے اعمال جاہلیت کی نشانیاں ہیں، دنیا میں وعظیم جنگوں کا سبب بھی یہی نسلی تنافر میں، جس میں کروڑوں لوگ لقہ اجل بنے، اسلام برتری کا معیار ذاتی صلاحیت اور تقویٰ کو قرار

دیتا ہے۔ اس کے باوجود اس جدید اور متعدد دور میں ایسے ممالک اور اقوام موجود ہیں، جہاں ذات پات اور رنگ و نسل کی بنیاد پر اونچ نیچ موجود ہے، اس کی واضح مثال ہندوستان میں ذات پات کا نظام ہے، جسے ہندو مذہب کا تحفظ حاصل ہے، افریقہ اور امریکہ میں کالے مکورے کی تیز روا رکھی جاتی ہے، یہ تمام چیزیں انسانیت کے لیے باعث شرم ہیں۔

آیت نمبر 14

” قَالَتِ الْأَغْرَابُ إِمَّاٰ ” قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَ لِكُنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَ لَهَا يَدْخُلُ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَ إِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَ رَسُولَهُ لَا يَلِتُكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ⑤ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَ رَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَ جَهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفَسُهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ⑥ قُلْ أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ وَ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ ۖ وَ اللَّهُ يَعْلَمُ شَيْءًا عَلَيْهِمْ ⑦ يَعْلَمُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمْوَا ۖ قُلْ لَا تَنْهَنُوا عَنِ إِسْلَامِكُمْ ۖ بَلِ اللَّهُ يَعْلَمُ عَلَيْكُمْ أَنْ هَذِهِكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ ⑧ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ ۖ وَ اللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ⑨ ”

مشکل الفاظ کے معانی

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
أَغْرَابُ	بدو، دیہاتی، گوار	آمَّا	تم ایمان لائے
لَمْ تُؤْمِنُوا	تم ایمان نہیں لائے	لَهَا يَدْخُلُ	ابھی تک داخل نہیں ہوا
إِنْ تُطِيعُوا	اگر تم اطاعت کرو	لَا يَلِتُكُمْ	وہ (تمہارے اعمال میں) کی نہیں کرے گا
لَمْ يَرْتَابُوا	انہوں نے تھک نہیں کیا	جَهَدُوا	انہوں نے جہاد کیا
أَسْلَمْنَا	ہم اسلام لائے، ہم نے مانا	أَتَعْلَمُونَ	کیا تم جاتے ہو

بِصَدْرٍ	دِيْكَنْهُ وَالا، باطِنْ پُر نظر رکنْهُ وَالا	لَا تَمْسِحُ عَلَى	وَهَا حَسَانٌ جَاتَتِ هِنْ	يَسْعُونَ
جَوْ كَچْ تَمْ كَرْتَهُ هُو	پَهَا تَعْمَلُونَ	لَا تَمْسِحُ عَلَى	مَحْضَرًا حَسَانَهُ جَتَّهُ	مَحْضَرًا حَسَانَهُ جَتَّهُ

ترجمہ: ”دیہاتیوں نے کہا: ”ہم ایمان لائے، آپ کہہ دیجیے: ”تم ایمان نہیں لائے“ بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کی اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہارے اعمال میں کوئی کمی نہیں کرے گا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ درحقیقت مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر اس میں کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، وہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں، (ایمان کے ان دعویداروں سے) کہہ دیجیے: کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کو بے حد جانے والا ہے۔ یہ آپ پر اپنے اسلام لانے کا احسان جاتے ہیں، (آپ) کہہ دیجیے: مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتا، بلکہ اللہ تم پر احسان فرماتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان لانے کی ہدایت عطا فرمائی، اگر تم (اپنے دعواۓ ایمان میں) سچے ہو، یقیناً اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر غیر کو جانتا ہے اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو تم کر رہے ہو، (الحجراۃ: 14 تا 18)۔

تفسیر و تشریح:

آیت: 14 میں بعض دیہاتی عرب قبائل عرب کا ذکر ہے، جن میں بطور خاص بنو اسد کا نام نمایاں ہے کہ وہ ایک بارقط کے زمانے میں نبی ﷺ کے پاس آئے اور ایمان و اسلام کا احسان جتنا لگے کہ ہمیں ہمارا حق دے دیجیے، ہماری ضرورتیں پوری کیجیے، ہم دوسرے قبائل کے برکس بغیر جنگ و جدال کے آپ پر ایمان لائے ہیں۔ اسی طرح اور متعدد قبائل مثلاً مژینہ، اسلم، اشیع وغیرہ کے لوگ بھی دنیاوی مفادات کی خاطر یا تعزیر و عتاب سے بچنے کے لیے اسلام کے غلبے کے خوف سے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی حقیقت سے پر وہ اٹھایا اور بتایا کہ ایمان کی

حقیقت کیا ہے، سچا اور کامل مومن کون ہے اور ایمان کے تقاضے کیا ہیں اور ایمان لا کر کوئی اللہ اور اس کے رسول پر احسان نہیں کرتا، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اسے ایمان وہ دایت کی توفیق عطا فرمائی اور یہ کہ کوئی لا کھ اپنی اندر ونی کیفیات، قلبی واردات اور خبیث باطن کو چھپانے کی کوشش کرے، اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

”قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَ لِكُنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا“، (ترجمہ: ”کہہ دیجیے: تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کر لی)، کے الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ غلط مفہوم اخذ کیا ہے کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کر لی، میں ایمان اور اسلام دو متصاد اصطلاحات (Terms) کو قرآنی (Terminology) میں ایمان اور اسلام دو متصاد اصطلاحات (Terms) یعنی یہ کہ ایمان کے معنی قلبی طور پا مانا اور اسلام کے معنی محض ظاہری طور پر تسلیم کرنا، اس طرح بعض صورتوں میں لفظ اسلام اور مسلم نفاق اور منافقت کے قریب المعنی ہو جاتا ہے، یہ بات سراسر غلط ہے۔ قرآن و حدیث میں ایمان اور اسلام دو ہم معنی الفاظ و اصطلاحات ہیں اور ایک کا دوسرا پر ہر جگہ مکمل طور پر اطلاق ہوتا ہے، اکثر مقامات پر ایمان اور اسلام دونوں ہم معنی استعمال ہوتے ہیں، ایمان بول کر اسلام بول کر ایمان مراد لیا جاتا ہے، ہم ذیل میں ایمان اور اسلام کی تعریف ذکر کرتے ہیں:

ایمان کی تعریف:

علامہ جرج جانی ایمان کی لغوی اور شرعی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”الإِيمَانُ فِي الْلُّغَةِ: الْتَّصْدِيقُ بِالْقُلْبِ، وَ فِي الشَّرْعِ: هُوَ الْإِعْتِقادُ بِالْقُلْبِ وَ الْأَقْرَارُ بِاللِّسَانِ، وَ قِيلَ: مَنْ شَهِدَ وَعِمَلَ وَلَمْ يَعْتَقِدْ فَهُوَ مُنَافِقٌ، وَ مَنْ شَهِدَ وَلَمْ يَعْمَلْ وَاعْتَقَدْ فَهُوَ فَاسِقٌ، وَ مَنْ أَخْلَى بِالشَّهَادَةِ فَهُوَ كَافِرٌ“۔

ترجمہ: ”لغت میں ایمان دل کی تصدیق کو کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں دل کے اعتقاد اور زبان کے اقرار کو کہتے ہیں، کہا گیا ہے: جوزبان سے گواہی دے اور عمل بھی کرے لیکن دل سے اعتقاد نہ رکھے تو وہ منافق ہے اور جوزبان سے اقرار کرے اور دل سے تصدیق کرے، لیکن عمل نہ کرے تو وہ فاسق ہے اور جوزبان سے گواہی بھی چھوڑ دے، تو وہ کافر

ہے، (الشَّعْرِيَّفَاتُ بَابُ الْأَلْفِ، ص: 40)۔

یعنی ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل سے اس کی تصدیق کرنے کا نام ہے
منافق زبان سے اقرار تو کرتا ہے، لیکن دل سے تصدیق نہیں کرتا، ہاں! وہ ظاہراً لوگوں
کو دکھانے کے لیے عمل کرتا رہتا ہے، فاسق زبان سے اقرار بھی کرتا ہے اور دل سے تصدیق
بھی کرتا ہے، لیکن عمل نہیں کرتا اور کافر نہ زبان سے اقرار کرتا ہے اور نہ دل سے تصدیق کرتا
ہے، بلکہ وہ دل اور زبان دونوں سے انکار کرتا ہے۔

اسلام کی تعریف:

”الإِسْلَامُ: الْخُضُوعُ وَالإِنْقِيَادُ لِمَا أَخْبَرَ بِهِ الرَّسُولُ ﷺ“

ترجمہ: ”اسلام کا معنی ہے: جس چیز کی رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے، اس کی فرماداری
اور تابعداری کرنا“، یعنی ایمان میں جن چیزوں کا اقرار ہوتا ہے، عمل اس کی تابع داری اور
فرمان برداری کرنے کا نام اسلام ہے اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

علامہ نسفی فرماتے ہیں: ”الإِيمَانُ وَالإِسْلَامُ وَاحِدٌ“۔ ترجمہ: ”ایمان اور اسلام (معنی کے
لحاظ سے) ایک ہیں، (شرح عقائد الحنفی: ص: 316، مکتبۃ البشیری)، یعنی ہر مومن

مسلمان ہے اور ہر مسلمان مومن ہے، اس لیے ایک صاحب نظر عالم نے کہا تھا:
”الإِيمَانُ وَالإِسْلَامُ إِذَا اخْتَلَفَا إِتَّحَدَتَا وَإِذَا اتَّحَدَتَا اخْتَلَفَ“، یعنی جب ایمان اور

اسلام جداً جداً استعمال ہوں تو دونوں کے معنی ایک ہوتے ہیں، ایمان اسلام اور اسلام ایمان
کے معنی کو شامل ہوتا ہے، ہاں! جب کہیں ایک جگہ استعمال ہوں تو ان میں معنوی فرق ہوتا

ہے جیسے الجہرات: 14 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”أَعْرَابٌ نَّزَّلَهُمْ بِهِمْ أَيْمَانًا لَا يَنْتَهُ، (أَيْ رَسُولٌ)! آپ کہیے: تم (ابھی) ایمان نہیں لائے
بلکہ یہ کہو: ہم نے اطاعت کی اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا، اگر تم اللہ اور
اللّٰہ کے رسول کی اطاعت کرو گئے تو وہ تمہارے اعمال (کے اجر) میں کوئی کمی نہیں فرمائے گا،
بِسْمِ اللّٰہِ مُبْتَدِعٌ بِخُشْنَةٍ وَالاَنْهَايَتْ مُهْرِيَانٌ هے۔“

الغرض اعراب اور بادیہ نشینوں کو ایمان کی پختگی کے لیے تربیت کی ضرورت ہوتی تھی اور آزمائش کی کسوٹی سے گزرنا ہوتا تھا، نہیں کہ بے سوچے سمجھے ایک تحریک میں شامل ہو گئے اور چھان پھنک کے مرحلے سے گزرے ہی نہیں، چنانچہ آیت: 15 میں ایمان کامل اور ایمان صادق کی پوری تشریح کرتے ہوئے فرمایا: ”درحقیقت (کامل) مومن تو وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر (کبھی) شک میں بتلانہ ہوئے اور (وقت آنے پر) اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہی وہ لوگ ہیں (جود عوائے ایمان میں) سچے ہیں اور قرآن کی متعدد آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً:

(۱) ”إِنَّ الِّذِينَ عَنْدَ اللَّهِ إِلَّا سَلَامٌ“۔

ترجمہ: ” بلاشبہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، (آل عمران: 19)۔

(۲) ”مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَ لَا نَصَارَائِيًّا وَ لَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ“۔

ترجمہ: ”ابراهیم! نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ تمام ادیان باطلہ سے ہٹ کر دین اسلام پر کار بند تھے، (آل عمران: 67)۔

(۳) ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقًّا تُفْتَهُهُ وَلَا تَهُونُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ“۔

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کتم مسلم ہو، (آل عمران: 102)۔

مختصر آیہ کہا جاسکتا ہے کہ زیر بحث آیت میں لفظ ”أَسْلَمَنَا“ اپنے جامع اصطلاحی معنی میں مستعمل نہیں ہے، بلکہ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، قرآن و حدیث اور دوسرے مقامات پر اس کا اطلاق درست نہیں ہے۔

حدیث و سنت

تعريف حدیث:

حدیث اس علم کو کہتے ہیں جس سے حضور ﷺ کے اقوال، افعال، احوال (جس میں حضور کی تقریرات بھی شامل ہیں) اور اوصاف کی معرفت حاصل ہو، اس علم کا موضوع خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسة ہے۔

علامہ علی بن سلطان القاری لکھتے ہیں:

”لَقْلُ مَا صَدَرَ وَظَهَرَ عَنِ النَّبِيِّ قَوْلًا وَفِعْلًا وَتَقْرِيرًا أَوْ صُفَاقًا خُلْقِيًّا أَوْ نَعْتَاقًا خُلْقِيًّا۔“

ترجمہ: ”نبی ﷺ سے جو اقوال صادر ہوئے یا جن افعال اور تقریرات کا آپ سے ظہور ہوا یا جو آپ کے پیدائشی اوصاف ہیں یا جو اختیاری اوصاف و کمالات ہیں، ان تمام امور کے نقل کرنے اور انہیں بیان کرنے کو حدیث کہتے ہیں، اس تعریف کی رو سے حدیث کا اطلاق درج ذیل پر ہوتا ہے:

حدیث قولی: آپ ﷺ نے کسی چیز کا حکم دیا ہو یا کسی چیز سے منع کیا ہو، اس کا بیان کرنا۔

حدیث فعلی: آپ ﷺ نے کوئی کام کیا ہوا اور راوی نے اس کا بیان کیا ہو۔

حدیث تقریری: آپ ﷺ کے سامنے کوئی کام ہوا ہوا اور آپ نے منع نہیں فرمایا ہو، بلکہ خاموش رہ کر اس کام کو مقرر رکھا ہو۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کے پیدائشی اوصاف یا اختیاری اوصاف اور کمالات کا راوی نے بیان کیا ہو، ان سب پر حدیث کا اطلاق ہوتا ہے۔

سنت کا مفہوم:

سنت کا لغوی معنی ہیں: ”طریقہ، طبیعت، خصلت اور شریعت“، ایک حدیث میں

یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے:

”مَنْ سَئَلَ فِي الْإِسْلَامِ سُئَّلَ حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرٌ هَا وَأَجْرٌ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهَا، مَنْ غَيْرُ أَنْ يَنْتَقِصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئاً، وَمَنْ سَئَلَ فِي الْإِسْلَامِ سُئَّلَةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُهُمْ“ -

عِمَلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْتَقِصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئاً“ -
ترجمہ: ”جس شخص نے (دین) اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کیا، اُسے خود اپنے عمل کا اجر بھی ملے گا اور بعد میں جو لوگ اس پر عمل پیرا ہوں گے، ان سب کے عمل کا اجر بھی اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس شخص نے (دین) اسلام میں کوئی براطریقہ رائج کیا، اُسے اپنے عمل کا گناہ بھی ملے گا اور بعد میں جو لوگ اس پر عمل پیرا ہوں گے، ان سب کے عمل کا گناہ بھی اور ان کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، (صحیح مسلم: 1017)۔“

اصطلاحِ محدثین میں سنت اور حدیث ہم معنی اور متراff اصطلاحات ہیں، لیکن اصطلاحِ شریعت میں سنت سے مراد بنی کریم ﷺ کا طرزِ عمل اور آپ سے ثابت شدہ طریقہ ہے، جو آپ نے امت کی رہنمائی کے لیے اختیار فرمایا، اس سے سیرت کے وہ پہلو مستثنی ہوں گے جو خصائص نبوت کھلاتے ہیں اور امت کے لیے واجب الاطاعت نہیں ہیں۔ گویا نبی ﷺ کی 23 سالہ نبوی زندگی کے شب و روز، گفت و شنید، نشست و برخاست، چال ڈھال، افعال، اقوال، احوال اور صفات کو اگر ایک جامع لفظ میں سوودیا جائے تو اسے ”سنت“ کہا جائے گا۔

علامہ عبداللہ العمادی لکھتے ہیں: شریعت میں جہاں کہیں سنت کا اطلاق ہوا ہے وہاں اس سے مندرجہ ذیل امور مراد لیتے ہیں:

(الف): رسول اللہ ﷺ نے جس فعل کا حکم دیا ہو

(ب): رسول اللہ ﷺ نے جس فعل سے روکا ہو

(ج): رسول اللہ ﷺ نے کسی چیز کو مندوب اور مستحسن سمجھ کر اس کی جانب توجہ دلائی ہو، خواہ زبان مبارک سے فرمایا ہو یا خود کر کے دکھایا ہو اور یہ سب اس حال میں ہو کہ کتاب اللہ اس سے خاموش ہو۔

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی مخصوص غرض اور مقصد کے لیے آپ نے کوئی کام کیا ہو، لیکن اس مقصد کے پورا ہونے کے باوجود وہ فعل بحال رہا ہوا اور اس کی اتباع ہوتی رہی ہو، مثلاً: حالت سفر میں دشمنانِ خدا کے خوف کی وجہ سے نماز میں قصر کرنا مشروع کیا گیا تھا، مگر اس خوف کے نہ ہونے کے باوجود یہ حکم باقی رہا، اسی طرح دورانِ طواف "رمل" مشرکین کو قوتِ دکھانے کے لیے مشروع ہوا تھا، پھر یہ سبب ختم ہوا، لیکن رسول اللہ ﷺ کے اس عمل کی اتباع کرتے ہوئے لوگ اب بھی رمل کرتے ہیں۔

(مقدمہ تاریخِ حدیث: ص: 8)

ضرورتِ حدیث:

اللہ کی طرف سے عطا کردہ سب سے زیادہ مستند، مستحکم اور معبر ضابطہ احکام قرآن مجید ہے، لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسانی عبادات، معاملات، معیشت، معاشرت، فرداور ریاست سے متعلق احکام اور اصول و مبادی اجمالاً بیان فرمائے ہیں، جن کی تعبیر و تشریع (Interpretation) احادیث نبویہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح احکام کی عملی صورت بیان کرنے کے لیے اسوہ رسول کی ضرورت ہے، احادیث رسول ہمیں قرآنی الفاظ کے مطالب و مفہومیں اور قرآنی احکام کی عملی تصویر مہیا کرتی ہیں۔ اسی طرح صلوٰۃ، تیمّم، زکوٰۃ، حج اور عمرہ وغیرہ اصطلاحات قرآنی محض الفاظ ہیں، لغت عربی سے ان الفاظ کے وہ معانی معلوم نہیں ہو سکتے جو شرع میں مطلوب و مراد ہیں، لہذا احادیث رسول کے علاوہ ہمارے پاس قرآن کریم کے شرعی معانی و مطالب متعین کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

حجتِ حدیث:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے نبی ﷺ کے اقوال و افعال کی پیروی کو

لازمی قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا:

(۱) "أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ" -

ترجمہ: ”اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، (آل عمران: 32)“ -

(۲) ”وَمَا أَشْكُمُ الرَّسُولَ فَخُذُوهُ وَمَا نَهِّكُمْ عَنْهُ فَاتَّهُوا“ -

ترجمہ: ”اور رسول تم کو جو (احکام) دیں، اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں، اس سے رُک جاؤ، (الحشر: 7)“ -

(۳) ”قُلْ إِنَّمَا تُنذِّرُ مَنْ يَجِدُونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي“ -

ترجمہ: ”آپ کہیے! اگر تم اللہ سے محبت کے دعوے دار ہو تو میری پیروی کرو۔“ -

(آل عمران: 31)

(۴) ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ -

ترجمہ: ”بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی زندگی) میں تمہارے لیے نہایت عمدہ نمونہ ہے، (الاحزاب: 21)“ -

ان آیات مبارکہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت اور آپ کے افعال کا اتباع قیامت تک کے تمام مسلمانوں پر واجب ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو برا اور راست اور بالمشافہ آپ سے اکتساب فیض کرتے تھے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد نبوت و صحابہ کے بعد آنے والے اسوہ رسول کی اقتداء کیسے کریں گے اور کیسے اپنی زندگی کو اسوہ رسول کے سانچے میں ڈھالیں گے، جبکہ ان کے لیے احادیث مبارکہ سے اکتساب فیض کے علاوہ اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست استفادے کی کوئی صورت ممکن نہیں، پس ثابت ہوا کہ جس طرح اصحاب رسول کے لیے ذاتِ رسول بہ نفس نیس سرچشمہ ہدایت تھی، اسی طرح ہمارے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی سرچشمہ ہدایت ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی رشد و ہدایت کے لیے صرف قرآن ہی کو کافی قرار نہیں دیا، بلکہ تعلیمات قرآنی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت اور آپ کے افعال کی اتباع کو بھی لازم قرار دیا ہے اور آپ کے اقوال و افعال کو جاننے کا واحد ذریعہ

احادیث ہیں، اس لیے اگر احادیث کو جنت نہ مانا جائے تو قرآن کی ہدایت ناکمل رہے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا اور توضیح و تشریع اور تعبیر کا فریضہ نبی ﷺ کے پرد فرمایا، ارشاد باری ہے:

(۵) ”وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ كُرْتَشِبِينَ لِلنَّاسِ مَأْمُرٌ كَإِلَيْهِمْ“ -

ترجمہ: ”اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن مجید) اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ ان کی طرف کیا احکام نازل کیے گئے ہیں، (النحل: 44)۔“

(۶) ”وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَبَ وَالْحِكْمَةَ“ -

ترجمہ: ”اور (رسول) ان (مسلمانوں) کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، (البقرہ: 129)۔“ اور یہی نہیں کہ یہ تعلیم صرف صحابہ کرام کے لیے تھی، بلکہ قرآن نے اسے عہدِ صحابہ کے بعد قیامت تک آنے والوں کے لیے عام قرار دیا، چنانچہ فرمایا:

(۷) ”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَّاتِ رَأْسُوْلًا لِّمَنْ هُمْ يَتَّلَقَّبُونَ عَلَيْهِمْ أَيْتَهُمْ وَيُرِيَّهُمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۚ ۖ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَهَا يَلْحُقُو اِلَيْهِمْ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۗ“

ترجمہ: ”وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے (عظمی) رسول بھیجا، جوان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کے باطن کو صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے اور ان میں سے دوسروں کو بھی جوابی جان پہلوں سے نہیں ملے اور وہ بہت غالب، بے حد حکمت والا ہے، (الجمعة: 3-2)۔“

آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول ﷺ نے قرآن کی جو تعلیم دی، وہ صحابہ کرام کے لیے بھی تھی اور بعد والوں کے لیے بھی۔ اب اگر احادیث کو مستند و معتبر تسلیم نہ کیا جائے تو بعد والوں کے پاس کتاب الہی کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم اور تزکیہ کا اور کونسا ذریعہ باقی رہ جاتا ہے۔

ذراغور فرمائے! قرآن میں سو کے قریب مقامات پر مختلف انداز سے "الصلوة" یعنی نماز کا حکم ہے، لیکن نماز کے اوقات کی تعداد کی تصریح، اوقات کی تحدید و تعین، رکعت کی تعداد، اركانِ نماز کی تفصیل اور نماز کی ادائیگی کا مفصل طریقہ قرآن میں کہیں بھی مذکور نہیں ہے۔ اسی طرح حج کی فرضیت کا حکم تو قرآن میں ہے، لیکن اركانِ حج، مناسکِ حج، طریقہ حج قرآن میں اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ مذکور نہیں ہے، علی ہذا القیاس زکوٰۃ کا حکم تو بڑی شدودہ اور اہتمام کے ساتھ بار بار قرآن میں آیا ہے، لیکن زکوٰۃ کا نصاب، زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط، شریح زکوٰۃ کی تفصیل قرآن میں بیان نہیں فرمائی گئی۔ ان عبادات اور دیگر تمام احکامِ قرآنی کی تفصیلات و جزئیات اور ادائیگی کا طریقہ ہمیں سنت مصطفیٰ اور احادیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمْ أَصْلِيْ"۔

ترجمہ: "اس طرح نماز پڑھو، جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔"

(صحیح البخاری: 7246)

(۲) "خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكُكُمْ"، ترجمہ: "مجھے اپنے مناسک حج یکھلو۔"

(سنن نبأی: 3062)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر حدیث کو قرآن سے الگ تھلک کر دیا جائے اور اسے صحیت شرعیہ تسلیم نہ کیا جائے تو خود قرآن اور احکام قرآن پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح معانی قرآن کو بیان فرمانے والے اور معلم ہیں، اسی طرح

آپ بعض احکام کے شارع بھی ہیں اور آپ کی اس حیثیت کا ذکر خود قرآن نے فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"يُحَلُّ لِهِمُ الظَّلَبِتُ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْعَبِيْتُ"۔

ترجمہ: "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے پاک چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو حرام کرتے ہیں، (الاعراف: 157)"۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیثیت اللہ کی جانب سے ایک با اختیار شارع (Authorized Law Giver) کی ہے، آپ کو اللہ کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہے کہ آپ اللہ کے عطا فرمائے ہوئے علم کا۔ دوسری میں اشیاء کو حلال و حرام قرار دے سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول ﷺ نے حلال قرار دیں گے، وہ طیب ہو گی اور جسے حرام قرار دیں گے، وہ خبیث اور ناپاک ہو گی۔

مثال کے طور پر حضور ﷺ نے بعض اشیاء کو حرام قرار دیا، جن کا قرآن میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے اور ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

”شکاری درندے اور پرندے، دراز گوش اور حشرات الارض وغيرها۔“

ہمارے لیے ان کا علم صرف حدیث سے ممکن ہے اور اگر حدیث کو جحت نہ مانا جائے تو حلقت و حرمت کے لیے شریعت اسلامیہ نا تمام رہے گی۔

قرآن کی بعض آیات اور احکام ایسے ہیں جن کا ایک خاص پس منظر ہے، شانِ نزول ہے اور اس پس منظر کے بغیر ان احکام کی حکمت و علت کا سمجھنا دشوار ہے اور اس پس منظر یا سببِ نزول کا علم ہمیں صرف اور صرف حدیث کے ذریعے ہو سکتا ہے اور اگر حدیث کو جحت نہ مانا جائے تو اسلام اور قرآن کے احکام کے اسباب و علل اور حکمتوں کا سمجھنا دشوار ہو گا۔ پس ثابت ہے کہ اسلام کے مکمل علم کے لیے قرآن کے ساتھ صاحبِ قرآن کی شفت کو ملا کر سمجھنا ضروری ہے اور اس کے لیے حدیث پاک کو جحت اور سند ماننا ضروری ہے۔

منتخب احادیث

(یہ احادیث کراچی کے ترجمہ کالجوں کے لیے منتخب کی گئی ہیں)

نوت: یہ احادیث امام سیحی بن شرف النووی (متوفی 676 ہجری) کی تالیف "ریاض الصالحین" سے مل گئی ہیں اور نصاب مرتب کرنے والوں نے اسی پر اکتفا کی اور اصل مأخذ حدیث کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ لہذا ہم نے با امر مجبوری متن میں اسی حدیث کو درج کر کے ترجمہ لکھا ہے، لیکن اساتذہ اور طلبہ کو درست معلومات دینے کے لیے اصل مأخذ کے متن اور ریاض الصالحین کے متن حدیث میں جو لفظی فرق ہے، اُس کی نشاندہی کر دی ہے اور اُس کے لیے ہم نے "مکتبہ نزارِ مصطفیٰ الباز، مکہ المکرہ" لے ایڈیشن پر انحصار کیا ہے جس حدیث کے آخر میں "متفق علیہ" لکھا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256 ہجری نے صحیح بخاری اور ابو الحسین امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 261 ہجری نے صحیح مسلم میں روایت کیا ہے اور ان دونوں کا اس حدیث کے صحیح ہونے پر اتفاق ہے۔

حدیث نمبر: 1:

نعمتوں پر شکر ادا کیا جائے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كُلُّ سُلَامٍ مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، كُلُّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيهِ السَّمَاءُ، يَعْدِلُ بَيْنَ إِلَاثَنِيْنِ صَدَقَةٌ، وَيُعِينُ الرَّجُلَ عَلَى دَائِبِتِهِ فَيَحِلُّ عَلَيْهَا أَوْ يَرْفَعُ عَلَيْهَا مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ خُطُوةٍ يَخْطُوْهَا إِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ، وَبَيْنِظُ الْأَذْيَى عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ - (متفق علیہ)

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
تواصف کرتا ہے	تَعْدِلُ	جوڑ، مفاصل	سُلَامٍ

چوپایا، سواری	ذابتہ	وہ مدد کرتا ہے	یعین
سامان	مَتَاعٌ	وہ اٹھاتا ہے	یَرْفَعُ
تو ہنار دیتا ہے	بِسِينُظ		الطَّرِيقَ
تو اسے اٹھاتا ہے، سوار کرتا ہے	تَخْيِلَةٌ	راستہ فاصلہ	خُطْرَةٌ
تحوڑا ضرر، خفیف نقصان	آلَادِنِي		إِثْنَيْنِ دو

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: انسان کے (جسم کے) ہر جوڑ پر ایک صدقہ واجب ہوتا ہے، ہر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے، تیرا دو آدمیوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دینا صدقہ ہے، تیرا کسی شخص کی مدد کرنا اس طرح کہ تو اسے اس کے جانور پر سوار کرائے یا اس پر اس کا سامان لدوائے، یہ صدقہ ہے، اچھی بات کہہ دینا یہ بھی صدقہ ہے، نماز کے لیے جانے میں اٹھایا جانے والا ہر قدم صدقہ ہے اور عام راستے اور گزرگاہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا یہ بھی صدقہ ہے، (بخاری: 2989، مسلم: 1009)“

تفصیل:

اس حدیث پاک کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان پر اللہ جل شانہ کی نعمتیں بے شمار اور بے حد حساب ہیں، قرآن پاک میں ارشاد ہے:

”وَإِنْ تَعْدُوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُمُوهَا“، ترجمہ: ”اگر تم اللہ کی نعمت کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے، (ابراءہم: 34)۔“

بعض نعمتوں کا انسان کو احساس ہوتا ہے اور بعض کا احساس و شعور نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر انسان بہت کم اپنے جسم کی ہیئت ترکیبی (STRUCTURE) پر غور کرتا ہے، ورنہ اسے اپنے خالق و مالک کی قدرت اور کارگیری کا اندازہ ہو جائے۔ چنانچہ اس حدیث میں

انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ انسان کی جسمانی ساخت کا اہم پونزہ انسان کے جوڑ (JOINTS) ہیں، جن کی وجہ سے انسان کے جسم میں لپک (FLEXIBILITY) اور حرکت (MOVEMENT) کی استعداد و صلاحیت ہے اور جس کی مدد سے انسان اپنے طبعی تقاضوں (BIOLOGICAL REQUIREMENTS) اور فطری خواہشات کی تکمیل کے لیے مختلف جسمانی حیثیتیں (PHYSICAL POSITIONS) اختیار کر سکتا ہے، اگر یہ نہ ہوں تو انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی ایک بے حس و حرکت اور جامد و ساکت درخت یا ٹیلے کی مانند ہو۔

لہذا انسان کو قدرت کی ان نعمتوں کا شعوری طور پر احساس و اعتراف کرنا چاہیے اور اس پر اپنے منعم کا شکر ادا کرنا واجب اور لازم ہے، اس اعتراف نعمت اور اظہار شکر کو حدیث میں صدقے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اس کے ہر ہر جوڑ کے عوض اس پر صدقہ واجب ہے، انسان کے بدن میں تین سو سانچھے جوڑ ہیں اور اس پر دن میں تین سو سانچھے بار صدقہ کرنا واجب ہے اور یہ بہت مشکل ہے کہ ہر انسان دن میں تین سو سانچھے مرتبہ صدقہ کرے، تو اس میں آسانی کے لیے نبی ﷺ نے بتایا: جو شخص ان افعال میں سے کوئی فعل کرے تو اس کا صدقہ ادا ہو جائے گا اور پھر قرآن نے یہ بھی فرمایا: نعمت کا شکر کرنا نعمتوں کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے: ”لَمَنْ شَكَرْتُمْ لَا زِيَّدَ لَكُمْ“۔

ترجمہ: ”اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں نعمت میں اضافہ کر دوں گا، (ابراهیم: 7)۔“

مگر ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا: ”وَقَلِيلٌ قُنْ عَبَادَى الشَّكُورُ“۔

ترجمہ: ”میرے بندوں میں سے بہت کم شکرگزار ہیں، (سaba: 13)۔“

لفظ صدقہ سے صرف یہ مراد نہیں کہ عطیہ لازمی مال کی شکل میں ہو بلکہ ہر ایک چیز کا صدقہ اس کی اپنی مناسبت اور طبعی استعداد کے مطابق عائد کیا گیا ہے، حدیث میں اعتراف نعمت اور اظہار شکر کی ان متعدد صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مثلاً: علمی، ذہنی اور فکری صلاحیتوں اور انسانی وجاہت کا صدقہ یہ ہے کہ دو افراد

کے درمیان دیانت اور عدالت، انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے، عدل سے مراد ہے:
 (۱) "دولت نے والوں کے درمیان فیصلہ کرنا" اور یہ معنی حکام یا صاحب حیثیت لوگوں کے
 ساتھ مخصوص ہے۔

(۲) اس سے مراد اس کے مال، اہل، زیر دست اور اس کے خواص کے درمیان عدل کرنا
 ہے، کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا: "لَكُمْ رِزَاعٌ وَلَكُمْ مَسْنَوٌ عَنْ رَعْيَتِهِ"۔
 ترجمہ: "تم میں سے ہر شخص محافظ ہے اور ہر شخص سے اس کی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا،
 (بخاری: 893)"۔

(۳) عدل سے مراد حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔

جسم و جاں اور قوت بازو کی نعمت کا ایک ادنیٰ صدقہ اور حق یہ ہے کہ کسی ضعیف،
 مجبور اور بے کس کا بوجھا بھالے، راہ چلتے معدود روکو سہارا دے اس کی اپنی سواری ہو تو اس پر
 سوار کرائے اور اگر نہیں ہے تو اپنی سواری پر اس کو بھالے، عام گزرگاہ پر کوئی کائنات، پتھر،
 نجاست یا کوئی تکلیف دہ چیز نظر آجائے تو اسے ہٹا دے تاکہ راہ چلنے والا تکلیف اور مصیبت
 سے فیض جائے۔ ایک اور حدیث میں اسے ایمان کی علامت اور ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا گیا
 ہے اور ایک آدمی کی مغفرت راستے سے کانٹوں والی ٹہنی کو ہٹانے کی وجہ سے ہوئی، حضرت

ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
 "يَئِنَّمَا رَجُلٌ يَنْهَا فِي طَرِيقٍ، وَجَدَ غُصْنَ شَوْكَ عَلَى الطَّرِيقِ، فَأَخَذَهُ، فَشَكَّرَ اللَّهُ لَهُ،
 فَغَفَرَ لَهُ"۔

ترجمہ: "ایک شخص راستے میں جا رہا تھا کہ راستے میں کانٹوں والی ٹہنی کو پایا تو اس کو ہٹا دیا،
 اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر افزائی کی اور اسے بخش دیا، (بخاری: 2472)"۔

زبان کا صدقہ یہ ہے کہ زبان سے ہمیشہ کلمہ خیر کہے، آیات الہیہ کی تلاوت
 کرے، کلمہ طیبہ سے بطورِ خاص "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ" اور دیگر کلمات ذکر و فخر
 بھی مژاد ہو سکتے ہیں اور غیبیت، جھوٹ، بہتان اور لغو باتوں سے اجتناب کرنا اور خوش اخلاقی
 سے بات کرنا بھی مزاد ہو سکتا ہے، ایک اور حدیث میں ہے:

”وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِإِشْرَاعِ الْأَخْرَافِ لِيُقْلِدُ خَيْرًا أَوْ لِيُضْعِفُ“ -
ترجمہ: ”اور جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ اچھی بات کہے یا پھر خاموش
رہے، (بخاری: 6018)“، یعنی بے ہودہ گوئی سے خاموشی بہتر ہے۔

پاؤں اور چلنے پھرنے کی قوت اور نعمت کا صدقہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے قدم
خیر کی طرف اٹھائے اور اپنے آپ کو شر سے روکے رکھے۔ حدیث میں نماز کا ذکر ایک اعلیٰ
نمونے کے طور پر کیا گیا ہے اور ایک اور حدیث میں نماز کے لیے اٹھائے جانے والے ہر
قدم کے بد لے ۱۰ نیکیوں کے اضافے، ۱۰ گناہوں کی معافی اور ۱۰ درجات کی بلندی کا
 وعدہ فرمایا گیا ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب نماز کی طرف اٹھائے جانے
والے قدم اتنے مبارک ہیں تو بجائے خود نماز کرنی بابرکت عبادت ہوگی۔ اس سے یہ بھی
اشارہ ملتا ہے کہ ہر نیک کام کے لیے قدم اٹھانا صدقہ اور نیکی ہے۔

حدیث نمبر: 2:

خلاف واقعہ بات کہنے کی رخصت کب ہوتی ہے؟

”عَنْ أُمِّ الْكُلُومِ بِنْ أَبِي مُعِيْطٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: سَيَغُثُّ رَسُولُ اللَّهِ
كَذَابٌ يُقُولُ: لَيْسَ الْكَذَابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ، فَيَسْتَحِي خَيْرًا أَوْ يَقُولُ
خَيْرًا، (متفق علیہ)۔ وَنِي رِوَايَةُ مُسْلِمٍ زِيَادَةً: قَالَ أَبْنُ شِهَابٍ: وَلَمْ أَسْتَعِمْ يُرَخَّصُ فِي
شَيْءٍ مِمَّا يَقُولُ النَّاسُ كَذِبٌ إِلَّا فِي ثَلَاثَ الْحَرَبَ، وَالْإِصْلَامُ بَيْنَ النَّاسِ، وَحَدِيثُ
الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ وَحَدِيثُ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا“۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
كَذَابٌ	لَيْسَ الْكَذَابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ	يُصْلِحُ	وَهُصْلِحُ کرتا ہے
يَسْتَحِي	لَمْ أَسْتَعِمْ يُرَخَّصُ فِي	يُرَخَّصُ	میں نے نہیں سنایا
الْحَدِيثُ إِلَى فُلَانٍ	كَسِی کی جانب بات کی نسبت کرنا	رخصت دی جاتی ہے	رخصت دی جاتا ہے

ترجمہ: ”حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے نار رسول

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: جھوٹا شخص وہ نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور (کسی ایک فریق کی طرف) اچھی بات منسوب کرے یا اچھی بات کہے، (یہاں تک حدیث کے الفاظ بخاری اور مسلم دونوں میں تتفق علیہ ہیں)۔ مگر اس کے بعد مسلم شریف کی روایت میں مندرجہ ذیل کلمات کا اضافہ ہے: ”میں نے سنا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے کلام میں (خلاف واقعہ بات کہنے کی) رخصت دی ہو مگر صرف تین موقع پر (آپ نے ایسی رخصت دی ہے): دشمن سے جنگ کے موقع پر، لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے موقع پر اور مرد کا اپنی بیوی سے اور بیوی کا اپنے شوہر سے گفتگو کرتے وقت اظہار محبت میں مبالغہ آرائی کرنا۔“

حدیث کے حوالہ جات: (بخاری: 2692، مسلم: 2605)

تعریف:

حدیث کا مفہوم و مذکورا یہ ہے کہ اسلام میں دو افراد یا دو گروہوں یا دو قبیلوں کے درمیان صلح کر دینا اور ناحق خون خرابے اور جنگ و جدال کرو کرنا، دو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دینا، دو چھڑے ہوئے افراد کو ملا دینا اور اس طرح فتنہ و فساد اور شر کرو کر دینا بہت بڑی سعادت اور نیکی ہے، کیونکہ اسلام امن و سلامتی اور صلح و آشتی کا مذہب ہے اور بعض اوقات آپس کے اختلاف، رنجش اور نزاع کا سبب کسی ایک فریق کی امت کی معمولی غلطی یا ہٹ دھری یا غلط فہمی ہوتی ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اسلام میں جھوٹ بولنا صریح گناہ ہے، بلکہ بعض علماء نے اسے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے اور جھوٹ بولنے یا خلاف واقع بات کہنے کی اسلام میں اجازت نہیں ہے، مگر بعض ایسے ارفع و اعلیٰ مقاصد بھی ہیں، جن کے لیے اسلام کے بے چک اصول میں بھی تھوڑی سی رخصت دی گئی ہے۔

زیر بحث حدیث میں ایسے موقع تین بتائے گئے ہیں، جہاں شرعاً خلاف واقع بات کہنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ اس کے چیچھے اصلاح، نیک نیت، اخلاص اور دفعہ شر کے عوامل اور جذبات کا فرماؤں۔ ایسی خلاف واقعہ بات پر دراصل جھوٹ کا اطلاق صحیح نہیں، اس پر کذب اور جھوٹ کا اطلاق مغض لغوی طور پر ہی ہو سکتا ہے، حقیقتاً نہیں۔ اس لیے اس

سے کوئی شخص یہ مطلب اخذ نہ کرے کہ اسلام میں اشیاء میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا اطلاق مخصوص عارضی طور پر اور وقتی مصلحتوں کے تحت ہوتا ہے، بلکہ اسے ہم تعریف یا مبالغہ آرائی سے تعجیر کر سکتے ہیں۔

مثال: دوآدمیوں میں اختلاف ہے اور وہ ایک دوسرے کے کثرا شمن ہیں اور آپ ان دونوں کے درمیان صلح کے خواہش مند ہیں، آپ ایک سے جا کر کہیں کہ ”فلاں صاحب“ جن کے آپ مخالف ہیں، آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے ان سے جو اچھی باتیں سنی ہیں، ان کو بیان کریں اور جو بری باتیں سنی ہوں، اس کے ذکر سے خاموش رہیں یا اگر بات کے دو مطلب نکل رہے ہوں، تو ان میں موقع کی مناسبت مفید مطلب کو بیان کریں، اگرچہ کہنے والے کا مطلب وہ نہ ہو، علی ہذا القیاس آپ دوسرے فریق سے جا کر اسی طرح بات کریں، تو اس طرح کوئی بعد نہیں کہ ان کے دلوں سے نفرت و کدورت ختم ہو جائے اور وہ دوبارہ آپس میں شیر و شکر ہو جائیں، کیونکہ جب ایک آدمی بری بات کرتا ہے اور آپ اس سے کہیں کہ دوسرا آپ کے بارے میں اچھی باتیں کرتا ہے اور آپ کو اچھے الفاظ میں یاد کرتا ہے تو اس کا ضمیر اس کو بھی ملامت کرتا ہے کہ وہ میرے بارے میں اچھے خیالات رکھتا ہے، تو میں کیوں اس کے بارے میں برا سوچوں یا بربادی بات کہوں، بعض اوقات دونوں کے درمیان صرف انا کی دیوار ہوتی ہے جو معمولی سی کوشش سے گرجاتی ہے، اس لیے فارسی کا مقولہ ہے: ”دروغ مصلحت آمیز پہ از راستی فتنہ انگیز“۔

اسی طرح دوسرے دو موقع جن میں خلاف واقعہ بات کہنے کی اجازت ہے، یہ ہیں: ایک تو شمن سے جنگ کا موقع ہے، جنگ کے بارے میں ایک اور روایت ہے: ”آل حرب خدعة“، ترجمہ: ”جنگ دھوکا ہے، (مسلم: 1739)“، یعنی جنگ میں ہر فریق اپنی حکمت عملی، چالوں اور جنگی تداریک سے دوسرے فریق کو نقصان پہنچانے اور تباہ کرنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقع پر کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں وہ کسی بھی صورت میں ذشم کو اسلامی فوج کی جنگی پوزیشن، جنگی رازوں اور دفاعی حکمت عملیوں سے آگاہ کرے، خواہ اُسے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

ای طرح میاں بیوی کا باہمی رشتہ طبعی لحاظ سے قریب ترین اور نازک ترین رشتہ ہے اور پورے خاندانی نظام کی صلاح و فلاح کا انحصار اس رشتے کی استواری پر ہے اور یہ بھی فطری امر ہے کہ اتنے قریبی تعلق میں عملًا ہر لمحہ اور ہر لحظہ اعلیٰ ترین جذباتی کیفیت برقرار نہیں رہ سکتی، مشہور مثال ہے کہ جہاں دو برتن ہوتے ہیں، آپس میں مگراتے ہیں۔ لہذا اس حدیث کی رو سے میاں بیوی کو شرعاً اس امر کی رخصت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی محبت کے اظہار میں مبالغہ آرائی سے کام لے سکتے ہیں، خواہ وہ خلاف واقعہ ہی کیوں نہ ہو، یعنی قلبی و ذہنی کیفیاتِ محبت خواہ زبانی دعوائے محبت سے کم تر ہی کیوں نہ ہوں۔ بعض علماء کا موقف ہے کہ اس حدیث میں جو خلاف واقع بات کہنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کی واقع کے خلاف اور جھوٹی خبر دے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کو حرام قرار دیا ہے، اس لیے صریح جھوٹ کی وجہ تعریض سے کام لیا جائے، تعریض یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں، ایک قریب اور دوسرا بعید، تکلم بعید معنی کا ارادہ کرے اور مخاطب کے ذہن میں قریب معنی کا وہم ڈالے۔

حدیث نمبر: 3

انسانی شرف و فضیلت کے دو معیار

”عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ السَّاعِدِيِّ، أَنَّهُ قَالَ: مَرَّ رَجُلٌ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ لِرَجُلٍ عِنْدَهُ جَالِسٍ مَا رَأَيْتَ فِي هَذَا، فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ أَصْنَافِ النَّاسِ، هُذَا وَاللَّهِ حِرَمٌ إِنْ خَطَبَ أَنْ يُنْكَحَ، وَإِنْ شَفَعَ أَنْ يُشْفَعَ، قَالَ: فَسَكَتَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، ثُمَّ مَرَّ رَجُلٌ آخَرُ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: مَا رَأَيْتَ فِي هَذَا، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! هُذَا رَجُلٌ مِنْ فُقَرَاءِ الْمُسْلِمِينَ، هُذَا حِرَمٌ إِنْ خَطَبَ أَنْ لَا يُنْكَحَ، وَإِنْ شَفَعَ أَنْ لَا يُشْفَعَ، وَإِنْ قَالَ أَنْ لَا يُسْمَعَ لِقَوْلِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: هُذَا خَيْرٌ مِنْ مِلْءِ الْأَرْضِ مِثْلَ هَذَا، (متفق عليه) -

الغاظ	معنى	الغاظ	معنى
گزرا	مَرَّ	جَالِسٍ	بیٹھا ہوا۔ بیٹھنے والا

حِرَائِی	لائق، مستحق	رَجُلٌ	ایک آدمی
يُشَكَّم	نَكَاحَ كَرْدِيَا جَاءَ	مِنْ أَشْرَافِ النَّاسِ	شَرِيفِ لُوْغُوْنِ مِنْ سے
يُسْفَعُ	إِنْ خَطَبَ اسَّكِنْدَرُ	إِنْ خَطَبَ	اگر نکاح کا پیغام دے
أُخْرَ	دُوسْرَا	إِنْ شَفَعَ	اگر سفارش کرے
لَا يُشَبَّهُ	زَمِنْ بَهْرَجَةَ	فَسَكَّتْ	پس اگر خاموش رہے
	نَهْ سَنَاجَةَ		

ترجمہ: ابوالعباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ایک شخص کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پاس بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص سے دریافت فرمایا: اس شخص کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے، اس نے عرض کیا: یہ معزز لوگوں میں سے ہے، اللہ کی قسم یہ اس بات کے لائق ہے کہ اگر یہ (کسی کی بیٹی یا بہن کے لیے) نکاح کا پیغام دے تو اس کے ساتھ نکاح کر دیا جائے اور اگر یہ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ پھر وہاں سے ایک اور شخص کا گزر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی پاس بیٹھے ہوئے شخص سے اس کے بارے میں پوچھا: اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے، تو اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ شخص نادار مسلمانوں کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے، یہ اس لائق ہے کہ اگر یہ کسی کو نکاح کا پیغام دے تو اس کا نکاح نہ کیا جائے، اگر یہ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش نہ مانی جائے اور اگر یہ کوئی بات کہے تو نہ سمجھی جائے، اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (جس شخص کا تم نے دل کھول کر تعریف و توصیف کی ہے) اگر اس جیسے لوگوں سے زمین بھر جائے تو یہ ایک

(نادر مومن) ان سب سے (اللہ کے نزدیک) افضل و اعلیٰ ہے۔

شرح:

اس حدیث پاک میں انسانی شرف و فضیلت کے دو معیار بتائے گئے ہیں: ایک خالص دنیوی معیار ہے اور وہ ہے دنیوی مال و متاع کی فراوانی، جاہ و منصب، حسب و نسب اور نام و نمود وغیرہ۔ دوسرا معیار خالص دینی ہے، جس کا تمام تر دار و مدار سیرت و کردار، قول و فعل، علم و عمل اور تقویٰ و پرہیزگاری پر ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے دنیاوی معیارِ شرافت کے تحت پہلے شخص کو افضل و اشرف اور لائق احترام قرار دیا اور دوسرے مسکین و نادار شخص کو ناقابل توجہ۔ اس پر اللہ کے رسول مکرم ﷺ نے واضح فرمایا کہ اللہ کے نزدیک معیارِ شرافت وہ نہیں جو تم نے سمجھ رکھا ہے، اس جیسے دنیادار لوگوں سے اللہ کی زمین بھر جائے تو بھی سب مل کر ایک نادر مومن کامل کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ قرآنی معیارِ شرافت و فضیلت صرف اور صرف تقویٰ ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتُقْسِمُ“ -

ترجمہ: ”اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، (الحجرات: 13)۔“

ایک حدیث پاک میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رَبِّ أَشْعَثَ مَدْفُوعَ بِالْأَبْوَابِ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللَّهِ لَا يَرَهُ“ -

ترجمہ: ”بہت سے پر اگنڈہ حال غبار آلو داشخاص ایسے ہیں جنہیں دنیادار لوگ دھنکار دیتے ہیں، (لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ) اگر وہ کسی معااملے میں اللہ کی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اس میں انہیں سرخ رو فرماتا ہے، (مسلم: 2622)۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”إِنَّهُ لَيَأْتِي الرَّجُلُ الْعَظِيمُ السَّيِّدُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، لَا يَرِنُ عِنْدَ اللَّهِ جَنَاحَ بَعْوَذَةٍ“ -

ترجمہ: ” بلاشبہ قیامت کے دن ایک بخاری بھر کم موٹا تازہ شخص آئے گا، لیکن اس کی اللہ کے نزدیک حیرت سے مجھ کے ایک پر کے برابر بھی قدر و قیمت نہیں ہوگی، (بخاری: 4729)۔“
حدیث نمبر: 4

تیم کی کفالت

”عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: وَأَنَا وَكَافِلُ الْيَتَامَةِ فِي الْجَنَّةِ هُكْدًا، وَأَشَارَ بِالسَّبَابَةِ وَالْوُسْطَى وَفَرَّاجَ يَنْهَا شَيْئًا، (رواہ البخاری)۔“

اللغاظ	معانی	اللغاظ	معانی
كَافِلُ الْيَتَامَةِ	تیم کی کفالت کرنے والا	السَّبَابَةُ	شہادت کی انگلی
وُسْطُى	تیم کی ضروریات کو پورا کرنے والا	فَرَّاجٌ	(MIDDLE FINGER) کشادگی فرمائی

ترجمہ: ”ہبل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اور تیم کا کفیل جنت میں اس طرح ہوں گے، آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا اور دونوں کے درمیان کشادگی فرمائی۔“

حدیث کے حوالہ جات: (بخاری: 5304، مسلم: 2983)

شرح:

اس حدیث پاک میں نبی ﷺ نے تیموں کے حقوق کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو شخص کسی تیم کی کفالت اور سرپرستی کرتا ہے، اُسے آخرت میں ایسے اعلیٰ مقام پر فائز کیا جائے گا، جہاں سے اُسے اللہ کے رسول ﷺ کا تقرب حاصل ہوگا، تیموں کو کھلانے پلانے والے کے لیے جنت کی بشارت ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
 ”مَنْ قَبَضَ تِيمًا مِّنْ بَيْنِ الْمُسْلِمِينَ إِلَى طَعَامِهِ وَشَرَابِهِ أَذْخَلَهُ اللَّهُ الْجَنَّةَ الْبَشَّةَ، إِلَّا أَنْ يَغْنِلَ ذَنْبًا لَا يُغْفَرُ لَهُ“۔

ترجمہ: ”جو شخص کسی مسلمان یتیم کو اپنے ساتھ رکھ کر انہیں کھلانے پلائے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا، سوائے اس کے کہ وہ ایسا گناہ کرے جو مغفرت کے قابل نہ ہو، (ترمذی: 1917)۔“

یتیم اسے کہتے ہیں کہ جس کے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا ہے اور ظاہری طور پر وہ بے سہارا ہو گیا ہو، ایسے یتیم بچوں کی کفالت باعثِ اجر و ثواب ہے اور اگر یتیم بچے کو حصہ وراثت میں کچھ مال ملا ہو تو ایک ایمن (TRUSTEE) کی حیثیت سے اس کے مال کا تحفظ کرنا چاہیے اور اسے مختلف حیلوں اور ہتھکنڈوں سے اپنے ذاتی تصرف میں نہیں لانا چاہیے، یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائے اور اپنے معاملات خود دیکھنے کے قابل ہو جائے۔

ارشادِ خداوندی ہے: ”وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَّا أَمْوَالُكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ حُوَّبًا كَبِيرًا۔“

ترجمہ: ”ان کے مال کو اپنے مال میں شامل کر کے نہ کھاؤ۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے، (النساء: 2)۔“

اللہ تعالیٰ نے یتیم کا مال کھانے والوں کے لیے عذابِ شدید کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاسًاٖ وَسَيَصُلُّونَ سَعِيرًا“۔

ترجمہ: ”بے شک جو لوگ ناجائز طریقہ سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھر رہے ہیں، وہ غنقریب بھر کتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے، (النساء: 10)۔“

اسی طرح یتیم بچوں سے تعلق اور روکھے پن کا لمحہ بھی اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ انہیں اپنی محرومی اور بے کسی کا احساس نہ ہو، ارشادِ خداوندی ہے:

”فَإِنَّمَا الْيَتَيمَ فَلَا تَقْهِرْ“ - ترجمہ: ”یتیم کو مت جھڑکو، (لفظی: ۹)“
 اگر یتیم غریب اور نادار بھی ہے تو قرآن کی رو سے اس کی کفالت سے پہلو تھی
 اختیار کرنے والا دراصل قیامت کو جھٹلاتا ہے، ورنہ قیامت کے خوف سے وہ ایسی جارت
 کبھی نہ کرتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”أَمَّرَ رَبُّكَ الْيَتَامَةَ فَلَمَّا يَعْلَمُوا أَنَّهُمْ يَتَامَةٌ يَدْعُهُمُ الْيَتَامَةُ①“ -
 ترجمہ: ”کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو دین کی تکذیب کرتا ہے، پس یہی شخص ہے جو یتیم کو
 دھکے دیتا ہے، (الماعون: 1-2)“ -

یتیم کی مدت یاتمت کب ختم ہوتی ہے، اس بارے میں مسلم شریف کی حدیث
 نمبر: 1812 میں ہے کہ جب وہ بالغ ہو جائے اور نکاح کے قابل ہو جائے اور اس کی عقل
 میں پختگی آجائے تو اب وہ یتیم نہیں کہلائے گا۔

حدیث نمبر: 5

حقيقی مسکین

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ الْمِسْكِينُ الَّذِي تَرَدَّدَ إِلَيْهِ
 وَالثَّيْرَاتِ، وَلَا الْلُّقْبَةُ وَلَا الْلُّقْبَاتِ، إِنَّمَا الْمِسْكِينُ الَّذِي يَتَعَفَّفُ“ (متفق علیہ)۔
 وَقِنْ رِوَايَةً فِي الصَّحِيحَيْنِ: لَيْسَ الْمِسْكِينُ الَّذِي يَطُوفُ عَلَى النَّاسِ تَرَدَّدًا الْلُّقْبَةُ
 وَالْلُّقْبَاتِ وَالثَّيْرَاتِ، وَلَكِنِ الْمِسْكِينُ الَّذِي لَا يَجِدُ غَنِيًّا يُغْنِيهِ، وَلَا يُفْطِنُ
 بِهِ، فَيُتَصَدِّقُ عَلَيْهِ وَلَا يَقُولُ فَيُسَأَلُ النَّاسُ“ -

المعانی	الفاظ	المعانی	الفاظ
کھجور (جمع تمرات)	الثَّيْرَةُ	اے لوٹادیتی ہے	تَرَدَّدَ
چکر لگاتا ہے	يَطُوفُ	پاک و امنی اختیار کرتا ہے	يَتَعَفَّفُ
اتنا مال جو اسی ضرورت پوری کر کے اے بے نیاز کر دے	غَنِيًّا يُغْنِيهِ	نہیں پاتا	لَا يَجِدُ

کھدا نہیں ہوتا	لایقُوم	(اس کی حالت) کا پتا نہیں چلتا	لَا يُفْطِنُ بِهِ
----------------	---------	----------------------------------	-------------------

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص مسکین نہیں ہے جس کو ایک یادو بھوریں یا ایک یادو لقے (تمہارے دروازے سے) لوٹا دیں، حقیقتاً مسکین تودہ ہے جو خودداری کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اور صحیحین کی ایک روایت میں ہے: مسکین وہ نہیں جو در بدر چکر کا شمار ہتا ہے، ایک دو لقے اور ایک دو بھوریں (اسے دے دیے جائیں تو اگلا دروازہ کھلکھلانے کے) لیے چل پڑتا ہے، بلکہ در حقیقت مسکین تودہ ہے جس کے پاس اپنی گزر اوقات کے لیے کچھ نہیں (لیکن اس کی خودداری اور قناعت کی وجہ ہے) اس کی حالت کا کسی کو پتا بھی نہیں چل پاتا کہ اس پر صدقہ کرے اور نہ ہی وہ مجموعوں میں کھڑے ہو کر لوگوں سے سوال کرتا ہے۔

حدیث کے حوالہ جات: (بخاری: 4539، مسلم: 1039)

تفصیل:

اصطلاح شریعت میں مسکین اُسے کہتے ہیں جس کے پاس گزر اوقات کے لیے کچھ بھی نہیں ہو۔ بعض لوگ حقیقتاً محتاج اور تنگ دست تو نہیں ہوتے لیکن گداگری کو پیشے اور ذریعہ معاش کے طور پر اختیار کر لیتے ہیں، گھر گھرا اور در در جاتے ہیں، مسجدوں، مجموعوں، سڑکوں، بازاروں اور چورا ہوں پر راہ چلتے آدمی کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے اوپر مصنوعی فقر و مسکن ت طاری کر کے فنا رانہ مہارت کے ساتھ دوسروں کی جیب سے رقم نکال کر دم لیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس طرزِ عمل کو قابل ملامت قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں انسانیت کی توہین ہے، حقیقی مستحقین اور مسکین کی حق تلفی ہے اور کثیر تعداد میں پیشہ ور گداگروں کی قومی معاشی جدوجہد سے لاتعلقی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
 ”مَنْ سَأَلَ النَّاسَ فِي غَيْرِ فَاقَةٍ نَزَكَتْ بِهِ أَوْ عَيَالٍ لَا يُطِيقُهُمْ، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

بِوَجْهِ لِيَسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ ”۔

ترجمہ: ”جو لوگوں سے اپنی یا اہل و عیال کے ناقابل برداشت فاقہ کے بغیر سوال کرتا ہے، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا، (شعب الایمان: 3250)۔“
کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا، (شعب الایمان: 3250)۔“
حدیث میں ایک دلقوموں یا ایک دشمنوں کی مثال عہد رسالت کے مزاج کے مطابق ہے، آج کل کے حوالے سے بات کی جائے تو ایک درود پے کہہ لیجیے۔ ایسے لوگوں کو حتی الامکان صدقہ نہیں دینا چاہیے، بلکہ ان کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے تاکہ پیشہ و رگدا اگر جو باقاعدہ ایک طبقے کے طور پر وجود میں آگئے ہیں، ختم ہو سکیں۔ غیر مستحق لوگوں کو علم کے باوجود دینا جائز نہیں ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں:

”جس شخص کے پاس ایک دن کا کھانا یا اتنی بدنبال طاقت ہو کہ وہ محنت مزدوری کر کے ایک دن کی خوراک حاصل کر سکے، اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے اور اگر دینے والے کو یہ علم ہو اور اس کے باوجود وہ اس کو دے تو وہ گناہ گار ہوگا کیونکہ وہ حرام کام میں مدد کر رہا ہے، (رواح التجار: ج 2، ص 355)۔“

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”مَنْ يَتَكَفَّلُ إِنْ لَا يَسْأَلُ النَّاسَ شَيْئًا وَاتَّكَفَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ“،

ترجمہ: ”جو آدمی مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا، میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں، (شعب الایمان: 3245)۔“

ایسی طرح حدیث میں ہے: ”اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا اور نیچے والا ہاتھ مانگنے والا ہے، (شعب الایمان: 3229)۔“
حدیث پاک میں حقیقی مسحیین اور صحیح ناداروں اور مسائیں کی انشاندہی کی گئی ہے:
”ان کو ڈھونڈ کر تلاش کرو کیونکہ وہ اپنی خودداری، پاکدامنی، قناعت پسندی کی صفات کی وجہ سے تنگستی کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارہ نہیں کرتے، قرآن نے بھی ان کی یہی صفت بیان کی ہے:

”يَخْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءُ مِنَ الشَّعْفَيفِ تَعْرُفُهُمْ بِسَيِّئِهِمْ لَا يَسْئُلُونَ النَّاسَ“

الْحَافَّاً“۔

ترجمہ: ”تا واقف آدمی (خودداری کی بناء پر) ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے گمان کرتا ہے کہ (یہ) مالدار ہیں (اے رسول کریم!) آب نہیں ان کی صورت سے پہچانتے ہیں، (ورنہ یہ) لوگوں سے پٹ پٹ کرنیں بانٹا کرتے، (البقرہ: 273)۔“

ایسے لوگوں کی اعانت اس طریقے سے کرنی چاہیے کہ ان کی خودداری مجرد حنفیہ ہو اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں، لہذا یہ سمجھ کر نہیں دینا چاہیے کہ ان پر احسان کیا جا رہا ہے بلکہ یہ سمجھ کر دینا چاہیے کہ ان کا شرعی حق نہیں لوٹایا جا رہا ہے اور اس حق کی ادائیگی میں جو تاخیر ہوئی ہے وہ کوتاہی ہے اور ان لوگوں کی مال زکوٰۃ سے بھی مدد کی جاسکتی ہے کہ یہ فقراء اور مساکین کا حق ہے، حدیث میں ارشاد نبوی ہے: ”صدقات ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقراء کو لوٹائے جائیں“۔

حدیث نمبر: 6

بیٹیوں کی کفالت پر اجر

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّهَا قَاتَلَتْ: جَاءَتِنِي مِسْكِينَةٌ تَحْمِلُ ابْنَتَيْنِ لَهَا، فَأَطْعَمْتُهَا ثَلَاثَ تَمَرَاتٍ، فَأَعْطَتُ كُلَّ دَاحِدَةٍ مِنْهُمَا تَمَرَّةً وَرَفَعْتُ إِلَى فِيهَا تَمَرَّةً لِتَأْكُلُهَا، فَاسْتَطَعْتُهَا ابْنَتَاهَا، فَشَقَّتِ التَّمَرَّةُ الَّتِي كَانَتْ تُرِيدُ أَنْ تَأْكُلَهَا بَيْنَهُمَا، فَأَعْجَبَنِي شَانِهَا، فَذَكَرَتِ الَّذِي صَنَعْتُ لِرَسُولِ اللَّهِ مَكْتُوبًا، فَقَالَ: إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَوْجَبَ لَهَا بِهَا الْجَنَّةَ أَوْ أَعْتَقَهَا بِهَا مِنَ النَّارِ“۔

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
ابنی دو بیٹیوں کو اٹھائے ہوئے	تَحْمِلُ ابْنَتَيْنِ	میرے پاس آئی	جَاءَتِنِي
اس نے دی	لَهَا أَعْطَتُ	میں نے اسے کھائیں	أَطْعَمْتُهَا

اے اس کی بچیوں نے ماںگ لیا	فاستطعہتھا	تاکہ کھائے	بٹاکھا
اس کی دونوں بیٹیاں	ابنَتَاهَا	اس نے پھاڑی، ملکرے کر دیے	شَقْتُ
مجھے اچھی لگی یا مجھے حیرت میں ڈال دیا	أَعْجَبَنِي	اس عورت نے کیا	صَنْعَتُ
اے آزاد کر دیا	إِعْتَقَهَا	واجب کر دیا	أَوْجَبَ

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک مسکین عورت، میرے پاس آئی جوابی دو بیٹیوں کو بھراہ لیے ہوئے تھی، میں نے اسے تین کھجور میں دیں تو اس نے دونوں لڑکوں کو ایک ایک کھجور دی اور ایک کھجور خود کھانے کے ارادے سے منہ میں ڈالنے ہی والی تھی کہ دونوں بچیوں نے وہ کھجور بھی ماںگ لی تو اس عورت نے اس کھجور کو جسے وہ خود کھانا چاہتی تھی، دیکھ کر کے دونوں میں بانٹ دی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:) اس کے ایثار نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تو میں نے اس عورت کے اس طرزِ عمل کا حضور اکرم ﷺ سے ذکر کیا، آپ نے فرمایا: ”اللہ نے اس کے اس ایثار کے صلے میں اس کے لیے جہنم سے واجب کر دی یا (آپ نے فرمایا) اس عمل کی برکت سے اللہ نے اسے جہنم سے آزاد کر دیا۔

حدیث کے حوالہ جات: (رواه مسلم: 2630)

شرح:

اس حدیث پاک سے دو باتیں نمایاں طور پر سامنے آئیں: ایک مسکین عورت کا اپنی بچیوں کے لیے ایثار اور آخرت میں اللہ کے ہاں اس کا اجر ایثار کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسرے کو انجام دے جیسا کہ قرآن پاک میں شانِ صحابہ و مولیٰ بیان کی گئی ہے:

”وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَاصَّةٌ“۔

ترجمہ: ”وہ اگرچہ خود حاجت مند ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود دوسرا ذل کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، (الحضر: 9)۔“

زیر بحث حدیث میں ظاہر ہے کہ جس طرح وہ بچیاں بھوکی تھیں، اسی طرح وہ عورت (ان کی ماں) بھی فقر و فاقہ کے عالم میں تھی۔ وہ چاہتی تو ایک کی بجائے دو کھجوریں خود کھا لیتی، لیکن اس نے خود بھوکا رہنا گوارا کیا مگر بچیوں کی بھوک کو گوارانہ کر سکی۔ اس عظیم ایثار پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا موحیرت ہو گئیں۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس عمل کو بدولت وہ جنتی ہو گئی۔

اس سے دو باتیں معلوم ہو گیں: ایک یہ کہ اپنی اولاد کے لیے بھی ایثار اتنا ہی باعث اجر ہے جتنا کہ دوسروں کے لیے، بلکہ بعض دیگر احادیث میں دو یا زائد لڑکیوں کی پورش اور شادی تک کفالت کو اخروی نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے:

”مَنِ ابْتُلِيَ مِنَ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ، فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ۔“

ترجمہ: ”جس کو بیٹیوں کے ذریعے سے آزمایا گیا، پھر اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے لیے جہنم سے آڑ ہوں گی، (مسلم: 2629)۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ عَالَ جَارِيَتِينِ حَتَّىٰ تَبَلُّغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ، وَضَمَّ أَصَابِعَهُ“۔

ترجمہ: ”جو شخص دو لڑکیوں کو ان کے جوان ہونے تک پالے قیامت کے دن، میں اور وہ اس طرح سے آئیں گے اور آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ملا یا، (مسلم: 2631)۔“

دوم یہ کہ اللہ کے عطا کردہ علم نبوت کے فیض سے رسول اکرم ﷺ لوگوں کی عاقبت اور جنتی وجہتی ہونے کا علم رکھتے تھے اور جہاں حکمتِ الہی کا تقاضا ہوتا تھا وہاں اس کا اظہار بھی فرمادیتے تھے۔

حدیث میں جہاں ”او“ بمعنی یا کلمہ ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ راوی کو قطعی بات یاد نہیں رہی، بلکہ وہ شک میں پڑ گیا کہ حضور نے یہ فرمایا یا وہ فرمایا۔

حدیث نمبر: 7

کمزوروں کی مدد کرنے کی فضیلت

”عَنْ مُصْعِبِ بْنِ سَعْدٍ بْنِ أَبِي وَقَاصٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: رَأَى سَعْدُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَئِ لَهُ فَضْلًا عَلَى مَنْ دُونَهُ، قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: هَلْ تُشَرِّمُونَ وَتُزَرِّقُونَ إِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ۔“

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
فضیلت، برتری	فَضْلًا	دیکھا، سمجھا	رَأَى
تمہاری مدد کی جاتی ہے	تُشَرِّمُونَ	اپنے سے نیچے والوں پر	عَلَى مَنْ دُونَهُ
کمزور لوگ	ضُعَفَاءُ	تمہیں رزق دیا جاتا ہے	تُزَرِّقُونَ

ترجمہ: مصعب بن سعد بن ابی وقار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: (آن کے والد) سعد نے یہ گمان کیا کہ انھیں اپنے سے نیچے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے، تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (قدرت کی طرف سے) تمہاری جو مدد کی جاتی اور تمہیں جو رزق دیا جاتا ہے، یہ تمہارے کمزور لوگوں کی (دعا) برکت سے ہے۔

حدیث کے حوالہ جات: (بخاری: 2896)

تشریح:

”رَأَى“ کے لغوی معنی دیکھنا، لیکن اس ماذے سے جب مضارع مجہول کا صینہ آتا ہے تو ظن اور گمان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہذا یہاں اگرچہ ”رَأَى“ بصیغہ ”ماضی معروف“ آیا ہے، لیکن سیاق عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظن اور گمان کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا، یعنی یہ ایک قلبی واردات تھی جو نگاہِ نبوت سے مستور نہ رہ سکی اور حضور اکرم ﷺ نے اسے بجانب لیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے طرزِ عمل سے ان کے خیال کی عکاسی ہوئی ہو یا

انہوں نے صراحتاً اس کا اظہار کر دیا ہو، بہر کیف جو بھی صورت ہو، نبی ﷺ نے ان کی غلط فہمی دور فرمادی تھی اور یہ بتایا کہ اسلامی معاشرہ کے وہ افراد جو بظاہر تمہیں ضعیف، کمزور اور ناتوان نظر آتے ہیں، ضروری نہیں کہ اللہ کے نزدیک بھی وہ ایسے ہی ہوں۔

ان میں سے کچھ لوگ مقبول بارگاہ خداوندی ہوتے ہیں اور انہی کی دعاؤں کی برکت اور ویلے سے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نصرت سے نوازتا ہے اور تم پر رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہی ناتوان بوڑھوں، مریضوں، عورتوں اور بچوں کے صدقے میں اللہ ان کے مجاہد بھائیوں کو میدانِ جنگ میں فتح و نصرت سے نوازتا ہے۔ اس لیے بتایا کہ نہ اپنی کامیابیوں پر ناز کرو اور نہ ضعیفوں اور کمزوروں کو حقیر سمجھو۔ کیا خبر اللہ کے ہاں کس کا مقام بلند ہے، اسی لیے ایک روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا:

”ابْتَغُونَ ضُعْفَاءَ كُمْ، فَإِنَّهَا تُرْزَقُونَ وَتُنَصَّرُونَ بِضُعْفَاءِ كُمْ“۔

ترجمہ: ”مجھے ضعفا یعنی کمزور لوگوں میں تلاش کرو، کیونکہ تم کو صرف ضعفاء کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور انہی کی وجہ سے تمہاری، دکی جاتی ہے، (ترمذی: 1702)۔“

اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ ضعفاء کی دعاؤں میں شدید اخلاص ہوتا ہے اور بہت زیادہ خشوع و خضوع ہوتا ہے، کیونکہ ان کے دل دنیا کی خوش نما چیزوں اور اس کی زینت کے ساتھ تعلق سے خالی ہوتے ہیں اور ان کے دل ان چیزوں سے صاف ہوتے ہیں جو اللہ سے دور کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے قرب اور باطن کی پاکیزگی کی وجہ سے ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

اس حدیث سے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ جو شخص دوسروں کے سامنے اپنے اوپر فخر کرے، اس کے سامنے دوسروں کے فضائل بیان کرنا چاہیے تاکہ وہ کسی مسلمان کو حقیر نہ سمجھے، اس کے تکبر یا فخر کا ازالہ ہو اور وہ عاجزی اور توضع کو اختیار کرے۔ اس حدیث میں اس بات کا بھی ثبوت ہے مونین کو دوسروں کے اعمال سے فائدہ پہنچتا ہے۔

نوٹ: اس حدیث کے راوی مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ تابعی ہیں اور درمیان کے راوی

(یعنی اپنے والد اور صحابی رسول حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو سلسلہ نہ سے ساقط کر کے روایت کر رہے ہیں۔ ایسی حدیث کو اصطلاح محدثین میں مرسل کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ حافظ ابو بکر برقلانی نے اپنی صحیح میں اس روایت کو محصلہ روایت کیا ہے یعنی یوں ”عَنْ مُضَعِّفٍ عَنْ أَبِيهِ“ مصعب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، اس لیے یہ صحیح ہے اور قابل جلت ہے۔

حدیث نمبر: 8

الل وعیال پر خرچ کرنے کی فضیلت

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: دِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِي سَبِيلٍ إِلَهٌ وَدِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِي رَقَبَةٍ، وَدِينَارٌ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَى مُسْكِينٍ، وَدِينَارٌ أَنْفَقْتَهُ عَلَى أَهْلِكَ، أَغْنَمْتُهَا أَجْزًا إِلَيْنِي أَنْفَقْتَهُ عَلَى أَهْلِكَ“۔

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
تو نے خرچ کیا	أَنْفَقْتَهُ	اشرفتی	دِينَارٌ
ان میں سے اجر میں عظیم	أَغْنَمْتُهَا أَجْزًا	گردان چھڑانے یعنی غلام	فِي رَقَبَةٍ
ترین	آزاد کرنے میں		

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک دینار وہ ہے جو تو نے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے غلام آزاد کرنے میں صرف کیا، ایک دینار وہ ہے جو تو نے مسکین پر صدقہ کیا ایک دینار وہ ہے جو تو نے اپنے الی وعیال پر صرف کیا، ان میں سب سے زیادہ باعث اجر و ثواب وہ ہے جو تو نے اپنے الی وعیال پر صرف کیا۔

حدیث کے حوالہ جات: (مسلم: 995)

تشریح:

اس حدیث پاک میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مال صدقات و خیرات کے مصارف اور مددات کئی ہیں اور ہر ایک مذاہنی جگہ درست اور صحیح ہے، مثلاً: حدیث میں چار مددات کا ذکر

کیا گیا ہے، ان سب پر انفرادی طور پر اور بحیثیت مجموعی انفاقی شرعی کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے اجر آخوند کے اعتبار سے سب سے عظیم نئی اپنے اہل و عیال کی کفالت اور ان کی حاجت برداری ہے، یہ اس لیے فرمایا گیا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید جہاد مالی میں حصہ لینا ممکن ہے کو صدقہ کر دینا، غلام کو آزاد کرنا یا کسی اور کا خیر میں مالی تعاون کرنا تو باعث اجر ہے، مگر اپنے اہل و عیال کی کفالت کے فریضے سے عہدہ برآ ہونا یہ خالص دنیوی عمل ہے اور اس میں اجر و ثواب کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

اس حدیث نے دین و دنیا کی اس تفریق کو ختم کر دیا ہے اور واضح کر دیا کہ انسان جو بھی کام احساں ذمہ داری، نیت اجر و ثواب اور حصول رضاۓ الہی کے لیے کرے گا، وہ دین ہی دین ہے، اس میں اجر ہی اجر ہے، کیونکہ اسلام میں حلال ذرائع سے روزی حاصل کر کے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنا ہر انسان کی شرعی ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا سب سے بڑی نیکی ہے، کیونکہ اسلامی عائلی نظام اور معاشرتی ڈھانچے کی بنیاد ہی اسی پر استوار کی گئی ہے، چنانچہ ایک اور حدیث میں فرمایا گیا:

”وَلَسْتَ تُنْتَفِقُ نَفَقَةَ تَبَيَّنَتْ بِهَا وَجْهَ اللَّهِ، إِلَّا أُجْرُتَ بِهَا، حَقَّ الْلُّقْمَةِ تَجْعَلُهَا فِي قِيمَاتِكَ“۔

ترجمہ: ”اور تم اللہ کی رضاۓ کے لیے جو بھی خرچ کرو گے اس پر اسے اجر ملے گا، حتیٰ کہ اس لفڑی روزی پر بھی جو وہ اپنی محنت سے حلال ذرائع سے حاصل کر کے اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتا ہے، (بخاری: 4409)۔ ایک اور حدیث میں فرمایا:

”وَإِنْ نَفَقَتْكَ عَلَى عِيَالِكَ لَكَ صَدَقَةٌ، وَإِنْ نَفَقَتْكَ عَلَى أَهْلِكَ لَكَ صَدَقَةٌ“۔

ترجمہ: ”جب انسان برائے رضاۓ الہی اور بہ نیت اجر و ثواب اپنے اہل و عیال کی کفالت پر خرچ کرتا ہے، تو یہ اس کے لیے صدقہ ہے، (مندرجہ: 1440)۔“

اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ انسان اور وہ پر خرچ کرتا رہے، لیکن اپنے اہل و عیال پر خرچ نہ کرے اور ان کا خرچ روک دے، حدیث میں اس عمل کو گناہ سے تعبیر کیا

گیا ہے:

”كَفِي بِالْمُتْرَءِ إِنَّمَا أَنْ يَخِسَ، عَمَّنْ يَتَلِكُ قُوَّةٌ“ -

ترجمہ: ”کسی آدمی کے گناہ گار ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے زیر دستوں کا خرچ روک دے، (مسلم: 996)“ -

حدیث نمبر: 9

دینے والا ہاتھ بہتر ہوتا ہے

”وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: الْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلِيِّ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ عَنْ ظَهْرِ غَنِيٍّ، وَمَنْ يَسْتَغْفِفُ يُعْفَفُ إِلَهُ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِي إِلَهُ“ -

المعانی	الفاظ	المعانی	الفاظ
نچلا ہاتھ	الْيَدُ السُّفْلِي	اوپر والا ہاتھ	الْيَدُ الْعُلْيَا
جن کی توکفالت کرتا ہے	مَنْ تَعُولُ	شروع کر	إِبْدَأ
جو پا کر امنی چاہتا ہے	جَوْا كَدَامِنِيْ چاہتا ہے	مالداری کے پیچے باعده یعنی مَنْ يَسْتَغْفِفُ اپنی ضروریات کے لیے پس انداز کرنے کے بعد	عَنْ ظَهْرِ غَنِيٍّ
اللہ سے پا کر امنی عطا کر دیتا ہے	يَعْفُهُ اللَّهُ	جو مالداری چاہتا ہے	مَنْ يَسْتَغْنِ
		اللہ سے غنی کر دیتا ہے	يُغْنِي اللَّهُ

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور (صدقہ و خیرات کا) آغاز ان سے کر جو تیرے زیر کفالت ہیں اور بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات کے لیے پس انداز کرنے کے بعد ہو۔ جو سوال کرنے سے رکے گا اللہ سے روک کر رکھے گا اور جو استغنا چاہے اللہ سے غنی فرمادے گا، (بخاری: 1427)“

شرح:

اس حدیث پاک میں سب سے پہلے اس امر کی ترغیب دی گئی ہے کہ اگرچہ شدید ضرورت کے وقت انسان بحالتِ مجبوری دوسرے مالدار بھائی سے مالی صدقہ اور اعانت لے سکتا ہے، مگر مخفی اسے ایک ناگزیر مجبوری کے طور پر اس عمل کو اختیار کرنا چاہیے، یہ کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے، بلکہ قابلِ فخر اور قابلِ عزت یہ امر ہے کہ انسان دینے والا بنے نہ کہ لینے والا۔ اور پرواں ہاتھ سے کنایہ ہے دینے کی طرف اور نچلے ہاتھ سے کنایہ ہے لینے کی طرف، یہ اس لیے فرمایا گیا تاکہ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو جو ضرورتی نہیں، بلکہ عادتی مانگتے ہیں اور پھر اسے پیشہ بنا لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مانگنے اور سوال کرنے کی حوصلہ شکنی کی ہے، حدیث میں ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ، تَعَلَّمُوا فِيمَا أُكِيدَتِي ثَلَاثَةٌ، فَيَدُ اللَّهِ الْعُلْيَا وَيَدُ الْمُغْطِي الْوُسْطِي، وَيَدُ الْمُغْطِي السُّفْلِي، فَتَعَفَّفُوا وَلَا بِحَزْمِ الْحَطَبِ“

ترجمہ: ”اے لوگو! جان لو کہ ہاتھ تین ہیں، اللہ کا ہاتھ سب سے اوپر ہے اور دینے والا ہاتھ درمیان والا ہے اور مانگنے والا ہاتھ سب سے نیچے ہے، پس تم سوال کرنے سے احتراز کرو، خواہ لکڑیوں کا گٹھا (کاٹ کر، (معجم الکبیر للطبرانی: 269)۔“

یعنی کوئی شخص اگر جنگل سے لکڑی کاٹ کر اس کا گٹھا بنائے کر بازار میں فروخت کرے اور اس سے اپنے اہل عیال کا اور اپنا خرچ نکالے یا کوئی اور مشقت والا کام کرے تو یہ اس کے لیے سوال کرنے اور دوسرے لوگوں سے مانگنے سے بہتر ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ انسان کے صدقہ و خیرات اور جود و سخا کے اولین مستحق انسان کے اہل و عیال اور اس کے زیر کفالت افراد ہیں۔ اگر کوئی شخص اہل و عیال کو تنگدست اور بھوکا نہ چھوڑ کر بیرونی حلقوں میں دادوہش کا مظاہرہ کرتا ہے، تو اسے ریا کاری اور نام و نمود پر محمل کیا جائے گا، بلکہ ایک اور حدیث پاک میں اپنے قرابت داروں پر خرچ کرنے کا دوہرہ اجر بتایا گیا ہے: ایک اتفاق فی سبیل اللہ کا اجر اور دوسری صلہ رحی کا اجر، یعنی اس عمل میں

دونیکیاں جمع ہو جاتی ہیں، (بخاری: 1466)۔

عیال پر خرج کرنے میں ترتیب کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:
 حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "صدقہ کرو، ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! میرے پاس ایک دینار ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: اس کو اپنے اوپر خرج کرو، اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو اپنی بیوی پر خرج کرو، اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو اپنی اولاد پر خرج کرو، اس نے کہا: میرے پاس ایک اور دینار ہے، آپ نے فرمایا: اس کو اپنے خادم پر خرج کرو، اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کے متعلق زیادہ بصیرت رکھتے ہو، (ابوداؤد: 1691)۔

چنانچہ ایک دوسری حدیث میں موت سے پہلے ایسے مالی صدقے سے منع فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنی ساری یا اکثر دولت خیرات کر دے اور ورثاء کو تنگ دست چھوڑ کر چلا جائے، حدیث پاک میں ہے:

حضرت سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّكَ أَنْ تَذَرَّ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ، خَبِيرٌ مِّنْ أَنْ تَذَرَّ هُمْ عَالَةٌ يَسْكَفُونَ النَّائِسَ"۔

ترجمہ: "اگر تو اپنے وارثوں کو اپنے پیچے مالدار چھوڑ جائے تو یہ اس سے بہتر ہو گا کہ محتاجی میں انہیں اس طرح چھوڑ کر جائے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں، (بخاری: 1295)۔"

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے وصیت پر بھی پابندی عائد کی ہے کہ وہ ورثاء کی رضامندی کے بغیر ایک تھائی مال سے زائد پر نافذ نہیں ہو گی تاکہ ورثاء کی حق تلفی نہ ہو۔

نوٹ: یہ امر ملحوظ ہے کہ ان احادیث میں ہر جگہ صدقے سے مراد صدقات واجبه یعنی زکوٰۃ، فطرہ اور نذر نہیں ہیں، بلکہ عام مالی صدقات و اتفاق مزاد ہے، کیونکہ باپ کی زکوٰۃ بیٹے پر اور بیٹے کی زکوٰۃ باپ پر، شوہر کی بیوی اور بیوی کی شوہر پر ادا نہیں ہوتی۔

تیسرا بات حدیث میں یہ فرمائی گئی کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر بیار، اہل و عیال اور

قربات کے حلقے سے باہر مالی صدقہ کرنا چاہے تو بصدق شوق کرنے، لیکن اپنی اور اپنے متعلقین اور قربات داروں کی ضروریات کے لیے پس انداز کرنے کے بعد، ورنہ یہ محض ریا کاری ہوگی۔

چوہی بات یہ کہ جو عفت و پاکدامنی چاہے گا اللہ اسے عطا کرے گا۔ یہاں عفت کے دو مقامیں مراد یہی گئے ہیں: ایک یہ کہ ایک شخص حاجت مند تو ہو لیکن خودداری، عزت نفس اور حیا کی وجہ سے کسی کے سامنے دست سوال و رزانہ کرے اور اسے اپنے وقار کے منافی تصور کرے تو اگر وہ اللہ سے یہ دعا کرے اور توفیق طلب کرے کہ اسے دست سوال و رزانہ کرنا پڑے اور قدرتِ الہی سے اُس کی کفالت اور روزگار کا باعزت و باوقار ذریعہ نکل آئے، تو اللہ کی رحمت سے امید و ا Quartz ہے کہ اللہ اُس کی مراد پوری فرمائے گا۔

استغناء سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ سے یہ دعا مانگئے کہ وہ اسے خلق کا محتاج نہ کرے، اس پر وسائل رزق کشادہ فرمادے تاکہ احتیاج باقی نہ رہے، تو اللہ یقیناً اسے غنی فرمائے گا، بشرطیکہ اللہ کی قدرت و عطا اور رحمت و سخا پر اس کا ایمان کامل ہو۔

حدیث نمبر: 10

اللہ کی راہ میں پسندیدہ چیزوں نہیں

”عَنْ أَنَسِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ أَبُو طَلْحَةَ أَكْثَرُ الْأَنْصَارِ بِالْمَدِينَةِ مَالًا مِنْ نَخْلٍ، وَكَانَ أَحَبُّ أَمْوَالِهِ إِلَيْهِ بَيْرُحَاءَ، وَكَانَتْ مُسْتَقْبِلَةُ الْمَسْجِدِ، وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَذْكُرُهَا وَيَسْهُبُ مِنْ مَاءِ فِيهَا طَيْبٌ، قَالَ أَنَسٌ: فَلَمَّا أُنْزِلَتْ هُذِهِ الْآيَةُ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (آل عمران: 92) قَاتَمْ أَبُو طَلْحَةَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى يَقُولُ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ، وَإِنَّ أَحَبَّ أَمْوَالِ إِلَيْهِ بَيْرُحَاءَ، فَإِنَّهَا حَدَّقَةٌ لِلَّهِ، أَرْجُو بِرَبِّهِ وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللَّهِ، فَسَعَاهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ حَيْثُ أَرَاكَ اللَّهُ، قَالَ: فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: بَيْخُ، ذَلِكَ مَا لَكَ رَابِّكُمْ، ذَلِكَ مَا لَكَ رَابِّكُمْ، وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ، وَإِنِّي أَرَى أَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْأَقْرَبَيْنَ، فَقَالَ أَبُو طَلْحَةَ: أَفْعَلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ، فَقَسَمَهَا أَبُو طَلْحَةَ فِي أَقْرَبِيْهِ وَبَيْنِ عَيْهِ ”۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
رَابِّخ	نفع بخش	كھجور (کے باغات)	تَخْلُنْ
بَيْخ	شabaش، مرحبا، آفرین	اِيك کنوئیں کا نام	بَيْدَحَاءُ
أَقَارِبٌ	رشته دار	عَمَدَه، پاک	طَيْبٌ
إِثْيَ آرَذِي	میں سمجھتا ہوں یا چاہتا ہوں	تم نیکی کو ہرگز نہ پاؤ گے	لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ
أَحَبٌ	محبوب ترین	میں امید کرتا ہوں	أَرْجُوا
ضَعْهَا	اسے رکھ لیجیے	مسجد کے سامنے	مُسْتَقْبِلَةُ التَّسْجِيدِ
قَسْمَهَا	انہوں نے اسے بانٹ دیا	اُتری	نَزَكَتُ
بَنْتِي عَيْمَ	چچازاد	جو تم پسند کرتے ہو	مِئَاثِحِبُونَ
		نیکی، اجر	بِرْ

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ انصار مدینہ میں سب سے زیادہ مالدار تھے، ان کے کھجوروں کے باغات تھے اور اپنے مال میں سے انہیں ”بَيْدَحَاءُ“ نامی کتوال اور باغ سب سے زیادہ پسند تھا اور وہ مسجد نبوی کے سامنے تھا۔ رسول اکرم ﷺ وہاں تشریف لے جاتے تھے اور اس کا عمدہ میٹھا پانی نوش فرمایا کرتے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی: ”لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى شُفَقُوا إِمَائِحِبُونَ“، (ترجمہ): جب تک تم اپنی محبوب چیز کو راہ خدا میں خرچ نہیں کرو گے، تم خیر کامل کو نہیں پاسکتے، (آل عمران: 92) تو حضرت ابو طلحہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کھڑے ہو گئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: ”جب تک تم اپنا محبوب چیز کو راہ خدا میں خرچ نہیں کرو گے، تم خیر کامل کو نہیں پاسکتے“ اور میرے نزدیک میرا محبوب ترین مال ”بَيْدَحَاءُ“ کا باغ ہے اور یہ اللہ کے نام پر صدقہ ہے، میں اس کی نیکی اور اجر آخرت کی امید کرتا ہوں، یا رسول اللہ ﷺ! آپ اپنی صوابیدیں کے مطابق جیسے اور جہاں مناسب سمجھیں، اسے استعمال میں لا سکیں، تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

شabaش! آفرین! نفع بخش مال ہے، یہ نفع بخش مال ہے اور جو کچھ تم نے کہا، میں نے من لیا ہے اور میں مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ تم اسے اپنے قرابت داروں کو عطا کر دو، ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ایسا ہی کروں گا، پھر ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے قرابت داروں اور پیچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا، (بخاری: 1461)“

تشریح:

اس حدیث پاک میں چند امور توجہ طلب ہیں: ایک صحابہ کرام کا طرز عمل، دوم یہ کہ اتفاق فی سبیل اللہ کی بہترین صورت کیا ہے، سوم یہ کہ اتفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف کیا ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرام قرآن مجید میں نازل کیے گئے احکام پر دل کی گہرائیوں سے عمل کرتے تھے اور پوری جامعیت اور معنویت کے ساتھ انہیں قبول کرتے تھے۔ دوسری بات جو قرآن کے حوالے سے معلوم ہوئی ہے، وہ یہ کہ اگر اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنا ہے تو اس کی پوری قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر تم خالق کائنات اور محبوب خدا کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی سب سے قیمتی، سب سے پیاری اور سب سے عزیز متعال کو اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں قربان کر دو، اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو تمہارا دعواۓ محبت بے جان اور کھوکھلا ہے، ظاہر ہے جو اپنی محبوب مال اللہ کے لیے نہ دے سکے، وہ جان عزیز کا نذر انہ پیش کرنے کی جرأت و ہمت کہاں کر سکے گا، اس لیے مومن ہر وقت اللہ کی راہ میں اپنی محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اپنی سب سے قیمتی متعال یعنی جان کو بھی اللہ کی راہ میں قربان کرنے سے دربغ نہیں کرتا، بلکہ جان قربان کرنے پر بھی کہتا ہے، بقول شاعر:

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تیسرا بات یہ تعلیم فرمائی گئی کہ ہر طرح کے انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات کے اولین مستحق کسی شخص کے قریب ترین عزیز و رشته دار ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ شرعاً مستحق ہوں اور صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ انسان کا فیض بیرونی حلقوں میں تو خاری و ساری رہے اور ”چراغ تلے اندر ہرا“ کے مصدق اس کے قریبی رشتہ دار محروم ہوں اور جیسا کہ گزشتہ حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ قرابت داروں پر خرچ کرنا دو ہرے اجر کا باعث ہے، ایک اجر صدقہ و خیرات کا اور دوسرا صدھ رحمی کا جو اپنی جگہ ایک مستقل نیکی ہے۔ اس عمل سے جہاں اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے وہاں ایک مضبوط خاندانی رشتہ کی بنیاد پڑ جاتی ہے انسان جب ترقی کرتا ہے، تو سب سے پہلے اس کی مخالفت رشتہ دار کرتے ہیں اور سب سے زیادہ حسد یہی لوگ کرتے ہیں، لیکن جب کوئی اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرتا ہے، ان کی ضروریات کا خیال کرتا ہے تو وہی رشتہ دار ان کی دفاع میں کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے دست و بازو بن جاتے ہیں اور اس سے خاندانی نظام مضبوط ہو جاتا ہے۔

چوتھی بات جو اس حدیث سے معلوم ہوئی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کے اموال سے بے غرض ہونا ہے کہ حضرت ابو طلحہ نے دریادی کا ثبوت دیا اور اپنے مال کا سارا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول نہیں کیا اور فرمایا: یہ تم اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نفسی معلوم ہوئی اور ہر قائد، رہنماء اور بڑے کو اس طرح لوگوں کے اموال سے مستغفی اور سیر چشم ہونا چاہیے۔

حدیث نمبر: 11

حلال و حرام واضح ہیں

”عَنِ الْعُمَّانَ بْنَ بَشِيرٍ، يَقُولُ: سَيَعْتَرُّ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: الْحَلَالُ بَيْنَ الْحَرَامِ وَبَيْنَهُمَا مُسْبَهَاهٌ، لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الْمُسْبَهَاهَ إِسْتَبَدَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الْمُسْبَهَاهِ كَرَاعٍ يَرْعَى حَوْلَ الْحِنْيِ، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ، أَلَا وَإِنْ لِكُلِّ مَلِيكٍ حِنْيٌ، أَلَا إِنَّ حِنْيَ اللَّهِ فِي أَرْضِهِ مَحَارِمٌ، أَلَا وَإِنِّي فِي الْجَسَدِ“

مُضْغَةٌ إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقُلُبُ،

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
بَيْنَتْ	واضح	مُشْتَبَهَاتْ	مشتبه چیزیں، جن کا حکم واضح نہ ہو۔
لَا يَعْلَمُهُنَّ	نہیں جانتے	إِئْتَقْ	بچا
إِسْتَبَرَأَ	اُس نے بچالیا	عَرَاضْ	عزت و آبرو
وَقَعَ	پڑ گیا	رَاعِ	چرواہا
يَرْتَعُ فِيهِ	اس میں چرنے لگے	الْحِلْنِي	چراگاہ یا منوع جگہ
مَحَارِمْ	حرام امنور	مُضْغَةٌ	گوشت کا لوقہ
صَلَحَتْ	ٹھیک ہو گیا، درست ہو گیا	فَسَدَتْ	بگڑ گیا

ترجمہ: ”نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: میں نے مسیح علیہ السلام کو ارشاد فرماتے ہوئے سن: حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص شبہات سے بچا رہا اُس نے اپنے دین اور آبرو کو بچالیا اور جو شخص شبہات میں پڑ گیا وہ اس چرواہے کی طرح ہے جو شاہی چراگاہ کے ارد گرد اپنے مولیشی چرائے، قریب ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائیں گے۔ خبردار! ہر بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ ہوتی ہے، سنو! اس زمین میں اللہ کی مخصوص چراگاہ اس کے حرام کیے ہوئے کام ہیں، سنو! جسم میں گوشت کا ایک لوقہ ہے، جب وہ ٹھیک ہو تو سارا بدن ٹھیک رہتا ہے اور جب اس میں فساد ہو تو پورا جسم فاسد ہو جاتا ہے، سنو! وہ دل ہے۔

(بخاری: 56)

تعریف:

اس حدیث پاک میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ امور اور اشیاء جن سے انسان کوشب و روز واسطہ پڑتا ہے، ان میں بعض صریح طور پر حلال ہیں اور بعض واضح اور قطعی طور پر حرام ہیں۔

جو امور اور اشیاء قطعی طور پر حرام ہیں، ان کے بارے میں کوئی شخص دھوکا نہیں کھا سکتا۔
سوائے اس کے کہ وہ اپنی مرضی سے ہلاکت اور تباہی کا راستہ اختیار کرے، لیکن حلال
اور حرام کے درمیان بعض مشکوک اور مشتبہ امور ہیں، مسلمانوں کو چاہیے کہ ان سے دور رہیں
اسی مفہوم کو ایک اور حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”دَعْ مَا تَرِبِّيْكَ إِلَى مَا لَا تَرِبِّيْكَ“۔

ترجمہ: ”مشکوک چیزوں کو چھوڑ کر غیر مشکوک اور قطعی چیزوں کو انتخاب کرو، (ترمذی: 2518)۔“
حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے آپ سے پوچھا: اگر میں اپنے شکاری کئے
کو بھجوں اور جب وہ شکار کر لائے اور اس کے ساتھ ایک اور کتابھی ہو اور مجھے پتانہ ہو کہ ان
میں سے کس نے شکار کیا ہے، آپ ملئیں نہیں نے فرمایا: اس کو مت کھاؤ اور نبی ملئیں نہیں نے
راستے میں گری ہوئی ایک کھجور کو دیکھ کر فرمایا: اگر مجھے اس کے صدقہ ہونے کا خدشہ ہوتا تو
میں اس کھجور کو کھالیتا، (شرح صحیح مسلم: ج 4، ص 412) اور ان دونوں امور کو مشتبہ ہونے کی
وجہ سے اختیار نہیں کیا گیا۔

ان ارشادات کا مقصد و مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو نہ صرف یہ کہ حرام اور
نا جائز امور سے اجتناب کرنا چاہیے، بلکہ ایسے امور اور اشیاء سے بھی اجتناب کرنا چاہیے
جس میں خیر کے مقابلے میں شر کا پہلو غالب ہو، کیونکہ اس طرح آدمی آخر کار حرام اور ناجائز
میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ قرآن و حدیث کا منوعات سے روکنے کا بلیغ انداز ہے، چنانچہ جب
حضرت آدم و حوا کو ایک مخصوص درخت کا پھل کھانے سے روکا جا رہا تھا تو یہ نہیں فرمایا: ”اس
درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، بلکہ یہ فرمایا: ”اس درخت کے قریب تک نہ جاؤ“۔

اس مفہوم کو ایک سی مثال سے مزید واضح فرمایا: فرض کیجیے! ایک باغ یا کھیت یا چراغ
ہے، جس کا پھل کھانا یا فصل کا ثانیا یا اس میں مال مویشی چرانا اس کے مالک نے منوع قرار
دے رکھا ہے، اب اگر کوئی چرد وہا اپنے مویشی اس منوع چراغ کے ارڈر گرد یا اس کے قریب
وجوار میں چاہتا ہے، تو اس کے لیے اس بات کا خطرہ ہر وقت رہتا ہے کہ اس کے مویشی کسی

وقت باڑ کو پچلا نگ کر چڑا گا، میں داخل ہو جائیں اور اسے تباہ کر دیں، جس طرح ہر بادشاہ کی کچھ معینہ حدود ہوتی ہیں، کچھ امور ممنوع ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح احکم الحاکین کی بھی معینہ حدود ہیں اور اللہ کی مقررہ حدود را اصل اس کے محظاٹ ہیں، لہذا جو اس کے محظاٹ کی حدود میں داخل ہو گا، وہ اس کا با غی قرار پائے گا اور سزا کا مستحق ہو گا۔

حدیث پاک کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "انسان کی جسمانی بقا کا انحصار گوشت۔ کرایک لوحتڑے پر ہے، اگر انسانی جسم کا یہ مرکزی پرزو ٹھیک ٹھاک کام کرتا رہے تو پورا جسمانی نظام ٹھیک ٹھاک کام کرتا رہے گا اور اگر اس پرزو میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو پورا جسمانی نظام بگڑ جاتا ہے، پھر آپ نے فرمایا "یدل ہے"۔

صحت جسمانی اور حیاتِ انسانی کے لیے قلب انسانی کا جسمانی طور پر ٹھیک ہونا ضروری ہے اور صحت ایمانی و روحانی کے لیے اس کا روحانی طور پر صحیح ہونا ضروری ہے۔ جس طرح اسے جسمانی امراض لاحق ہوتے ہیں اسی طرح اسے روحانی اخلاقی امراض بھی لاحق ہوتے ہیں۔ یہ بات علماء کے نزدیک مختلف فیہ ہے کہ عقل کا محل دل ہے یادِ ماغ، قرآن جہاں دل کا محل عقل قرار دیتا ہے، وہاں اس سے مرادِ ماغ ہی ہے، دل کی درستی اور فساد سے مراد سوچ و فکر کی درستی ہے، انسان کی فکر اگر راستی پر مبنی ہے تو اس کے جسم کا پورا نظام اس کے تابع ہوتا ہے اور جسم راستی اور صلحیت کے اعمال و افعال انجام دیتا ہے، اسی طرح اگر سوچ و فکر فساد پر مبنی ہے تو پورا جسم فساد کے اعمال و افعال انجام دیتا ہے۔

ایک اصطلاح "تصفیہ قلب" یعنی دل کی صفائی ہے، جس سے مراد ہر قسم کی برائیوں سے اپنے دل و ماغ اور سوچ و فکر کو پاک کرنا ہے اور اسے روحانی بیماریوں سے بچانا ہے چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے نفاق کو دل کا مرض قرار دیا ہے، قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

"فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ"، ترجمہ: "ان کے دلوں میں بیماری ہے، (البقرہ: 10)"۔

بعض مقامات پر قلب کے اس روحانی مرض کو "قادوت" یعنی سندلی سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ کفار کے قلوب کے بارے میں ارشاد فرمایا:

”فِهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً“

ترجمہ: ”ان کے دل پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت ہیں، (البقرۃ: 74)۔“
اور قاوت قلبی سے مراد قلب کی وہ کیفیت ہے کہ وہ خیر کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو، خیر
کے تمام سوتے جو قلب انسانی سے پھوٹتے ہیں، خشک ہو جائیں۔

حدیث نمبر: 12

نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے

”عَنِ النَّوَاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: سَأَلَتْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِرِّ وَالْإِثْمِ، فَقَالَ: الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْإِثْمُ مَا حَالَكَ فِي صَدْرِكَ، وَكَرِهْتَ أَنْ يَطْلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ“۔

المعانی	اللفاظ	المعانی	اللفاظ
گناہ	إِثْمٌ	نیکی	الْبِرُّ
جو کھلکھلے	مَاحَاكَ	توناپسند کرے	كَرِهْتَ
		حُسْنُ الْخُلُقِ	اچھے اخلاق

ترجمہ: ”حضرت نواس بن سمعان سے روایت ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھلکھلے اور تجھے یہ بات ناپسند ہو
کے لوگوں کو (تمہاری اس کمزوری کا) پتا چل جائے، (مسلم: 2553)۔“

حدیث نمبر: 13

نیکی اور بدی کی ظاہری کیفیت

”عَنْ وَابِي الصَّفَةِ بْنِ مَعْبُدَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: جِئْتَ تَسْأَلِنِي عَنِ الْبِرِّ، قُلْتُ: نَعَمْ، فَقَالَ: إِسْتَفْتَ قَلْبَكَ، الْبِرُّ مَا أطْهَانَتِ إِلَيْهِ النَّفْسُ وَتُرِدُّدِي الصَّدْرِ وَإِنِ افْتَأَكَ النَّاسُ وَافْتَؤُكَ“۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
آئیتُ	میں آیا	جِئٹَ	تو آیا
إِسْتَفْتَهٌ	پوچھ	إِطْمَانٌ	مطمئن ہو
تُرَدَّدُ	کھٹلے، تردہو	إِفْتَاكَ النَّاسِ	لوگ تجھے فتویٰ دیں

ترجمہ: ”وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: کہتے ہیں کہ میں رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نیکی کے بارے میں پوچھنے آئے ہو، میں نے عرض کی! جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے دل سے پوچھو، نیکی وہ ہے جس پر انسان کافس اور دل مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور انسان تردد میں بتلا ہو جائے، اگرچہ لوگ تجھے فتویٰ دیں اور تجھے فتویٰ دیں، (یہ مند احمد اور مندداری کی روایت ہے)۔

حدیث کے حوالہ جات: (مند احمد: 18006، سنن دارمی: 2729)

تشریح:

ندرجہ بالادنوں حدیثوں کا مفہوم اور مرکزی خیال ایک ہی ہے، پہلی حدیث میں اختصار ہے اور دوسری میں قدرے تفصیل ہے، ان دونوں کی تشریح ایک ساتھ کی جاتی ہے۔ اسلام دین فطرت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات فطرتِ انسانی کے بالکل مطابق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں خیر اور شر کے لیے دو جامع اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں اور اسلام کی تمام تعلیمات اور حیات انسانی کے تمام معاملات کو ان دو جامع الفاظ میں سودا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن نے خیر کو ”معروف“ سے تعبیر کیا ہے اور شر کو ”منکر“ سے۔ معروف کے معنی ہیں: جانا پہچانا، جس سے انسان مانوس ہو، آشنا ہو اور منکر کے معنی ہیں: ”نا آشنا، اجنبی“ جس سے انسان کے دل میں نفرت پیدا ہو۔ گویا اسلام یہ بتانا

چاہتا ہے کہ خیر اور نیکی اس چیز کا نام ہے جو انسان کی فطرت سلیم کے لیے جانی پہچانی ہو۔ فطرت انسانی اس سے آشنا ہوا اور شروع ہے جس سے انسانی فطرت نفرت کرے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اسلام نے فطرت انسانی کو خیر و شر کے لیے میزان، معیار اور کسوٹی قرار دیا ہے۔ اب رہا سوال یہ کہ انسانی وجود اور شخصیت میں فطرت سلیم کا یہ مظہر اور خیر و شر کی کسوٹی کون سی چیز ہے۔ قرآن نے اسے ”نفس“ سے تعبیر کیا ہے اور نفس انسانی کے تین رخ، تین رجحانات اور تین نام بتائے ہیں:

نفس اتارہ:

جو انسان کو شر کی طرف مائل کرتا ہے، جو میلانات شر کو قبول کرتا ہے، جو انسانی وجود میں گویا شیطانی نمائندہ ہے، اسی لیے اصطلاح تصوف میں اسے ”لہٰ شیطان“ بھی کہتے ہیں۔

نفسِ لَوْاْمَةٍ:

جو انسان کو خیر کی طرف مائل کرتا ہے، جو میلانات خیر کو قبول کرتا ہے، جو انسانی وجود میں گویا حُسن کا نمائندہ ہے، اسی لیے اصطلاح تصوف میں اسے ”لہٰ رحمن“ کہتے ہیں، اسے اردو میں ضمیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انگریزی میں (CONSCIENCE) سے۔ اگر خوانخواستہ بشری تقاضے کے تحت انسان سے خطاب ہو جائے اور گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو نفس انسانی کا یہ جذبہ (ضمیر) اسے ملامت کرتا ہے، برائی دل میں ہٹکتی رہتی ہے، چبھن اور ندامت سی محسوس ہوتی ہے، تا وقتیکہ انسان تو بے کر کے اس کا ازالۃ نہ کر لے۔ گویا انسان کے دل و دماغ میں ضمیر قدرت کی طرف سے ایک چوکیدار اور محافظ کا کردار ادا کرتا رہتا ہے، اگر کہیں وہ دیکھتا ہے کہ انسان کی غفلت، کوتاہی یا نادانی سے اس کی دولت ایمان و عمل ک رہی ہے تو یہ اندر ہی اندر سے انسان کو بیدار کرتا ہے، متنبہ کرتا ہے، اسے چین نہیں آتا تا وقتیکہ انسان اپنی غلطی کا ازالۃ نہ کر لے۔

اسی لیے حضور ﷺ نے اسے نہ صرف عمل خیر اور عمل شر کی کسوٹی قرار دیا ہے، بلکہ یہ ایمان کی بھی کسوٹی ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا:

”إِذَا سَرَّتُكَ حَسَنَتُكَ، وَسَاءَتُكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ“۔

ترجمہ: ”جب تم میں تمہاری نیکی بھلائی معلوم ہو اور تمہیں اپنی براہی دل میں بڑی معلوم ہوتا سمجھو کہ تم مومن ہو، (منداحمد: 22166)۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی فرمایا ہے:
”فَالْهَمَّ هَا فِجُورًا هَا وَتَقْوِيَّهَا“۔

ترجمہ: ”اس نے ہر نفس انسانی کو اس کی نیکی اور بدی الہام کر دیے، (الشمس: 8)“۔ یعنی اسے نیک و بد کی تمیز عطا کر دی ہے۔

اس لیے اسے اپنے ایمان اور خیر کا اگر جائزہ لینا ہے تو کسی عدالت سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں، کسی مفتی سے فتوی طلب کرنے کی ضرورت نہیں، بس اپنے ضمیر کو جنگ بنائے اپنے آپ کو ضمیر کی عدالت میں پیش کر کے معلوم کرے کہ اس کا فیصلہ کیا ہے، وہ خود تمہیں بتا دے گا کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ تم نے کیا گناہ یا اور کیا کمایا، کیا کھو یا اور کیا پایا۔ ایک اور پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے: اپنے جس عمل اور ارادے کو تم اخلاقی جرأت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے کتراؤ، بلکہ چھپاتے پھر وہ بس سمجھ لوکہ وہ گناہ ہے۔

مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ضمیر زندہ ہو۔ انسان میں ایمان کی کچھ حرارت باقی ہو۔ ایمان کی چنگاری بھلے دب گئی ہو، لیکن بالکل بجھنہ گئی ہو، کیونکہ اگر یہ چنگاری ابھی باقی ہے اور سلگ رہی ہے تو امید قطعی ہے کہ کسی بھی وقت رحمت الہی کے ایک جھونکے سے شعلہ جوالہ بن سکتی ہے، جس کی تپیش سے نفس انسانی میں موجود باطل کی تمام آلاتیں جل کر خاکستر ہو جائیں گی۔

اگر خدا نخواستہ یہ چنگاری بجھنی ہے، ضمیر انسانی مر چکا ہے، خیر و شر کی تمیز مٹ چکی ہے تو پھر اپنے ایمان کی بھی خیر منایے اور عمل کی بھی، ایسے ہی لوگوں کے لیے اقبال نے کہا ہے:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاد جاتا رہا

نفسِ مطمئنة:

اگر بفضلِ خداوندی انسانی قلب سے تمام شیطانی تقاضے مت جائیں اور فنا ہو جائیں، صرف اور صرف ایمان کے تقاضے اس میں پورش پار رہے ہوں۔ انسانی ضمیر تمام شیطانی جذبات پر مکمل طور پر غالب آچکا ہو۔ شیطان ایسے فرشتہ خصلت افراد سے مایوس ہو جاتا ہے، یہ اللہ کے ”عبدِ مخلصین“ ہوتے ہیں اور ان کی فکر اور سوچ اپنے خالق کی مشیت کے ساتھ میں داخل چکی ہوتی ہے، یہ اللہ کے انبیاء، صدیقین، شہداء و اولیاء اور ان کے تبعین کا گروہ ہے، جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

حدیث نمبر: 14

مغلکوں اور مشتبیہ امور سے دوری کی تعلیم

”عَنْ الْحَسَنِ أَبْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ مَا يَرِبُّكَ إِلَى مَا لَا يَرِبُّكَ، رواة الترمذی، وقال: حدیث حسن صحيح، معناه: أُتُرُكَ مَا تَشْكُ فِيهِ“۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
حَفِظْتُ	میں نے یاد کیا	دَعَ	چھوڑ دے
أُتُرُكَ	جو تجھے شک و شبہ میں ڈالے	أُتُرُكَ	چھوڑ دے

ترجمہ: ”حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: انہوں نے کہا: میں نے رسول اکرم ﷺ سے یاد کیا ہے کہ جو چیز تجھے شک و شبہ میں ڈال دے، اسے چھوڑ دو اور جس چیز

میں شک و شبہ نہ ہو، اس کو اختیار کرو۔“ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں تجھے شک ہو، اُسے چھوڑ دو اور جس چیز کے بارے میں تمہیں شک نہ ہو اُسے اختیار کرو۔

حدیث کے حوالہ جات: (ترمذی: 2518)

تشریح:

اس حدیث کا مفہوم وہی ہے جو گزشتہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے، یہ امام ترمذی کی روایت ہے اور انہوں نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے اور اس کے مفہوم کی وضاحت بھی فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کی حیثیت واضح نہ ہو، ان کے حلال و حرام ہونے میں شک و شبہ ہو تو ان کی تحقیق و جستجو میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ان امور کو اختیار کرو جن کے حلال اور جائز ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو اور اس میں بھی جو حکمت پیش نظر ہے، وہ یہی ہے کہ مشکوک اور مشتبہ امور دراصل مجرمات کی حدود میں داخل ہونے کا راستہ ہیں۔ لہذا جو مشتبہ امور میں پڑا اس کی گمراہی اور راہ راست سے بجنکنے کا خدشہ ہر وقت رہتا ہے اور دین کے تمام احکام ظاہر ہیں اور ہر چیز کی وضاحت موجود ہے۔

بعض اوقات کسی امر کے بارے میں اشتباہ ہو جاتا ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام تو یہ ہمارے علم کے اعتبار سے اشتباہ ہوتا ہے، فی نفسہ وہ امور مشتبہ نہیں ہوتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا حکم بیان فرمادیا ہے، لیکن ایک بیان جلی ہے جس کو ہر کوئی جانتا ہے اور ایک بیان ختمی ہے جس کو صرف علماء ہی اجتہاد اور استنباط کے طریقوں سے جانتے ہیں، اس حدیث مبارک کا دوسرا حصہ ہے:

”قِيَّالصِّدْقَ طَهَانِيَّةُ، وَقِيَّالكَنْبَرِيَّةُ“

یعنی سچائی میں اطمینان ہے اور جھوٹ میں شک ہے، یعنی جو حلال امور ہیں اس سے انسان شک میں بدلنا نہیں ہوتا، بلکہ شک میں ڈالنے والی چیزیں وہ ہیں جو حرام ہیں۔

حدیث نمبر: 15

تواضع اور انکسار کی فضیلت

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدَ ابْعَفَهُ لِأَعْزَّهُ، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ“۔

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
درگزر	عَفْوٌ	کمی نہیں کرتا	مَانَقَصَتْ
اللہ سے بلندی عطا کرتا ہے	عاجزی کی، انکسار کیا	رَفَعَهُ اللَّهُ	تَوَاضَعَ

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صدقہ سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی اور (اللہ سے) معافی طلب کرنے سے اللہ بندے کی عزت بڑھاتا ہے اور جو اللہ کے آگے عاجزی کرتا ہے اللہ سے (دنیا والوں کے سامنے) سر بلند فرماتا ہے۔“

حدیث کے حوالہ جات: (رواہ مسلم: 2588)

حدیث نمبر: 16

تواضع اور انکسار کی عملی مثال

”عَنْ أَبِي رِفَاعَةَ تَبِيمَ بْنِ أَسِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: اتَّهَمَتُ إِلَيْهِ أَنَّهُ يَخْطُبُ، قَالَ: فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ رَجُلٌ غَرِيبٌ، جَاءَ يَسْأَلُ عَنْ دِينِهِ، لَا يَدْرِي مَا دِينُهُ، قَالَ: فَأَقْبَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَرَكَ خُطْبَتَهُ حَتَّى اتَّهَمَ إِلَيَّ، فَأَنْبَأَنِي بِكُرْبَوْنَيْ، حَسِبْتُ قَوَائِمَهُ حَدِيدًا، قَالَ: فَقَعَدَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعَلَ يُعْلَمُنِي مِنَاعَلَهُ اللَّهُ، ثُمَّ أَقْتَلَ خُطْبَتَهُ، فَأَتَمَّ آخِرَهَا“۔

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
وہ خطبہ دے رہے تھے	يَخْطُبُ	میں پہنچا	إِتَّهَمَتْ

اپنے دین کے بارے میں	عَنْ دِيْنِهِ	اجنبی، مسافر	غَرَبِیٌّ
متوجہ ہوئے	أَتُبْلَ	وہ نہیں جانتا	لَا يَدْرِي
کری لائی گئی	أُنْ بِكُنْسِيٍّ	مجھ تک پہنچے	إِشْهَى إِلَّا
پورا کیا	أَتَمَّ	پس وہ بیٹھ گئے	فَقَعَدَ

ترجمہ: ”حضرت رفاعہ تمیم بن اسید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: کہتے ہیں کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایسے وقت پہنچا کہ آپ خطبہ ارشاد فرماتے ہیں تھے، میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ایک اجنبی شخص آیا ہے اور دین کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے، وہ اپنے دین کے بارے میں کچھ جانتا نہیں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہوئے، آپ نے خطبہ چھوڑا اور (منبر سے اتر کر) میرے پاس چلے آئے، پھر ایک کری لائی گئی اور آپ اس پر تشریف فرماتے ہیں اور مجھے احکامِ دین تعلیم فرمانے لگے جو اللہ نے آپ کو تعلیم فرمائے تھے۔ پھر آپ خطبے کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے مکمل کیا۔

حدیث کے حوالہ جات: (مسلم: 876)

تشریح:

مندرجہ بالا دونوں احادیث میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے ”تواضع اور انکسار“ کی تعلیم، پہلی حدیث میں حضور کی زبانی تعلیم کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں انتہائی تواضع اور انکسار پر مبنی آپ کے عملِ مبارک کا ذکر ہے، لہذا ان دونوں حدیثوں کی تشریح قدرےوضاحت سے کی جاتی ہے۔

پہلی حدیث کا اولین حصہ ”صدقة“ متعلق ہے۔ بعض لوگوں کو شیطان یا نفس امارہ یہ بات سمجھاتا رہتا ہے کہ زکوٰۃ، فطرہ، عشر یاد یگرنفلی مالی صدقات سے انسان کا مال کم ہو جاتا ہے، لہذا کنجوی، بخل اور امساک سے کام لیتے ہیں اور اللہ کی راہ میں پیسے خرچ کرنے سے کتراتے ہیں اور طرح طرح کے حیلے بہانوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ اس حدیث

میں رسول اکرم ﷺ نے ان کی غلط فہمی رفع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کے فضل سے اس میں برکت ہوتی ہے اور اضافہ ہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”يَسْأَلُونَكُمُ اللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّدَقَاتِ“۔

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ سو دو کو مٹا تا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، (البقرہ: 276)“۔

یہی وجہ ہے کہ لفظ ”زکوٰۃ“ کے معنی پاکیزگی، نشوونما اور اضافے (GROWTH) کے ہیں، جس سے یہ کنایہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مال پاک ہو جاتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مال میں اللہ کی قدرت سے برکت پیدا ہوتی ہے۔ یہ برکت یا اضافہ خاص مادی اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے سے دنیا میں مال میں زیادتی اور اضافہ کرتا ہے اور اجر و ثواب کے اعتبار سے بھی کہ صدقہ کرنے سے دنیا میں جو مال میں کمی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں آخرت میں اجر عطا فرمائے کر اس کی کو دور فرمادیتا ہے۔ یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو مال اللہ کی راہ میں دیا وہ ضائع ہوا، بلکہ درحقیقت وہی سب سے محفوظ مال ہے، کیونکہ وہ اللہ کی امانت اور تحفظ میں چلا جاتا ہے اور اللہ سے بڑا مین اور کوئی نہیں ہو سکتا، قرآن میں ارشاد باری ہے:

”وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأَتُوا الزَّكُوٰةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قُرْضاً حَسَنًاٰ وَمَا تُقْدِمُوا لَا تُنْفِسُكُمْ مِّنْ خَيْرٍٰ تَجْدُوْهُ كُمْ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌٰ وَأَعْظَمُ أَجْرًاٰ“۔

ترجمہ: ”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض حسنہ دو اور جو کچھ تم اپنے آگے خیر بھیجو گے (یعنی آخرت کے لیے)، تو تم اسے اللہ کے پاس خیر اور اجر و ثواب کے اعتبار سے نہایت عظیم پاؤ گے، (المزمول: 20)“۔

دوسری بات جو تعلیم فرمائی گئی، وہ یہ ہے بندے کے معاف کرنے سے اللہ اس کی عزت کو بڑھادیتا ہے، اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ جس شخص کا قصور معاف کیا جائے، اس کے دل میں معاف کرنے والے کی عزت بڑھ جاتی ہے، دسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کی آخرت میں عزت بڑھائے گا اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جو شخص

لوگوں کو معاف کرتا ہے، اس کی عزت انتقام لینے والے کی بہ نسبت زیادہ ہوتی اور لوگ ایسے شخص کی دل سے عزت کرتے ہیں، معاف کرنا ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ”وَلَيَعْفُوا وَلَيَصْفُحُوا إِلَّا تُحْمِلُونَ أَنْ يَعْفُرَ اللَّهُ لَكُمْ“۔

ترجمہ: ”ان کو چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگز رکر دیں، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کر دے اور اللہ بہت بخشنے والا بے خدر حرم فرمانے والا ہے، (النور: 22)۔“

یہ بھی تعلیم فرمائی کہ غیر اللہ کے سامنے جھکنا انسان اور انسانیت کی توہین ہے، تحقیر ہے اور تذلیل ہے۔ لیکن اللہ کے سامنے جھکنا، عبادت کی نیت سے اور گناہوں کی معافی کے لیے، توبہ کرنا، استغفار کرنا، اس کے رسول کی اطاعت و محبت میں سرستیم خم کرنا، تواضع و انکسار کرنا، اس میں بندے کی توہین نہیں، بلکہ تعظیم ہے۔ ذلت نہیں عزت ہے، جو بندہ اپنے رب کے سامنے جبین نیاز کو جھکاتا ہے، اللہ اسے عزت و عظمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ جو خالق کے سامنے سرگوں ہوتا ہے، اسے وہ خلق کے سامنے سر بلند فرماتا ہے اور بندگی کے تو معنی ہی خالق و معبود کے سامنے تواضع و انکسار، تذلل اور تضرع کے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے میرے رب نے دو امور میں ایک کو اپنانے کا اختیار دیا کہ میں چاہوں تو بندہ رسول بنوں یا بادشاہ نبی، پس میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کس کو اختیار کروں تو میں نے جبرائیل کی طرف سراٹھا کر دیکھا تو انہوں نے کہا: اپنے رب کے لیے تواضع اختیار کریں تو میں نے کہا: بندہ رسول، (احیاء علوم الدین: ج ۳، ص ۲۱۸)۔

اگلی حدیث میں حضور اکرم ﷺ کے طرزِ عمل سے مثال پیش کی گئی ہے اور یہ بتایا کہ اللہ کے رسول جو مسلمانوں کو ارشاد فرماتے تھے، ان کا اپنا عمل بھی اس کے مطابق ہوتا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہوتا۔

انسانی فطرت ہے کہ خطبہ اور خطاب کے وقت انسان کی طبیعت اپنی جوانی پر ہوتی ہے، وہ دوران تقریر مذاخلت کو اپنی توہین سمجھتا ہے اور اس پر اظہار ناراضی کرتا ہے، مگر اللہ کے رسول ﷺ کا طرزِ عمل دیکھو کہ ایک اجنبی شخص آتا ہے، تقریر کے دوران مذاخلت

کرتا ہے، حضور ﷺ اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی بجائے ممبر سے اُتر آتے ہیں۔ سلسلہ خطاب و تقریر روک لیتے ہیں اور اسے دینے میں سائل پورے سکون سے سمجھاتے ہیں اور اس کی پوری طرح تشفی کرنے کے بعد اپنا خطبہ تکمیل فرماتے ہیں۔

دنیا کے معمولی سے معمولی خطیب یا مقرر سے اتنے بڑے انکسار اور تواضع کی توقع نہیں کی جاسکتی، مگر سرورِ دو عالم ﷺ کا یہی حسن اخلاق و انکسار تھا جو سب کو آپ کا گرویدہ بنالیتا تھا، حالانکہ آپ جو خطبہ ارشاد فرمائے تھے وہ بھی امورِ دین سے متعلق تھا۔

آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ کسی دینی غرض سے سلسلہ خطاب روکنا اور کچھ دیر کے لیے موقوف کرنا جائز ہے اور اجنبی کو آپ نے یا صحابہؓ کرام میں سے کسی نے ڈانٹ ڈپٹ اس لیے نہیں فرمائی کہ وہ غالباً اس وقت تک آداب مجلس اور آداب بارگاہ نبوت سے ناواقف تھا اور آپ کے اخلاق کریمہ کی برکت سے وہ شرف صحابت سے مشرف ہوا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کو مشرف بہ اسلام کرنے یا ضروریاتِ دین کی تعلیم دینے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجلس میں حضور کی نشت گاہ ذرا ممتاز اسی لیے رکھی جاتی تھی تاکہ اجنبی افراد کو پہچاننے میں آسانی ہو اور اس طرح آپ کے جال ثار صحابہؓ کرام کی جذبہ عقیدت کی بھی تسلیم ہوتی تھی۔

حدیث نمبر: 17

حسن اخلاق کی فضیلت

”عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمِيرٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: لَمْ يَكُنْ الرَّئِيسُ مُتَفَقِّحًا، وَكَانَ يَقُولُ إِنَّ مِنْ خَيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا، تَفَقَّلْ سَلِيلٌ“۔

اللفاظ	معانی	اللفاظ	معانی
فَاجِش	فتح، بد اخلاق	لَمْ يَكُنْ	نہیں تھے
خِيَارُكُمْ	تم میں سے بہترین	مُتَفَقِّحًا	فخش گوئی اختیار کرنے والا

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن عمر و بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ

نہ تو گفتگو میں حد سے تجاوز فرماتے تھے اور نہ ہی بد کلامی فرماتے تھے اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔“
حدیث کے حوالہ جات: (بخاری: 3559)

شرح:

عربی زبان میں فحش اور فحاشہ کے معنی ہیں بُرا ہونا، فتح ہونا، اسی طرح فاحش کے معنی ہیں: فتح، بد اخلاق، بخیل اور حد سے تجاوز کرنے والا۔ یہ ایسا لفظ ہے کہ اخلاقی برا ہیوں کی تمام صورتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام منوعات محرمات اور منکرات کی ممانعت کے لیے ”يَنْهَا عَنِ الْفُحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ“ (النحل: 90) کے الفاظ آئے ہیں اور ان کے مقابل عدل، احسان اور ایتاء (جو سخاوت پر دلالت کرتا ہے) کے الفاظ ہیں۔ یعنی رسول کریم ﷺ شر اور بد اخلاقی کی تمام صورتوں سے اجتناب فرماتے تھے اور خیر اور حسن اخلاق کی تمام صورتیں مثلًا عدل و احسان، جود و سخا اور عرفت و حیا وغیرہ آپ میں موجود تھیں، جو آپ کی شخصیت کو باعزت، بارعب اور پروقار بناتی تھیں۔

چنانچہ آپ نے اس حدیث میں حسن اخلاق کو انسان کے لیے وجہ فضیلت قرار دیا ہے اخلاق خلق کی جمع ہے اور خلق اس ملکہ اور مہارت کو کہتے ہیں، جس سے افعال بغیر غور و فکر کے صادر ہوتے ہیں، یعنی یہ انسانی طبیعت اور جبلت کا حصہ بن جاتے ہیں اور بغیر کسی جبرا اور زبردستی کے ان کا صدور ہوتا ہے اور اخلاق کریمانہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت اور فطرت کا حصہ تھے اور ایک حدیث میں فرمایا:

”إِنَّمَا بُعْثِتُ لِأُتَّبِعَ مَكَارِمَ الْأُخْلَاقِ“۔

ترجمہ: ”میں مکار م اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں، (شرح النہ للبغوی: 3622)۔“

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

”إِنَّ أَقْرَبَكُمْ مِنِّي مَجِلِسَيَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحْسَنُكُمْ أَخْلَاقًا“۔

ترجمہ: ”تم میں سے قیامت میں میرے قریب ترین شخص وہ ہو گا، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، (مسند احمد: 7035)۔“

حدیث نمبر: 18

تقویٰ اور اچھے اخلاق کی اہمیت

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: سُلِّمَ رَسُولُ اللَّهِ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ، فَقَالَ: تَقْوَى اللَّهُ وَحْسُنُ الْخُلُقُ، وَسُلِّمَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ، فَقَالَ: الْفَمُ

وَالْفَرْجُ“، رواہ الترمذی و قال حدیث حسن صحیح

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
آگ، مراد دوزخ	آلنار	دریافت کیا گیا	سُلِّمَ
شرم گاہ	فرنج	منہ	فَم

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ سے ان امور کے بارے میں پوچھا گیا جو عام طور پر جنت میں داخل ہونے کا باعث بنے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کا تقویٰ اور حسن اخلاق“ اور آپ نے ان چیزوں کے بارے میں پوچھا گیا جو کثر جہنم میں داخلے کا باعث بنے ہیں، تو آپ نے فرمایا: ”منہ اور شرم گاہ“ یہ ترمذی کی روایت ہے اور انہوں نے اسے ”حسن صحیح“ قرار دیا ہے۔

تشریح:

اس حدیث میں بتایا گیا ہے: ”تقویٰ اور اچھے اخلاق“ انسان کو جنت میں لے جاتے ہیں اور ”منہ اور شرم گاہ“ انسان کو جہنم میں لے جانے کا باعث بنتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”مَنْ يَضْمَنْ لِمَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَصْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ“

ترجمہ: ”جو شخص مجھے ان دو چیزوں کی ضمانت دے دے جو اس کی دوداڑھوں کے درمیان ہے اور جو دوٹا گوں کے درمیان ہے (یعنی زبان اور شرم گاہ) تو میں اسے جنت کی ضمانت (GURARANTEE) دیتا ہوں، (بخاری: 6474)“

مومن کی زبان سے یا تو خیر کا کلمہ نکلے یا خاموش رہے، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَيَقُولْ خَيْرًا أَوْ لِيَصُمُّثْ“

ترجمہ: ”جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو وہ اچھی بات کرے یا خاموش رہے، (بخاری: 6018)۔

انسان جو کچھ بھی بولتا ہے، فرشتے اس کو لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ“

ترجمہ: ”وہ جو بات بھی کہتا ہے (اس کو لکھنے کے لیے) اس کا محافظ (فرشتہ) منتظر رہتا ہے، (ق: 18)۔

اور شرم گاہ اگر قابو میں نہ رہے تو بندہ جہنم کا مستحق ہو جات ہے مونین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بدکاری نہیں کرتے اور شرم گاہ اگر قابو میں نہ رہے تو بندہ جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

”وَلَا يَزَّرُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَاماً“

ترجمہ: ”اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو ایسے کام کرے گا وہ اپنے گناہوں کی سزا پائے گا، (سورہ الفرقان: 68)۔

دراصل خیر و شر کے محرکات اور عوامل انسان کے ذہن اور دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں جو انسان کو کسی عمل خیر یا شر پر ابھارتے ہیں اور بر ایجھتہ کرتے ہیں اور دواعضاء یعنی زبان اور شرم گاہ ایسے آلات ہیں جو خیر اور شر کے بارے میں انسانی ذہن کے فیصلوں کو نافذ کرتے ہیں۔ لہذا اسلام چاہتا ہے کہ یہ دواعضاء بے لگام نہ ہوں۔ انہیں شریعت کی حدود و قیود کے دائرے میں رہتے ہیوئے نفس کے جذبات، تقاضوں، خواہشات اور شہوت کی تکمیل کرنی چاہیے ایسا نہ ہو کہ حلال و حرام کی تمیز ہی باقی نہ رہے۔

بہت سی ایسی بُرایاں ہیں جن کا صدرور ان دواعضاء سے ہوتا ہے مثلاً: جھوٹ،

شیبت، چغل خوری، بہتان تراشی، الزام تراشی، طعن و تشنج، جھوٹی پروپگنڈا بازی، افواہ سازی ظالما نہ احکام کا اجراء، بے حیائی، بدکاری، غیرہ۔ لہذا اگر مسلمان کی زبان اور شرم گاہ پر شریعت کا کنٹرول ہو جائے تو اس کے جنتی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا اور یہ بھی پیش نظر ہے کہ شہوتِ نفسانی کی تنگیل میں بے لگام ہو جانا اور حلال و حرام کی تمیز رو اندر کھنا انسانی خصلت نہیں بلکہ خالص حیوانی خصلت ہے۔

حدیث نمبر: 19

اچھے اخلاق کی اہمیت

”عَنْ جَابِرٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسَاتِكُمُ الْقِيَامَةِ أَحَسِنَكُمُ الْأَخْلَاقًا، وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي مَجْلِسَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ الْمُرْثَارُونَ وَالْمُتَسَدِّدُونَ وَالْمُتَفَيِّهُونَ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَدْ عَلِمْنَا الْمُرْثَارُونَ وَالْمُتَسَدِّدُونَ، فَهَا الْمُتَفَيِّهُونَ، قَالَ: الْمُتَكَبِّرُونَ، (رواہ الترمذی)“

حسن۔ (روای الترمذی عن عبد الله بن البارک رحمہ اللہ فی تفسیر حسن الخلقت)

قال حواطلاقة الوجه، وبذل المعرفة وکف الاذى)

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
محبوب ترین	أَحَبُّ	قریب ترین	أَقْرَبُ
اچھائی ناپسندیدہ	أَبْغَضُ	تم میں سے اچھے اخلاق والے	أَحْسَنَكُمُ الْأَخْلَاقًا
		سب سے زیادہ ذور	أَبْعَدُ

ترجمہ: ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بڑا ویسیت ہے: رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب اور قیامت کے روز مجھ سے قریب ترین نہست ہے“ وہ فائز ہو گا جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت اور قیامت کے روز مجھ سے بعیند ترین وہ لوگ ہوں گے جو ہر وقت بک بک

کرتے رہتے ہیں اور سمجھ اور اپنی فصاحت و بлагفت کے اظہار کے لیے منہ بنا بنا کر طویل گفتگو کرتے رہتے ہیں اور مُتَفَقِّهُوں ہیں۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! "مَرْثَازُونْ" اور "مُشَدِّدُوْنْ" کا مفہوم تو سمجھ لیا مگر یہ "مُتَفَقِّهُوںْ" کوں لوگ ہیں، آپ سے مُتَفَقِّهُوں نے فرمایا: یہ سمجھ لوگ ہیں۔ یہ ترمذی کی روایت۔ ہبھوں نے اسے "حسن" قرار دیا ہے۔ آگے چل کر امام نووی نے امام ترمذی کا قول نقل کیا ہے جس میں انہوں نے عبد اللہ بن المبارک سے روایت کی ہے کہ حسن اخلاق کے معنی ہیں، خدھہ پیشانی سے پیش آنا، نیک بر تاؤ اور ایذہ ارسانی سی گرینز کرنا۔ (ترمذی: 2018)۔

تشریح:

امام نووی نے اس حدیث میں تمدن مشکل (الناظم) کے معنی خود بیان فرمائے ہیں اور

۱۱: جیسے ہیں:

(۱) الْمُشَار: تکلف و تصنع کے ساتھ موبائل گفتگو کرنا، یعنی خود ہی بک بک کرتے رہنا اور دوسرا کرنے سننا۔

(۲) الْمُشَدِّدُونْ: سمجھنا اور غرور کے ساتھ منہ پھیلا کر اور با جمیں کھول کر باتیں کرنا اور بزرگم خویش اپنی فصاحت کے جو ہر دکھانا۔

(۳) مُتَفَقِّهُوںْ: منہ پھیلا کر باتیں کرنا، سمجھنا اور دوسروں پر اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے منہ بنا بنا کر محیب و غریب انداز سے باتیں کرنا۔

حسن اخلاق اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ بندوں کو عطا کرتا ہے۔ اس حدیث پاک میں رسول اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: جس شخص کے اخلاق اچھے ہوں گے وہ اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہو گا اور اسے آخرت میں حضور ﷺ کا قرب نصیب ہو گا جو ایک مومن کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے اور حسن اخلاق کے معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ خدھہ پیشانی سے پیش آنا اور ایذہ ارسانی سے گرینز کرنا حسن اخلاق ہے۔

اس کے برعکس بد اخلاق شخص اللہ اور اس کے رسول کے غضب کا فکار ہو گا اور قیامت میں وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ دور ہو گا اور اللہ کے پیارے جبیب اس سے نفرت کریں گے اور پھر بد اخلاقی کی علامات حضور نے بتلا کیں جن کی تشرع طور بالا میں بھی کی جا چکی ہے۔

حدیث نمبر: 20

اختیاری معاملات میں آسانی کو اختیار کرنا

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ : مَا خَيْرٌ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا أَكْحَذَ أَيْسَرَهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ إِثْنَا، فَإِنْ كَانَ إِثْنَا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ، وَمَا اسْتَقَمَ رَسُولُ اللَّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِنَفْسِهِ، إِلَّا أَنْ تُتَتَّهَكَ حُرْمَةُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، (متفق عليه)“۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
مَا خَيْرٌ	اختیار نہیں دیا گیا	أَمْرَيْنِ	دو معاملات
قَطْ	یہ بالعموم فعل منفی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں کبھی نہیں	أَيْسَرَا	آسان ترین
تُتَتَّهَكَ	بے عزتی کی جائے، آبروریزی کی جائے پاماں کیا جائے۔	مَا اسْتَقَمَ	انتقام نہیں لیا

ترجمہ: ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی بھی دو چیزوں میں اختیار دیا گیا، آپ نے آسان صورت کو اختیار فرمایا بشرطیکہ وہ باعث گناہ نہ ہو۔ ہاں البتہ اگر وہ گناہ ہوتی تو آپ تمام لوگوں سے بڑھ کر اس سے دوری اختیار فرماتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی بات میں اپنی ذات کی خاطر انتقام نہیں لیا، مگر جب اللہ تعالیٰ کی حرمت کو توڑ دیا جاتا تو آپ اللہ کے محترمات کے تقدس و احترام کو پاماں کرنے کے جم میں اکیلے اس سے انتقام لیتے، (مسلم: 2327)“

تشریح:

اس حدیث پاک سے رسول اکرمؐ کی سیرت مبارکہ کے دروشن پہلو سامنے آتے ہیں، ایک تو یہ کہ جب بھی آپ کو دو چیزوں کے درمیان اختیار (Option) دیا گیا، آپ نے دونوں میں آسان صورت کو اختیار فرمایا۔ اس سے اسلام کا یہ نظریہ بھی سامنے آتا ہے کہ اسلام اپنے فرماں و احکامات اور تعلیمات کے ذریعے اپنے مانے والوں کے لیے دشواری نہیں پیدا کرتا یا ایسا حکم نہیں دیتا جس پر عمل کرنا انسان کے لیے دشوار ہو جائے اور وہ انسانی طاقت سے باہر ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ”لَا يُكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“۔

ترجمہ: ”اللہ کسی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا، (البقرۃ: 286)۔“

(۲) ”وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ“۔

ترجمہ: ”اللہ نے تمہارے لیے دین میں تنگی نہیں رکھی، (الحج: 78)۔“

(۳) ”يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ“۔

ترجمہ: ””اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا، (البقرۃ: 185)۔“

اسی طرح حضور ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

”إِنَّ الدِّينَ يُسْمِعُ، وَلَنْ يُشَادَ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا“۔

ترجمہ: ”بے شک دین آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی اختیار کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا (اور اس کی سختی نہ چل سکے گی) پس (اس لیے) اپنے عمل میں پختگی اختیار کرو۔ اور جہاں تک ممکن ہو میانہ روی برتو اور خوش خبری دو، (بخاری: 39) اور آپ نے یہ بھی فرمایا: ”بَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا“۔

ترجمہ: ”آسانی کرو اور سختی نہ کرو، (بخاری: 69)۔“

یعنی دین کے امور کو آسان کر کے پیش کرو مشکل بنا کر پیش نہ کرو کہ لوگ اس کو مشکل سمجھ کر

دین سے بھاگ جائیں، لیکن یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آسانی اختیار فرمانا اپنی ذات کے لیے نہیں تھا، کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ہمت و استقامت سے نوازا تھا چنانچہ آپ صوم و صال (بغیر افطار کیے مسئلہ روزہ) بھی رکھا کرتے تھے جو عام انسانوں کے بس کی بات نہیں بلکہ آپ کا "یسر" کو اختیار فرمانا امت کی آسانی کے لیے تھا کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنْتُمْ"

ترجمہ: "تمہارا تکلیف میں پڑ جانے رسول کو گراں گزرتا ہے، (التوبہ: 128)"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا دوسرا رُخ آپ کی رحمت عامہ ہے، آپ بے پناہ مہربان اور شفیق تھے اور آپ کی رحمت و شفقت کا عالم یہ تھا کہ آپ نے اپنے جانی دشمنوں اور خون کے پیاسوں کو معاف فرمایا اور کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کے عزم، استقامت اور اولو العزم کا عالم یہ تھا کہ آپ اللہ اور دین کے مخالفین اور حدود الہیہ کو توڑنے والوں کو کبھی معاف نہیں فرمایا کرتے تھے، کیونکہ اگر آپ خدا نخواستہ ایسا کرتے تو یہ رحمت نہ ہوتی بلکہ کمزوری کی دلیل ہوتی جس کا آپ کی ذات سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور آپ خود ہی تو حدود الہیہ کو قائم فرمانے والے تھے اگر آپ خود ہی ان کے تقدس کو پامال کرنے والوں سے رعایت برتنے تو پھر کون تھا جو ان کی پاسبانی کرتا۔ اس سلسلہ میں فاطمہ مخزومنیہ کی چوری کا واقعہ ایک روشن مثال ہے۔

منتخب احادیث

(صرف کراچی یونیورسٹی کے لیے)

نوٹ: یہ احادیث امام تیجی بن شرف النووی (مُتوفی 676ھجری) کی تالیف "ریاض الصالحین" سے لی گئی ہیں اور نصاب مرتب کرنے والوں نے اسی پر اکتفا کی اور اصل مأخذِ حدیث کو دیکھنے کی زحمت گوارانہیں فرمائی۔ لہذا ہم نے متن میں اسی حدیث کو درج کر کے ترجمہ لکھا ہے، لیکن اساتذہ اور طلبہ کو درست معلومات دینے کے لیے اصل مأخذ کے متن اور ریاض الصالحین کے متنِ حدیث میں جو لفظی فرق ہے، اُس کی نشاندہی کر دی ہے اور حدیث کی تخریج بھی کر دی ہے۔

جس حدیث کے آخر میں "مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ" لکھا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری مُتوفی 256ھجری نے صحیح البخاری اور ابو الحسین امام مسلم بن حجاج قشیری مُتوفی 261ھجری نے صحیح مسلم میں روایت کیا ہے اور ان دونوں کا اس حدیث کے صحیح ہونے پر اتفاق ہے۔

حدیث نمبر: 1

آخرت کے اجر کا مدار تقویٰ و اخلاص پر ہے

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَبْنِ صَحْرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْنَظِرُ إِلَى أَجْسَامِكُمْ وَلَا إِلَى صُورَكُمْ وَلَكِنْ يَنْنَظِرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ، رَوَاهُ مُسْلِمٌ"۔

(ریاض الصالحین، باب الاخلاص، ص: 9، حدیث الثامن)

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
صُورَةٌ کی جمع صورت، شکل	صُورٌ	جسم کی جمع، بدن	أَجْسَامٌ
إِصْبَاعٌ کی جمع، انگلی	أَصَابِعٌ	جَسَدٌ کی جمع، بدن	أَجْسَادٌ
اشارہ کیا	آشَارَ	قلْبٌ کی جمع، دل	قُلُوبٌ

صَدْرٌ	سینہ	دیکھتا ہے	يَنْظُرُ
--------	------	-----------	----------

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ عبد الرحمن بن حمزری اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نہ تو تمہارے (ظاہری) جسموں کو دیکھتا ہے اور نہ تمہاری (ظاہری) صورتوں کو، بلکہ وہ تمہارے دلوں (کے اندر موجود اخلاص، للہیت، جذبہ تسلیم و رضا اور تقویٰ) کو دیکھتا ہے۔"

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح مسلم: 2564، محدث امام احمد: 7827، سنن ابن ماجہ: 4143)

شرح

اس حدیث کو سمجھنے میں یہ امر ملحوظ رہے کہ اس سے اجسام کا کالا یا گورا ہونا یا ظاہری صورتوں کا اچھا یا برا ہونا مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ چیزیں تو اللہ تعالیٰ کے تکوینی امر اور مشینت سے وجود میں آتی ہیں، نہ کسی کا گر، یا خوبصورت ہونا اس کا ذاتی کمال ہے اور نہ کسی کا کالا یا بد صورت ہونا اس کا ذاتی نقص ہے، خالق نے جس کو جیسا چاہا بنالیا۔ انسانوں کا ذاتی کمال اس کا ایمان، تقویٰ، علم اور کردار ہے اور ذاتی نقص اس کا بد عقیدہ ہونا، جہالت اور بد کردار ہونا ہے۔ صحیح مسلم کے اصل متن میں لفظ "أَجْسَادُكُمْ" مذکور ہے، جو "جَسَدٌ" بمعنی جسم کی جمع ہے، اس حدیث کے اصل متن میں یہ اضافہ ہے: "وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ" یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "تقویٰ یہاں ہے۔" اللہ تعالیٰ کسی بھی عمل خیر کی جزا عطا فرماتے ہوئے بندے کی ظاہری صورت یا ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس عمل خیر کے پیچھے حسن نیت، اخلاص، رضاۓ الہی اور للہیت کا جو جذبہ کا فرمائے، اُسے دیکھتا ہے اور اسی کے مطابق اجر سے نوازتا ہے۔

فرض کیجیے: ایک شخص بظاہر گذگڑا کر انتہائی عاجزی اور انگسار سے عبادت کر رہا ہے، اس کے اعمال ظاہری طور پر شریعت کے مقررہ معیار کے بالکل مطابق ہیں، لیکن دل میں اخلاص نہیں ہے، وہ یہ سب کچھ ریا کاری کے طور پر اور لوگوں کو اپنے دام عقیدت میں چانسے کے لیے اور دنیا کا نے کے لیے کر رہا ہو، تو اس ظاہری کیفیت کو دیکھ کر ہو سکتا ہے کہ

لوگ اس کے گردیدہ ہو جائیں، اس کے عقیدت مند بن جائیں، ہر سو اس کے تقوے کا ڈنکا نج رہا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہو گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ محض ظاہری عمل اور ظاہری صورتوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ دل کی کیفیات کو دیکھتا ہے، جذبہ تسلیم درضا کو دیکھتا ہے، وہ عمل جس قلبی اور باطنی جذبے کے تحت ظہور میں آیا ہے، اسے دیکھتا ہے اور آخرت کی جزا اس زادا کامدار اسی باطنی کیفیت پر ہے اور اسی مفہوم کو ذیل کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

ترجمہ: ”آدمی کو (آخرت میں اپنے عمل کا وہی صلحہ ملے گا) جس کی اس نے نیت کی ہو، اعمال (کے اخروی اجر) کامدار اس نیت پر ہے (جو اس کے پیچھے کا فرمایا ہے)، پس جس کی هجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی رضا کے لیے ہے، تو اس کی هجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے لیے ہو گی اور جس کی هجرت کا مقصد کسی دنیوی مقصد کو پانا ہے یا کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنا مقصود ہے، تو اس کی هجرت (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) اسی مقصد کے لیے قرار پائے گی، جس کی اس نے نیت کی ہے، (صحیح البخاری: 1)۔“

الغرض اللہ تعالیٰ بندے کے محض ظاہری اعمال یا ظاہری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ ان اعمال کے پیچھے کا فرمانیتوں کو دیکھتا ہے اور اس کا مرکز دل و دماغ ہے اور اخلاص، تسلیم درضا اور حسن نیت کو ایک جامع کلمہ سے تعبیر کرنا ہو، تو اسے ”تقویٰ“ کہتے ہیں۔ تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ بندہ ہر عمل (خواہ قبلی ہو یا فعلی) محض رضائے الہی کے لیے کرے، اس کی نافرمانی سے بچتے ہوئے اس کی رضا کی آغوش میں اپنے لیے ٹھکانا تلاش کرے، رہے اسی دنیا میں اور دنیا والوں کے درمیان، لیکن قلبی توجہ ہر وقت اپنے خالق و مالک کی جانب مبذول رہے۔ تمام ممنوعات (Prohibitions)، یعنی وہ امور جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے، سے اپنے آپ کو روکے رکھے اور جن احکام کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ نے حکم دیا ہے، ان پر عمل پیرا رہے۔

حدیث نمبر: 2

غیظ و غضب پر قابو پانے والا ہی حقیقت میں بھادر رہے

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَيْسَ السَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا السَّدِيدُ الَّذِي يَنْدِلُكُ نَفْسَهُ إِنْدَ الْغَضَبِ“، مُتَّقِفٌ عَلَيْهِ۔ قَالَ النُّوْوَى: وَالصُّرَعَةُ بِضَمِّ الصَّادِ وَفَتْحِ الرَّاءِ وَأَصْلُهُ إِنْدَ الْعَرَبِ مَنْ يَضْرِعُ النَّاسَ كَثِيرًا۔“

(ریاض الصالحین، باب الصبر، ص: 39، حدیث: 22)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
الصُّرَعَةُ	(پہلوان) جواہر میں اپنے حریقوں کو پچھاڑ دے	نَفْسٌ	(خود اپنی ذات) جذبات

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (در اصل) پہلوان وہ نہیں ہے جو (اپنے مقابل پہلوان کو) پچھاڑ دے، (بلکہ حقیقت میں) پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ (یعنی اپنے جذبات) پر قابو پالے، یہ حدیث صحیح البخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے، یعنی دونوں جلیل القدر اماموں کا اس کے صحیح ہونے پر اتفاق ہے، امام نووی نے فرمایا: ”الصُّرَعَةُ“، ص سے شمشہ (پیش) اور ”ر“ کے فتو (زبر) کے ساتھ ہے اور اہل عرب کے نزدیک اس کے اصل معنی ہیں: ”جواہر میں اپنے
حریقوں کو زیر کر دے، (صحیح مسلم: 2609)۔“

تعریف:

اک حدیث میں ان مونوں کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے جو اشتغال کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں، غیظ و غضب اور انتقامی جذبے سے مغلوب نہیں ہوتے، کیونکہ جو شخص غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو نہ پاسکے اور کسی بھی ناگوار بات کے رد عمل میں بے قابو ہو کر انتقام پر اتر آئے تو بعض اوقات ایسی کیفیت میں وہ شرعی حدود کو پامال کر دیتا ہے اور طیش میں آ کر ایسے کام کرتا ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نار ارض ہوتا ہے اور بعد میں اسے

خوبی پچھانا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ نے غصے کو ضبط کرنے والوں کے متعلق فرمایا:

”وَالْكَٰفِرُونَ لَا يُحِبُّنَ الْمُحْسِنِينَ“ -

ترجمہ: ”اور جو (اپنے جذبات پر قابو پا کر) غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں (کی خطاکیں) معاف فرمادیتے ہیں، اللہ تعالیٰ (ایسے ہی) احسان ہمارے لوگوں سے محبت فرماتا ہے۔“ -
(آل عمران: 134)

احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) حضرت عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غضب شیطان کے اثر سے ہے، شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بھائی جاتی ہے، توجہ تم میں سے کوئی شخص غضب ناک ہو تو وہ وضو کر لے، (سنن ابو داؤد: 4784)۔

(۲) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: دو آدمی نبی کریم ﷺ کے سامنے لا رہے تھے، ان میں سے ایک نہایت غصے میں تھا اور یوں لگتا تھا کہ غصے سے اس کی ناک پھٹ جائے گی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے ایک ایسے کلمے کا علم ہے کہ اگر وہ یہ پڑھ لے تو اس کا غصہ جاتا رہے گا، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے پوچھا: (یا رسول اللہ!) وہ کلمہ کیا ہے؟، آپ ﷺ نے فرمایا: ”أَللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ السَّيِّطَانِ الرَّجِيمِ، (ابوداؤد: 4780)۔“

(۳) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص غصے میں ہو، اگر وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، پھر اس طرح اگر اس کا غصہ دور ہو جائے تو فہا اور نہ پھروہ لیٹ جائے، (سنن ابو داؤد: 4782)۔

ان احادیث مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے:

(الف) بندہ غصے پر قابو پائے اور انتقام کی طاقت کے باوجود اپنے مخالف کو اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دے۔ ایک روایت کوئی شاعر نے رباعی میں نہایت عمدہ منظوم کیا ہے:

موسیٰ نے عرض کی اے بارِ خدا!

کون ہے تیرا بندوں میں سوا؟

ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے

جو لے سکے، اور نہ لے بدگی کا بدلہ

(ب) غصہ چونکہ شیطان کے اثر سے ہے اور شیطان آگ سے بنتا ہے، الہذا غصے کی شدت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، رگس پھول جاتی ہیں اور انسان مشتعل ہو جاتا ہے، تو آگ کا علاج پانی ہے، الہذا پانی پی لے، وضو کر لے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے اور یہ سوچئے کہ اگر یہ شخص میرا مجرم ہے تو میں بھی اپنے رب کی کتنی نافرمانیاں کرتا ہوں، وہ توفیری انقام نہیں لیتا، مہلت دیتا ہے، معاف فرمادیتا ہے، مجھے بھی اپنے رب کی سنت ادا کرنا چاہیے۔

(ج) ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھے، ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ
الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ“ پڑھے، درود پاک پڑھے۔

بہادر شاہ ظفر کا یہ حکیمانہ شعر ہے:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

حدیث نمبر: 3

جنت و جہنم کے راستے

”عَنْ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّ
الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْصُدُّ حَتَّى يُكْتَبَ
عِنْدَ اللَّهِ صِدْقِيَّا، وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ،
فَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ كَذِبًا۔“

(ریاض الصالحین، باب الصدق، حدیث الاول، ص: 42)

الغاظ	معانی	الغاظ	معانی
صِدْقٌ	سچائی	الْفُجُورُ	الْفُجُورُ
يَهْدِي	راستہ دکھاتا / دکھاتی ہے	الْكَذِبُ	کذب، بدکاری کرنا

نیکی	البُدُل
لکھ دیا جاتا ہے	نیکی
نیکی	لکھ دیا جاتا ہے

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور یہ کہ ایک شخص مسلسل سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ (کے ہاں) صدقیق (نیکی سچا) لکھ دیا جاتا ہے اور یہ کہ جھوٹ (اللہ کی) نافرمانی کا راستہ دکھاتا ہے اور فجور (اللہ کی نافرمانی انسان کو) جہنم کا راستہ دکھاتی ہے اور ایک شخص (مسلسل) جھوٹ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ (اللہ تعالیٰ کے ہاں) وہ "کذاب" (نیکی جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے)۔

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 6094، صحیح مسلم: 2607، سنن ترمذی: 1971) نوٹ: صحیح مسلم کے اصل متن میں لفظ "عِنْدَ اللَّهِ" درج نہیں ہے، لیکن اس سے معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تشریح:

الناء: 69 میں اللہ تعالیٰ نے "صَدَّيقِينَ" کو انبیاء کرام، شہداء کرام اور اولیائے کرام کے ساتھ اپنے انعام یافتہ بندوں میں شمار کیا ہے اور صحیح البخاری: 1209 میں نہایت پے امانت دار تاجروں کو بشارت دی گئی ہے کہ آخرت میں ان کا حشر انبیاء، شہداء اور صاحبوین کے ساتھ ہو گا۔

کذب (جھوٹ) کی حرمت پر اجماع ہے، "كَاذِبُونَ" پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں لعنت فرمائی ہے اور وعدہ بھی فرمائی ہے۔ "کذب" کے معنی ہیں: جان بوجھ کرواقعہ کے خلاف بات کرنا، اگر بے مقصد جھوٹ بولا جائے تو یہ غیبت کی طرح گناہ کبیرہ اور گناہ بے لذت ہے، صرف اپنی عاقبت کو بر باد کرنا ہے اور اپنے نیک اعمال کو ضائع کرنا ہے۔ اگر جھوٹ بول کر یا جھوٹی گواہی دے کر کسی کا حق مارا جائے، کسی کو اس کے حق سے محروم کر دیا جائے یا خود ہی کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا جائے تو یہ واضح طور پر گناہ کبیرہ ہے۔ البتہ

شریعت نے بعض صورتوں میں خلافِ واقعہ بات کہنے کی رخصت دی ہے، مثلاً:

(الف) کسی مظلوم مسلمان کی جان بچ سکتی ہو، (ب) جنگ کے موقع پر شمن کو فریب دینے کے لیے مسلمانوں اور ملک کی سلامتی کی خاطر اور بہت بڑی تباہی سے بچنے کے لیے خلافِ واقعہ بات کہنا، (ج) میاں بیوی کا آپس میں اظہارِ محبت میں مبالغہ کرنا، (د) دوآ و میوں کے درمیان صلح کرانا، فارسی کا مقولہ ہے: ”دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستی فکر انگیز“، یعنی ایسا چیز بولنا جس سے فتنے کی آگ بھڑک اٹھے، اس سے مصلحت پر منی جھوٹ بہتر ہے۔ لیکن اس کے مباح ہونے اور جواز کی تمام صورتوں میں فقہائے کرام کے نزدیک صریح جھوٹ کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے ”تعریض“، ”توریہ“ اور ”ایہام“ کا طریقہ اختیار کرنا بہتر ہے، یعنی ایسا ذمہ دار کلمہ استعمال کرنا جس سے صریح جھوٹ سے بچا جاسکے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریز پولیس ایک عالم کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کرنا چاہتی تھی، وہ اس عالم تک پہنچ گئے، لیکن انہیں جانتے نہیں تھے، انہوں نے اُسی عالم سے پوچھا (جو ان کو مطلوب تھا) کہ آپ نے فلاں عالم کو دیکھا ہے (حالانکہ وہ خود ہی تھے)، وہ جہاں کھڑے تھے، وہاں سے چار قدم ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور اس جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: تھوڑی دیر پہلے وہ یہاں تھے، اب یہاں نہیں ہیں، اس جگہ سے چلے گئے ہیں۔

اس طرح ظالم و غاصب حکمران سے ان کی جان بھی بچ گئی اور صریح جھوٹ بولنے سے بھی بچ گئے۔ الغرض مسلمان کو ہمیشہ بچ بولنا چاہیے، ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ کا اعلانِ نبوت سے قبل ہی لقب ”صَدَّيقِ وَالْمِنْ“ مشہور تھا۔ غوث الاعظم محب الدین عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے محض بچ بولنے کی برکت سے ڈاکوؤں کا پورا ایک گروہ تائب ہو گیا۔ خاص طور پر اساتذہ، بزرگوں اور بڑوں کو اپنے چھوٹوں کے سامنے جھوٹ بولنے سے اجتناب کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے بچوں کی تربیت پر نہایت براثر پڑتا ہے۔

حدیث نمبر: 4

نیکی کو حقیرتہ جانو

”عَنْ أَبِي ذِئْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ: لَا تَحْقِرُنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئاً وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاهُ بِوَجْهِهِ طَلِيقٌ“، رواه مسلم۔

(ریاض الصالحین، باب فی بیان کثرة طرق الخیر، حدیث الحامس، ص: 76)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
لَا تَحْقِرُنَّ	حقیرمت سمجھو	وَجْهٌ	چہرہ
مَعْرُوفٌ	نیکی	رَجُلٌ طَلِيقٌ	کشادہ رواوی، ہنس کھے چہرے والا
تَلْقَى	توملاقات کرے	أَخَاهُ	اپنے بھائی کو

ترجمہ: ”حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی بھی نیک بات کو حقیرمت سمجھو، خواہ (وہ نیکی) اسی قدر ہو کہ تو اپنے بھائی کے ساتھ بشاش بشاش چہرے کے ساتھ ملے۔“

نوٹ: ریاض الصالحین میں ”طَلِيقٌ“ ہے، جبکہ صحیح مسلم میں ”طَلْقٌ“ ہے، دونوں ہم معنی ہیں۔

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح مسلم: 6567، سنن ترمذی: 1833)

تشریح:

انسان زندگی بھر جو نیک و بد اعمال کرتا ہے، ان کے اثرات اس کی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں اور انسان کی سوچ اس کے اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بعض اوقات انسان کسی نیکی کو معمولی سمجھ کر اسے ترک کر دیتا ہے، اس حدیث میں اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے کہ کسی بھی نیک بات یا عمل کو حقیرمت سمجھو، خواہ وہ بظاہر معمولی ہی ہو، جیسے اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ ہنستے مسکراتے یعنی بشاش چہرے کے ساتھ ملنا۔ یہ معمولی نیکیاں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شمار کی جاتی ہیں اور ان پر اجر عطا کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيغُ أَجْرًا لِمُحْسِنِينَ“ -

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ نیکیاں کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، (یوسف: 90)“
 اس کے ساتھ ساتھ علمائے حق نے یہ بھی کہا ہے کہ کسی نیکی کو بڑی نہ سمجھو اور کسی برائی کو معمولی نہ سمجھو، ورنہ آدمی برائی کو حقیر جانتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھائے گا اور بالآخر اس میں مبتلا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر آدمی اپنی نیکیوں کے معاملے میں اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہوئے زعم، خوش نہیں اور تکبر پیدا ہو گا اور وہ نیکیوں کے معاملے میں اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہوئے نیکیوں کا راستہ چھوڑ دے گا، یہ طرزِ عمل آخر کار نیکیوں سے محروم ہونے کا باعث بنے گا۔ اس لیے بندے کو چاہیے کہ ہر وقت اپنے گناہوں کو یاد کرتا رہے، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے۔
 اپنی نیکیوں پر قلبی سکون و سرت ضرور محسوس کرے، کیونکہ یہ ایمان کا تقاضا ہے، لیکن ان پر اتراء نہیں، اپنے آپ کو نیکیوں کے معاملے میں بے نیاز نہ سمجھنے لگے، ہمیشہ یہی سمجھے:

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہی وہ احساس ہے جو انسان کو حق اور ہدایت پر قائم رکھ سکتا ہے، ورنہ شیطان کے جال میں پھنس جائے گا۔ اس حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ معمولی سے معمولی نیکی کو بھی حقیر نہ سمجھو، اس کا مطلب یہ ہے: بعض اوقات انسان کسی نیک عمل کو معمولی سمجھ کر اس پر عمل کرنا ترک کر دیتا ہے اور اس طرح نیکیوں کے اجر سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے، بعض اوقات ایک معمولی سی نیکی ایک خاص سیاق و سبق میں محض جذبہِ رحم و اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مغفرت کا وسیلہ بن جاتی ہے، حدیث پاک میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
 ”بَيْنَمَا كَلْبٌ يُطِيفُ بِرَكَةَ، كَادَ يَقْتُلُهُ الْعَطْشُ، إِذْ رَأَتُهُ بَغْيٌ مِنْ بَغَايَا بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَنَزَعَتْ مُوَقَّهَا، فَسَقَتْهُ فَغَفِرَ لَهَا بِهِ“ -

ترجمہ: ”ایک کتا کسی کنویں کے گرد گھوم رہا تھا، ایسا لگتا تھا کہ عنقریب پیاس (کی شدت) سے مر جائے گا، اسی وقت بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت کا وہاں سے گزر ہوا، اس نے اپنا

موزا اتار اور اس سے پانی نکال کر کتے کو پلا دیا، اس عورت کے اس عمل کی وجہ سے اس کی مغفرت کردی گئی، (صحیح البخاری: 3467)۔

حدیث مبارک میں اُس (مذکورہ متن) حدیث کی ایک اور انداز میں تعلیم فرمائی گئی ہے: ”تمہارا اپنے بھائی کو مسکراہٹ سے ملنا بھی صدقہ ہے، (سنن ترمذی: 1970)۔“

اس طرح اُس کے دل میں تمہارے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوں گے، حالانکہ یہ شخص ایک خوش اخلاقی ہے، لینا دینا کچھ بھی نہیں ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اسے صدقے سے تعبیر فرمایا ہے۔

حدیث نمبر: 5

نیکی کے لیے سبقت کرنا

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: بَادِرُوا بِالْأَعْبَارِ الصَّالِحَةِ فَسَتَكُونُ فِتْنَةٌ كِطَاعُ الظَّلِيمِ، يُصِيبُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُسِيقُ كَافِرًا وَيُسِيقُ مُؤْمِنًا وَيُصِيبُ كَافِرًا، يَبِينُ دِينَهُ بِعَرَضِ مِنَ الدُّنْيَا، رَوَاهُ مُسْلِمٌ“ -
(ریاض الصالحین، باب فی الحث علی المبادرة الی فعل الخیرات، حدیث الاول، ص: 60)

اللغاط	معانی	اللغاظ	معانی
بَادِرُوا	پیش قدمی کرو، سبقت کرو	يُسِيقُ	شام کرے گا
الصالحة	نیک، نیکی	يُصِيبُ	صحیح کرے گا
فِتْنَةٌ	فتے، آزمائش	عَرَضٌ	سامان دینا
قِطَاعٌ	قطعہ کی جمع مکڑے، حصہ	اللَّيْلُ	رات
الظَّلِيمُ	تاریک کرنے والا		

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”نیک اعمال میں سبقت کرو، عنقریب ایسے فتنوں کا ظہور ہو گا جو اندر ہیری رات کی طرح چھا جائیں گے، ایک شخص صحیح مومن ہو گا اور شام کو کافر یا شام کو مومن ہو گا اور صحیح کو کافر اور معمولی سی

دنیاوی منفعت کے عوض اپنے دین کو فتنہ دے گا، (صحیح مسلم: 309)۔

حدیث کے حوالہ جات:

نوٹ: صحیح مسلم کے اصل متن میں ”بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ الصَّالِحةِ فَسَتَكُونُ فِتْنَةٌ“ کے
بجائے ”بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ فِتْنَةً“ ہے۔

شرح:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا مطلب یہ ہے کہ ایک دور آئے گا جس میں فتنوں کا دور دورہ ہو گا، دنیوی مال و دولت اور رجاه و منصب کی حرص دین پر غالب آجائے گی، لوگ دین کو دنیاوی مفادوں پر قربان کر دیں گے، جب دنیا کی طلب دین پر غالب آجائے گی تو دین پر قائم رہنا دشوار ہو جائے گا۔ اس حدیث پاک میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس وقت کے آنے سے پہلے نیک اعمال کر لیے جائیں، جب نیک اعمال کا کرنا مشکل ہو جائے گا، پہلے در پے فتنے نمودار ہوں گے، جیسے اندر ہیری رات میں تدریتی تاریکی چھا جاتی ہے، ان فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ ہو گا کہ انسان صح کو مومن ہو گا اور شام کو کافر ہو جائے گا، یعنی دین پر استقامت کے ساتھ قائم نہیں رہ پائے گا، ایک دن میں اُن کے اندر اتنا بڑا انقلاب آجائے گا۔ جب شر ہر جانب غالب آجائے اور نیکی کرنا یا ایمان پر قائم رہنا دشوار ہو جائے تو ایسی ابتلاء کے وقت نیکی کا جر بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ ہو گا، ایک طویل حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ”تمہارے آگے ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ کسی شخص کے لیے (شیطانی ترغیبات سے منہ موز کر) صبر و استقامت کے ساتھ دین پر قائم رہنا ایسا مشکل کام ہو گا جیسے جسے ہوئے آگ کے انگارے کو مٹھی میں لینا، تو ایسے دور میں نیکی پر قائم رہنے والے کو پچاس افراد کے برابر؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (نہیں) تمہارے پچاس افراد کے برابر جعلے گا۔“
(سنن ترمذی: 3058)

اس سے معلوم ہوا کہ ناسازگار اور مشکل حالات میں دین پر قائم رہنے کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت زیادہ ہے۔

حدیث نمبر: 6

قبر میں اعمال ساتھ دیتے ہیں

”عَنْ أَنَسِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَتَبَعُ الْمِيتُ ثَلَاثَةً أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَعَمَلُهُ، فَإِنْ شَاءَنَا وَيَنْتَقِي وَاحِدًا، يَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَيَنْتَقِي عَمَلُهُ، مُشْفَقٌ عَلَيْهِ“ -
(ریاض الصالحین، باب فی الجاہدہ، حدیث العاشر، ص: 67)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
يَتَبَعُ	پچھے چلتا ہے، پیروی کرتا ہے	إِنْ شَاءَنَا	دو/تن
يَرْجِعُ	لوٹ جاتا ہے	يَنْتَقِي	باقی رہتا ہے

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو) تمن چیزیں میت کے ساتھ ساتھ (قبر تک) چلتی ہیں، اس کے گھروالے، اس کامال اور اس کے اعمال، پھر (میت کی تدفین کے بعد) دو چیزیں لوٹ آتی ہیں (یعنی اس کے گھروالے اور اس کامال) اور ایک چیز قبر میں اس کے ساتھ باقی رو جاتی ہے، یعنی اس کا عمل،“ -

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 6514، صحیح مسلم: 2960)

تشریح:

دنیا میں انسان سے تعلق رکھنے والی تین چیزیں ہوتی ہیں: انسان کے دوست اور رشتہ دار، انسان کا اور اشتہن میں حاصل شدہ یا اپنا کمایا ہوا مال اور انسان کے اچھے یا بے اعمال۔ انسان کی نفیاتی کمزوری ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں اور رشتہ داروں کی جائز و ناجائز خواہشات و مطالبات کی تکمیل کے لیے تگ دو کرتا ہے اور جب حلال ذرائع سے وہ فرمائشیں پوری نہیں کر پاتا تو مال کمانے اور جمع کرنے کے لیے حرام طریقے اختیار کرتا ہے

اور پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی خواہش کا اسیر بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”أَلْهُمْ لِكُمُ الْكَثُرُ ۖ حَتَّىٰ ذُرَتُمُ الْمَقَابِرَ ①“

ترجمہ: ”تمہیں زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی خواہش نے (اللہ سے) غافل کر دیا ہے، یہاں تک کہ تم اس کا (انجام) قبروں میں دیکھ لو گے، (التکاثر: 1-2)۔“

مال کی حرص وہوس ایسی بیماری ہے کہ جتنا مال زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کی طلب بڑھتی چلی جاتی ہے، حدیث پاک میں ہے:

ترجمہ: ”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر انسان کے لیے ایک وادی سونے کی ہو جائے تو وہ تمنا کرے گا کہ اس جیسی ایک وادی اور ہو جائے، اس کے منہ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز بھر نہیں سکے گی، اللہ تعالیٰ جس پر کرم فرماتا ہے، اسے اپنی ذات کی طرف رجوع کی توفیق دیتا ہے، (صحیح البخاری: 6439)۔“

اس حدیث میں ترغیب دی گئی ہے کہ انسان دنیا کی محدود زندگی کے لیے تو ہر طرح کی منصرف بہبندی کرتا ہے، مال و دولت جمع کرتا ہے، لیکن آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کے مسائل، مصائب اور ضرورتوں سے غافل رہتا ہے۔ مومن کو چاہیے کہ اپنی عاقبت کی فکر کرے اور اعمال خیر کی طرف توجہ کرے جو قبر میں اور آخرت میں اسے کام آئیں گے، باقی سب چیزیں تو قبر کے کنارے سے ساتھ چھوڑ جائیں گی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ”مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور تمہارے رب کے نزدیک اجر و ثواب اور (اچھی) امید کے اعتبار سے (آخرت کے لیے) باقی رہنے والی نیکیاں (ہی) بہتر ہیں، (الکھف: 46)۔“

رشته داروں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ترجمہ: ”(ذرو) اس دن (سے) جب انسان اپنے بھائی سے بھاگے گا اور اپنی مال اور اپنے باپ سے، اپنی بیوی اور بیٹوں سے، اس دن ہر انسان کو اپنی فکر (دونسروں سے) بے نیاز

کر دے گی، (عبس: 33 تا 37)۔

حدیث نمبر: 7

کامل ایمان کا معیار

”عَنْ أَنَّىٰ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ قَالَ: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يُحِبَّ
لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ، مُتَفَقِّعٌ عَلَيْهِ“ -

(ریاض الصالحین، باب فی النصیحة، حدیث الثالث، ص: 107)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
لَا يُؤْمِنُ	ایمان نہیں لاتا	لِأَخِيهِ	اپنے بھائی کے لیے
مَا يُحِبُّ	جو پسند کرتا ہے	لِنَفْسِهِ	اپنے لیے
أَحَدُكُمْ	تم میں سے کوئی ایک	جَازٌ	پڑوںی

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی شخص (کامل) مومن نہیں ہو سکتا، تا وقتیکہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند کرنے لگے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 13، صحیح مسلم: 168)۔

نوٹ: صحیح مسلم کے اصل متن میں ”أَوْ قَالَ لِجَارِهِ“ کے الفاظ زائد ہیں۔ صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں ”وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ عَبْدُ حَتَّىٰ يُحِبَّ لِجَارِهِ أَوْ قَالَ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ“، ترجمہ: ”اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے، کوئی بندہ (کامل) مومن نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ وہ اپنے پڑوںی کے لیے، یا فرمایا: اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے“ کے الفاظ آئے ہیں۔

تشریح:

اس حدیث میں کامل ایمان کا ایک معیار بیان فرمایا گیا ہے کہ مومن اپنے بھائی

کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھائی کے ساتھ پڑوی کا بھی ذکر فرمایا۔ یہاں بھائی سے حقیقی بھائی بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور دینی بھائی بھی اور راوی کوشک ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید پڑوی کا بھی ذکر فرمایا، سورۃ النساء: 36 کی روشنی میں مفسرین نے پڑوی کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

- (۱) مسلمان، رشتہ دار اور پڑوی، (۲) مسلمان ہو اور پڑوی ہو (رشتہ دار نہ ہو)،
- (۳) صرف ہمسایہ ہو (نہ مسلمان ہو اور نہ رشتہ دار) جو کارخانے، دفتر، کلاس، سفر یا مجلس میں آپ کے برابر بیٹھا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اہمیت کو جاگر کرتے ہوئے فرمایا:

- (۱) جبریل امین مجھے برابر پڑوی کے بارے میں تاکید فرماتے رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ پڑوی کو وارث بنادیا جائے گا۔

(صحیح البخاری: 6014، صحیح مسلم: 2625)

- (۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار اعادہ کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کی قسم! وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا جس کی شرارتیوں سے اس کا پڑھنے محفوظ نہ ہو، (صحیح البخاری: 6016، صحیح مسلم: 46)۔

ایمان کامل کا یہ بڑا سخت معیار ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد انصار اور مہاجرین میں مواخات (بھائی چارے) کا رشتہ قائم فرما�ا تو ہر انصاری نے کمال ایثار کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ساری دولت کا نصف اپنے مہاجر بھائی کو دے دیا، یہاں تک کہ ایک انصاری صحابی نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا: میرے نکاح میں دو بیویاں ہیں، آپ جسے پسند کریں، میں اُسے طلاق دے دوں گا، آپ عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کر لیں، اگرچہ اس انصاری بھائی کی جانب سے اس پیش کش کو قبول کرنے کا ذکر کتب سیرت میں نہیں ہے، لیکن انصاری صحابی کے کمال ایثار پر مبنی یہ ناقابلِ یقین پیش کش ہے۔ ہمیں بھی جہاں تک اور جس قدر مکن ہو ایثار پر مبنی یہ اس معیارِ ایمان کو حاصل کرنے کی کوشش

کرنی چاہیے، اس حدیث میں تو یہ فرمایا کہ مومن اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، لیکن قرآن مجید میں کمال ایمان کا ایک اس سے بھی اعلیٰ درج فرمایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَيُؤْتِهِمُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَاصَّةً“۔ ترجمہ: ”اور وہ (اہل ایمان) خود حاجت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، (الحضر: 9)۔“

حدیث نمبر: 8

دنیا میں حد سے زیادہ رغبت کی ممانعت

”عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَا تَشْخُذُوا الصَّيْعَةَ فَتَرْغَبُوا فِي الدُّنْيَا، رَوَاهُ التَّرْمِذِيُّ وَقَالَ: حَدِيثٌ حَسَنٌ“۔

(ریاض الصالحین، باب فضل الزهد والفرق فی الدنیا، حدیث: 23، ص: 239)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
لَا تَشْخُذُوا	نہ پکڑو، اختیار نہ کرو	فَتَرْغَبُوا	کتم رغبت کرنے لگو
الصَّيْعَةُ	جائنا داد، زمین		

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم (کثرت) جاندار کو اختیار نہ کرو، ورنہ تم دنیا ہی کے ہو کر رہ جاؤ گے، امام ترمذی نے فرمایا: یہ حدیث حسن ہے، (سنن ترمذی: 2328)۔

شرح:

اسلام ترک دنیا اور رہنمائی کی تعلیم نہیں دیتا، کیونکہ دنیوی مال و متاع کی طرف رغبت انسان کی فطرت بھی ہے اور ضرورت بھی، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جو دعا تعلیم فرمائی گئی ہے، اس میں دنیا کی حسنہ (بھلائی) کا تذکرہ پہلے ہے اور آخرت کی حسنہ (بھلائی) کا ذکر بعد میں۔ اسلام میں زکوٰۃ، عشر، فطرہ، قربانی اور دیگر مالی صدقات کے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے مکمل بے رغبتی اور دنیوی نعمتوں سے لاطلاقی خلاف فطرت

ہے اور اسلام میں پسندیدہ امر نہیں ہے۔ اسلام صرف چاہتا ہے کہ انسان دنیاوی مال و دولت کا پرستار نہ بن جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حلال و حرام کی حدود کو پامال کر دے اور آخرت کو بالکل فراموش کر دے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱): ”اے مومنو! تمہارا مال اور تمہاری اولاد اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کرے، (النافعون: ۹)۔

(۲): ”(ایسے) مرد ان (خدا) جنہیں کوئی تجارت، کسی قسم کی خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں، جس میں دل اور آنکھیں (دہشت سے) الٹ جائیں گی، (النور: ۳۷)۔

حدیث نمبر: 9

براہیوں کو روکنے کا حکم

”عَنْ أَبِي سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فِي قَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ“، رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

(ریاض الصالحین، باب فی الامر بالمعروف والنهی عن المنكر، حدیث الاول، ص: 108)

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
طاہت نہیں رکھتا	لَمْ يَسْتَطِعْ	دیکھا	رَأَى
اپنی زبان کے ساتھ	بِلِسَانِهِ	برائی، گناہ	مُنْكَرَا
اپنے دل کے ساتھ	بِقَلْبِهِ	اپنے ہاتھ کے ساتھ	بِيَدِهِ
کمزور ترین	أَضْعَفُ	اسے چاہیے کہ تبدیل کر دے	فَلْيُغَيِّرْهُ

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے سنار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھتے تو اپنے ہاتھوں سے اس کی اصلاح کرے اور

اگر طاقت سے اسے نہ روک سکتا ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برداشت کا کمزور ترین درجہ ہے، (صحیح مسلم: 175)۔

تشریح:

”منکر“ برائی اور گناہ کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی امت، امتِ دعوت ہے اور دینِ اسلام، دینِ دعویٰ ہے، لہذا حیثیتِ مجموعی امت کی ذمے داری ہے کہ وہ دین کی دعوت دے، نیکیوں کو پھیلانے اور برا بیوں کا راستہ روکے۔ یہ پوری امت پر فرض کفایہ ہے، اگر کوئی بھی اسے ادا نہ کرے تو سب گناہ گار ہوں گے۔ بعض علمائے کرام نے اس حدیث کی تشریح میں بتایا ہے کہ برائی کو طاقت سے روکنا حکمران اور حکومت کی ذمے داری ہے اور زبان (یا تحریر) سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اہل علم و دانش کی ذمے داری ہے، لیکن زیادہ درست بات یہ ہے کہ اپنی استعداد، صلاحیت اور حیثیت کے مطابق یہ ہر مومکن کی ذمے داری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ”جو امتیں لوگوں کی ہدایت کے لیے میدانِ عمل میں آئیں، تم ان سب میں سے بہترین امت ہو، تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو، (آل عمران: 110)۔

حدیث کی رو سے برائی کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن چونکہ افراد کی استطاعت، استعداد اور صلاحیت والہیت میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح ان کے حلقة اثر اور دائرة کا رہ کار میں بھی فرق ہوتا ہے، اس لیے شریعت نے کسی پر اس کی طاقت سے زائد بوجھ نہیں ڈالا۔ اسلام نے حکم دیا کہ جو اپنی مضبوط معاشرتی حیثیت، اپنے عہدے اور منصب کے اعتبار سے اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی قوتِ بازو سے برائی کا راستہ روک سکے تو اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اگر نسبتاً کمزور حیثیت ہے تو برائی کے خلاف صدائے احتجاج ضرور بلند کرے اور اپنی نفرت کا برملاظہ ہار کرے اور اگر بالکل ہی بے بس اور عاجز ہے تو کم از کم دل سے برائی سے نفرت کرے، حدیث میں اسے ایمان کا ”کمزور ترین درجہ“ قرار دیا گیا ہے، ایک اور روایت میں فرمایا: ”جو یہ بھی نہیں کرتا تو پھر اس کے دل میں رائی کے دانے کے

برا بربھی ایمان نہیں ہے، احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱) ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ خاص گنگاروں کے برے اعمال کے سبب عام لوگوں پر عذاب نازل نہیں فرماتا تو قتیکہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ عام لوگوں کے سامنے کھلے بندوں برا بیاں ہو رہی ہوں اور وہ ان کا راستہ روکنے پر قدرت کے باوجود ان برا سیوں کو نہ روکیں، جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ عام لوگوں کو بھی بعض بدکاروں کے سبب عذاب میں بٹلا فرمادیتا ہے، (مشکوٰۃ المصانع: 5142)۔“

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم فریا کہ فلاں بستی کو اس کے باسیوں سمیت الٹ دو، جبریل امین نے عرض کیا: اے پروردگار! اس بستی میں تیرا ایک متین بندہ ایسا ہے کہ اس نے پلک جھپکنے کی مقدار بھی کبھی تیری نافرمانی نہیں کی، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس پارسا سمیت اس بستی کو الٹ دو، کیونکہ اس کے سامنے میرے احکام کو پامال کیا جا رہا تھا، لیکن اس کے چہرے پر کبھی بھی غیظ و غضب کے آثار نمودار نہ ہوئے، (ثُقَّبُ الْإِيمَان: 7189)۔“

دین کے خلاف کوئی بات دیکھ کر محض حرص و طمع کے سبب اس لیے خاموش رہنا کہ کسی با اثر شخص کی بے جار عایت اور حمایت مقصود ہے، ”مُدَاهَنَت“ کہلاتا ہے اور یہ قرآن مجید کی رو سے قابل نذمت صفت ہے، البتہ دعوت دین میں تین باتوں کا لحاظ ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اپنے رب کے راستے کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعے بلا و اور (اگر کبھی تم کو بحث اور کرنی پڑے تو) احسن طریقے سے بحث کرو، (انخل: 125)۔“

حدیث نمبر: 10

صدقہ جاریہ

”عَنْ أَيْنِ هُرْبَرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ

إِنْقَطَاعَ عَنْهُ عَمْلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةِ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ
صَالِحٍ يَدْعُوكَهُ "رَوَاهُ مُسْلِمٌ".

(مشکوٰۃ المصانع، کتاب العلم)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
ماٹ	مرگیا، وفات پاگیا	ینْتَفَعُ بِهِ	اس سے نفع اٹھایا جاتا ہے
إِنْقَطَاعٌ	قطع ہو گیا، سلسلہ ثبوت گیا	صَالِحٌ	نیک
جاریۃ	جاری رہنے والا	يَدْعُونُ	دعا کرتا ہے

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ثبوت جاتا ہے، مگر تین قسم کے اعمال (کا اجر) جاری رہتا ہے: صدقۃ جاریۃ، علم نافع اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہے۔“

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح مسلم: 1631، سنن ترمذی: 376، سنن نسائی: 3653)

شرح:

انسان کے بعض نیک اعمال وہ ہیں جن کا سلسلہ اس کی زندگی تک جاری رہتا ہے اور وفات پر ختم ہو جاتا ہے جیسے: نماز، روزہ، زکوٰۃ و صدقات، تلاوت قرآن و اذکار وغیرہ۔ بعض اعمال خیر ایسے ہوتے ہیں جن کا سلسلہ انسان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتا، بلکہ ان کا فیض انسان کی وفات کے بعد بھی جاری رہتا ہے جیسے: کسی نے مسجد یا مدرسہ یا خیراتی ہسپتال یا پانی کا کنوں بنایا، وغیرہ۔ جب تک یہ مسجد، مدرسہ، ہسپتال یا پانی کا کنوں قائم ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس کے بانی کے نامہ اعمال میں اس کا ثواب لکھا جاتا رہے گا۔ اسی طرح کوئی عالم دین، قاری یا حافظ قرآن ہے اور اس نے کچھ لوگوں کو دین کی تعلیم دی تو اس کے شاگردوں اور شاگردوں کے ذریعے جب تک یہ فیض جاری ہے، اس کا اجر وفات کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ”صدقۃ جاریۃ“ کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں،

مثال:

(الف) مسجد کی تعمیر (ب) دینی مدارس کی تعمیر (ج) علماء اور حفاظ قرآن کی تعلیم و تربیت اور کفالت (د) پانی کا کنوال کھوکھو کرو قوف کر دیا (ھ) خیراتی ہسپتال بنانا، دعوتی و تبلیغی دینی لشڑیچر وغیرہ۔ اپنے امورات کے ایصالِ ثواب کے لیے ”صدقاتِ جاریہ“ کو ترجیح دینی چاہیے اور صدقۃ جاریہ کی ایک پسندیدہ صورت ضرورت مندوگوں کے لیے پانی کا انتظام ہے، حدیث مبارک میں ایسے اعمال کی تین صورتیں بیان فرمائی گئی ہیں:

(1) صدقۃ جاریہ: جس کی مثالیں اوپر درج ہیں، (2) علم نافع: جس کی ایک مثال تعلیم و علم کے حوالے سے اوپر درج ہے، اس کے علاوہ دینی و اخلاقی کتب کی تصنیف و تالیف و اشاعت، اخبارات و جرائد میں دینی مضامین کی اشاعت اور جدید دور میں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے دین کی دعوت اور باطل نظریات و افکار کا ردمبھی اس میں شامل ہے، (3) نیک اولاد جو اپنے ماں باپ کے لیے دعائے مغفرت کو اپنا شعار بنائے، ان کے ایصالِ ثواب کے لیے اعمالِ خیر انجام دے، صدقۃ جاریہ کا اہتمام کرے وغیرہ، حدیث میں ہے:

”عَنْ سَعْدِ بْنِ عَبَادَةَ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ أَمْرَ سَعْدٍ مَاتَتْ، فَأَمْرُ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ، قَالَ: الْبَاءُ، قَالَ: فَحَفِظْ بِئْرًا وَقَالَ: هَذِهِ لِأَمْرِ سَعْدٍ.“

ترجمہ: ”حضرت سعد بن عبادہ بیان کرتے ہیں: انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! امیر سعد (یعنی میری والدہ) اچانک وفات پائی گئی ہیں، (آن کے لیے) کس چیز کا صدقہ کرنا سب سے افضل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی کا، تو انہوں نے (ابنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے) کنوال کھدا کر (وقف کر دیا) اور کہا: یہ امیر سعد کا کنوال ہے، (سنن ابو داؤد: 1681)۔“

صحیح بخاری کی ایک روایت میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کی طرف سے ایک چلوں والا باغ بھی صدقہ کیا تھا، (صحیح البخاری: 2756)۔

حدیث نمبر: 11

منافق کی نشانیاں

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا أُتْسِينَ خَانَ“، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ وَفِي روایةٍ: ”فَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ“۔

(ریاض الصالحین، باب فی الامر باداء الامانة، حدیث الاوّل)

اللفاظ	معانی	اللفاظ	معانی
آیة	ثانی/علامت	وعَدَ	وعدہ کیا کرے
ثَلَاثَ	تین	أَخْلَفَ	خلاف ورزی کی
حَدَّثَ	بات کیا کرے	أُتْسِينَ	اس کے پاس امانت رکھی جائے یا امین بنایا جائے
كَذَبَ	جھوٹ بولایا بولے	خَانَ	خیانت کیا کرے
صَامَر	روزہ رکھا	صَلَّى	نماز پڑھی
زَعَمَ	گمان کیا		

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے“، امام تیجی شرف نووی فرماتے ہیں: ایک اور روایت میں ہے: ”اگرچہ وہ روزے رکھتا ہو، نمازیں پڑھتا ہو اور یہ سمجھتا رہے کہ وہ مسلمان ہے“۔

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 33، 34، صحیح مسلم: 207)

تشریح:

اس حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی تین نشانیاں بیان فرمائی

ہیں جو یہ ہیں: جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا اور خیانت کرنا۔ صحیح البخاری کی ایک اور حدیث میں دو مزید علامات دھوکا دہی اور جھگڑا لوپن کا اضافہ فرمایا گیا ہے: ”وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ“، ترجمہ: ”اور جب معاہدہ کرے تو دھوکہ دے اور جب جھگڑے تو بے ہودہ بکواس کرے، (صحیح البخاری: 34)۔“

وعدہ تو انسان یک طرفہ بھی کر سکتا ہے، لیکن اس دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: ”جب معاہدہ کرے تو دھوکہ دے“، معاہدہ دو زیادہ فریقوں کے درمیان ہوتا ہے، جس کی پاس داری ہر فریق معاہدہ پر ہوتی ہے، ایسی عہد شکنی کو بھی رسول اللہ ﷺ نے منافقانہ روشن قرار دیا ہے اور اسے دھوکا دہی سے تعبیر فرمایا ہے۔

امانت داری:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے امانت کی حفاظت اور ادائیگی کا صراحتہ کئی مقامات پر حکم دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤْذِنَا لَمِنْتَ إِلَى أَهْلِهَاۚ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِۖ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُّمُمْ بِهِۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَيِّعًا بَصِيرًا“۔

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، بے شک اللہ تمہیں کیسی عدمہ نصیحت فرماتا ہے، بے شک اللہ خوب سنے والا، خوب دیکھنے والا ہے، (النساء: 58)۔“

(۲) ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَخُونُو اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَتَخُونُو أَمْنِتُكُمْ“۔

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ اور رسول کے بارے میں خیانت نہ کرو اور نہ ہی آپس کی امانتوں میں خیانت کرو، (الانفال: 27)۔“

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے خیانت کا معنی ہے: قرآن وہن کے احکام سے روگردانی کی جائے یا ان میں باطل نظریات کو شامل کیا جائے یا شریعت کے حکم کو چھپایا جائے جیسا کہ یہودی علماء کرتے تھے، نیز فرمایا:

”إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَانِثِينَ“ -

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا، (الانفال: 58)۔“ -

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی بھی امانت میں خیانت کرنے والا بدترین انسان ہے، ایک اور مقام پر فرمایا: ”وَمَنْ يَغْلِبْ يَأْتِ بِمَا غَلَبَ لِيَوْمَ الْقِيَمَةِ“ -

ترجمہ: ”اور جو شخص خیانت کرے گا، وہ خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن لے کر آئے گا، (آل عمران: 161)۔“ ایک اور مقام پر فرمایا:

”فَإِنْ أَمْنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلَيُؤْدِي إِلَيْهِ أُوتُمْنَ أَمَانَتَهُ وَلَيُبَيَّقَ اللَّهُ رَبَّهُ“ -

ترجمہ: ”پس اگر تم میں سے ایک کو دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ دوسرے کی امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کارب ہے، (ابقرہ: 283)۔“ -

اگرچہ عرف میں امانت سے مراد یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے پاس اپنی کوئی چیز یا مال امانت کے طور پر رکھے، لیکن ان آیات میں امانت ادا کرنے کا حکم عام ہے، خواہ عقائد و عبادات میں ہو یا مالی معاملات میں، حدیث پاک میں ہے:

”عَنْ أَيِّ هُرِيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَذْ أَلَامَانَةَ إِلَى مَنِ اتَّهَمَنَكَ، وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ“ -

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تمہارے پاس امانت رکھے، اس کی امانت ادا کرو اور جو تمہارے ساتھ خیانت کرے اس کے ساتھ خیانت نہ کرو، (ابوداؤد: 3529)۔“ -

جھوٹ حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے آل عمران: 61 میں جھوٹوں پر لعنت فرمائی ہے۔

سورہ ”المنافقون“ میں منافقوں کو ان کے دعوائے ایمان میں بھی جھوٹا قرار دیا ہے۔

جھوٹے انسان کی ایک ثانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سی سنائی بات کو (تحقیق کے بغیر) بیان کرتا پھرے،

(صحیح مسلم: 5)، ایک اور حدیث میں ہے:

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، پھر دریافت کیا: کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، پھر سوال ہوا: کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔“ -
(موطأ امام مالک: 3630)

ایفائے عہد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
”وَأُذْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُلًا“، ترجمہ: ”اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں (آخرت میں) باز پرس ہوگی، (بنی اسرائیل: 34)۔“
سورہ مونون میں کامل مومن کی متعدد صفات بیان کرتے ہوئے رب کریم نے فرمایا:
”(کامل مومن) وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہد کی پاسداری کرتے ہیں، (المونون: 8)۔“

حدیث نمبر: 12

ایمان کی متعدد شاخیں

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ قَالَ: الْإِيمَانُ بِضُعْمٍ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضُعْمٍ وَسِتُّونَ شَعْبَةً فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَامَةُ الْأَذْيَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ“، (متفق علیہ)۔

(ریاض الصالحین، باب فی بیان کثرۃ طرق الخیر، حدیث التاسع، ص: 77)

الغاظ	معانی	الغاظ	معانی	معانی	معانی
بِضُعْمٍ	عربی زبان میں اس کا اطلاق تین تا نو آذی پر ہوتا ہے	أَذْيَى	عربی نقصان یا تکلیف کا باعث ہو	أَفْضَلٌ	دو رکنا، ہٹانا
سَبْعُونَ	ستر	إِمَامَةٌ	بہترین	أَنْفَلٌ	سب سے معمولی
سِتُّونَ	ساتھ	شُعْبَةٌ		أَطْرَيْقٌ	شاخ
					رات

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایمان کی سائھ یا ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں، جن میں سے بہترین شاخ کلمہ طیبہ ہے اور سب سے معمولی شاخ راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔"

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 9، صحیح مسلم: 152، سنن ابو داؤد: 4643)

تشریح:

ایمان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک بسیط حقیقت ہے، تصدیق قلبی کا نام ہے، زبان سے اقرار اس کے لیے شرط ہے اور اعمال اس کا ثمر اور نتیجہ ہیں، اس کو حدیث پاک میں "شعبہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان کی متعدد شاخیں ہیں، اس حدیث مبارک میں ان کی تعداد 63 اور 69 کے درمیان یا 173 اور 79 کے درمیان بتائی گئی ہے۔ ایمان کی اعلیٰ و افضل شاخ کلمہ توحید کا اقرار اور اس پر تکمیل کا رکھنا ہے اور ادنیٰ شاخ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔

اس اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان تمام ارکانِ دین، احکامِ شریعت، مامورات (کرنے کے کام) اور منکرات (نہ کرنے کے کام) ہیں، ان میں فرض، واجب، سنت، مستحب، مباح، حرام اور مکروہ کے اعتبار سے ہر ایک کا اپنا اپنا درجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان احکامِ شریعت کو ایمان کے مختلف شعبوں اور شاخوں سے تعبیر فرمایا ہے، بعض اوقات کسی چیز کا عدد اس کی تعین کے لیے ہوتا ہے اور بعض اوقات کثرت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہوتا ہے، یہاں یہ دو سر امعنی قیاس کے زیادہ قریب ہے، اصل حقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو معلوم ہے۔

حدیث پاک میں اعلیٰ و افضل درجے میں کلمہ طیبہ کا ذکر ہے اور ادنیٰ درجے میں اس بات کا ذکر ہے کہ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے، جیسے کوئی کائنات جو کسی کو چھکتا ہے یا کوئی گندگی جو کسی کو ناپاک کر سکتی ہے یا کیلے کے چھکلوں کی طرح کوئی چیز جس سے پھنس

کر کسی کو چوت لگ سکتی ہے، وغیرہ۔

یہ بظاہر اعمال ہیں، لیکن انہیں ایمان کے شعبہ جات یا شاخیں اس لیے قرار دیا جائیں ہے کہ نیک اعمال پر عمل پیرا ہونا اور برے اعمال سے بچنا ایمان ہی کا شمر اور نتیجہ ہے اور ان پر آخرت کا اجر ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔

”حیا“ کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اس کا ذکر علیحدہ فرمایا۔ ”حیا“ سے مراد بندہ مومن کے قلب و ذہن اور ضمیر کی ایک ایسی صفت یا کیفیت ہے جو انسان کو اپنے رب کی نافرمانی سے روک دے اور اس کی اطاعت پر براہینخت کرے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”إذَا لَمْ تَسْتَعِنْ فَاصْنَعْ مَا شِئْتُ“۔

ترجمہ: ”جب تم میں حیانہ رہے، تو پھر جو چاہو کرو، (صحیح البخاری: 6120)۔

یعنی یہ باطنی دروحانی صفت ہر برائی کے راستے میں ایک رکاوٹ ہوتی ہے، جب یہ نہ رہے تو برائیوں کے آگے اب کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی، پھر بندہ بے لگام ہو جاتا ہے، جو جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے۔ حیا مومن کی صفت ہے، حدیث پاک میں ہے:

(۱) ”الْحَيَاءُ وَالْبَعْدُ شُعْبَتَانِ مِنَ الْإِيمَانِ، وَالْبَذَاءُ وَالْبَيَانُ شُعْبَتَانِ مِنَ النِّفَاقِ“۔

ترجمہ: ”حیا اور کم گوئی ایمان کی دو شاخیں ہیں، فخش کلامی اور کثرت کلام نفاق کی دو علامتیں ہیں، (سنن ترمذی: 2027)۔“

امام ترمذی کی تشریح کے مطابق بیان کثرت کلام کو کہتے ہیں، یعنی یا تو نی ہونا اور اس کا مصدقہ وہ خطباء یا اہل قلم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف با اثر لوگوں کی تعریف و توصیف میں بے جام بالغہ کرتے ہیں اور حد سے گزر جاتے ہیں۔

(۲) ”الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ وَالْإِيمَانُ فِي الْجَنَّةِ، وَالْبَذَاءُ مِنَ الْبَحْفَاءِ، وَالْبَحْفَاءُ فِي النَّارِ“۔

ترجمہ: ”حیا ایمان سے ہے اور ایمان (انجام کار) جنت میں لے جاتا ہے اور فخش گوئی بدکاری ہے، جو جہنم میں لے جاتی ہے، (سنن ترمذی: 2009)۔“

حدیث نمبر: 13

مومنوں کے آپس میں تعلق کی مثال

”عَنْ شِبَّيْرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ: مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِهِمْ وَتَرَاحِبِهِمْ وَتَعَاوُفِهِمْ، مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضُّوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُسْنِ“، متفقٌ علیہ۔
(ریاض الصالحین، باب تعظیم حرمات المسلمين وبيان حقوقهم، حدیث الثالث، ص: 129)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
تَوَادِهِمْ	ایک دوسرے کے ساتھ شفقت میں	تَعَاوُفِهِمْ	ایک دوسرے سے محبت کرنے میں
تَرَاحِبِهِمْ	ایک دوسرے پر حرم کرنے میں	تَدَاعَى	ایک دوسرے کو بلانا
إِشْتَكَى	شکایت کرتا ہے	السَّهْرُ	بیداری
وَالْحُسْنِ	بخار	سَائِرُ	باقی، تمام

ترجمہ: ”حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومنوں کی ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے، ایک دوسرے پر حرم کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آنے کی مثال ایک جسم کی ہی ہے کہ جب اس کے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچے، تو سارا بدن بیداری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

”تَوَادِهِمْ“ کا مادہ ”وَد“ اور ”مَوَدَّة“ (محبت، چاہت) ہے اور ”تَعَاوُفِهِمْ“ کی اصل ”عطف“ (میلان، شفقت) ہے۔

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 6011، صحیح مسلم: 6463)

شرح:

اس حدیث مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنوں کے باہمی تعلق ایک حسی مثال کے ذریعے بیان فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری امت اور ملت کو ایک جنم قرار دیا

ہے، کیونکہ ایک انسانی جسم مختلف اعضاء کے آپس میں ایک خاص ترکیب کے ساتھ مل کر تشکیل پاتا ہے، جیسے سر، چہرہ، آنکھیں، کان، ناک، گردن، سینہ، پیٹھ، رانیں اور ٹانگیں وغیرہ اور جب انسان کے جسم کے ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً درد، چوت لگ جانا، زخمی ہونا وغیرہ تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کر کے بے چین ہو جاتا ہے، نیند نہیں آتی، بخار میں بتلا ہو جاتا ہے، وغیرہ۔ اسی طرح پوری امت ایک جسم کی مانند ہے، اس جسد ملیٰ میں ہر فرد ایک عضو کی مانند ہے، ہر ایک اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب ایک فرد کو کوئی تکلیف پہنچ تو پوری ملت اس تکلیف کو محسوس کرے اور اس کے ازاں کی کوشش کرے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہمیں خود غرضی، نفسی نفسی، حرمس و ہوس، بے حسی اور بے ضمیری کی طی بیماری لاحق ہو چکی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ترجمہ: (۱) ”جو اپنے کسی مسلمان بھائی کی حاجت کو پورا کرے، اللہ اس کی حاجت روائی فرمائے گا اور جو اپنے مسلمان بھائی کی کسی تکلیف کو دور کرے گا، اللہ تعالیٰ (اس کی جزا کے طور پر) قیامت کے دن اس کی کسی تکلیف کو دور فرمائے گا اور جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا، (صحیح البخاری: 2442)۔“

ترجمہ: (۲) ”جو شخص اپنے بھائی کی آبرو کا دفاع کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے چہرے سے آگ کو دور فرمائے گا، (سنن ترمذی: 1931)۔“

حدیث نمبر: 14

جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ قَالَ: عَذِيبَتِ امْرَأَةٌ فِي هَذَهِ حَبَسَتْهَا حَتَّىٰ مَاتَتْ، فَدَخَلَتْ فِيهَا النَّارَ، لَا هُنَّ أَطْعَمْتُهَا وَسَقَتُهَا، إِذْ هُنَّ حَبَسَتْهَا وَلَا هُنَّ تَرْكَتُهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ“، مُتَفَقُ عَلَيْهِ۔
(ریاض الصالحین، باب ائمہ عن تعذیب العبد والدابة، حدیث الاول، ص: 610)

الغاظ	معانی	الغاظ	معانی
الغاظ	معانی	الغاظ	معانی
الغاظ	معانی	الغاظ	معانی
الغاظ	معانی	الغاظ	معانی

عذاب میں بمتلا ہو گئی	عذاب میں بمتلا ہو گئی	سقّتها	اسے پلا یا	عذاب میں بمتلا ہو گئی
عورت		حبس تھا	اسے قید کھا	امرأة
بلى		ترکشہا	اسے چھوڑ دیا	هُرَّةٌ
مرگی		شائل	وہ کھاتی ہے	سَجَنَتْهَا
ماتت		خشاش	حضرات	مَاتَتْ
آطعہ تھا				اسے کھلایا

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک عورت ایک بلى کی وجہ سے عذاب میں بمتلا کر دی گئی، (وہ اس طرح کہ) اس نے اس بلى کو قید رکھا یہاں تک کہ وہ مر گئی، تو اس کے وجہ سے وہ جہنم میں داخل کی گئی، (کیونکہ) نہ اس عورت نے اس بلى کو کھلایا، نہ پلا یا اور نہ ہی اسے آزاد کیا کہ زمین کے کیڑے کوڑے کھا لیتی (اور اپنا شکار خود تلاش کرتی اور اس کی زندگی بچ جاتی)۔“

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 3483، صحیح مسلم: 5744)

تشریح:

رسول ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، آپ نے ہر ایک کے حقوق کی پاس داری کی تعلیم دی، یہاں تک کہ جانوروں اور پرندوں پر بھی رحم فرمانے کی تلقین فرمائی ہے جیسا کہ اس حدیث پاک میں ہے کہ عورت پر لازم تھا کہ یا تو اس بلى کو پانی اور خوراک دے دیتی یا اسے آزاد کر دیتی کہ وہ خود اپنا شکار تلاش کرے، اللہ تعالیٰ کی کسی بھی مخلوق پر بے جا ظلم و زیادتی کی اجازت نہیں ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی رحمت سے انسان تو کیا جانور اور پرندے بھی محروم نہیں رہے، کیونکہ آپ محض ”رَحْمَةُ الْمُؤْمِنِينَ“ یا ”رَحْمَةُ الْإِنْسَانِ“ نہیں تھے بلکہ ”رَحْمَةُ الْعَالَمِينَ“ تھے اور جانور بھی بعض اوقات زبان حال سے طلب رحمت کے لیے آپ کی

خدمت اقدس میں رجوع کرتے تھے، ایک روایت میں ہے:

”ایک مرتبہ ایک انصاری صحابی کے اونٹ نے بارگاہ رسالت میں اپنے مالک کی شکایت کی، آپ نے اس پر دستِ شفقت پھیرا اور اس کے مالک سے فرمایا: ”جس جانور کا اللہ تعالیٰ نے تجھے مالک بنایا ہے، کیا اس کے بارے میں تجھے اللہ کا خوف نہیں ہے؟، اس نے میرے پاس شکایت کی ہے کہ تو اسے بھوکار کھتا ہے اور بہت زیادہ تکلیف دیتا ہے۔“

اسی طرح ایک طویل حدیث میں ہے:

”ایک شخص (یا ایک روایت کے مطابق ایک فاحشہ عورت) کی بخشش مغض اس بات پر ہو گئی کہ اس نے ایک پیاس سے تڑپتے ہوئے کتے کی تکلیف کو محسوس کیا اور اسے پانی پلانا، کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا چوپائیوں میں بھی ہمارے لیے اجر ہے؟، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ”ہر ذی روح میں اجر ہے، (صحیح البخاری: 2363)۔“

آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ نے از راہِ حرم و شفقت چوپائیوں کو لڑانے، کسی جانور کو باندھ کر نشانہ بنانے، کسی چوپائے یا جانور کو باندھ کر ہلاک کرنے اور حیوان کو مُشْلَه (یعنی اس کی ناک، کان کاٹ کر شکل بگاؤنے) بنانے سے منع فرمایا۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ نے جانوروں کو جلانے یا جانوروں کا گھر جلانے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا: ”اللہ کے سوا کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ کسی کو آگ کا عذاب دے“، ایک حدیث میں ہے:

آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ ایک مرتبہ سفر میں ایک جگہ اترے، ایک پرندہ آپ کے سر مبارک کے اوپر پھڑ پھڑانے لگا، گویا وہ آپ سے شکایت کر رہا تھا کہ کسی نے اس کے انڈے لے لیے ہیں، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ”کس نے اس کے انڈے لے کر اسے تکلیف پہنچائی ہے“، ایک شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے اس کے انڈے لیے ہیں، نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖہ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ”اس پر حرم کرو اس کے انڈے دا پس کرو، (الا دب المفرد للبخاری: 382)۔“

حدیث نمبر: 15

مسلمان کی جان و مال کی حرمت

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّدَ: الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَخُونُهُ وَلَا يَكْذِبُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ عِرْضُهُ وَمَالُهُ وَدَمُهُ، التَّقْوَى لِهُنَّا، بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ إِنْ يَعْلَمَ أَخَاهُ الْمُسْلِمِ“، رَوَاهُ التَّرمِذِيُّ وَقَالَ: حديث حسن۔

(ریاض الصالحین، باب تعظیم حرمات المسلمين و بیان حقوقہم، حدیث: 13، صفحہ: 131)

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
اس کا خون	دَمْهُ	بھائی	آخ
حقیر جانتا ہے	يَخْتَفِرَ	اس سے خیانت نہیں کرتا	لَا يَخُونُهُ
اپنے بھائی کو	أَخَاهُ	اے بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا	لَا يَخْذُلُهُ
		عزت	عِرْضُ

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس کے معاملے میں خیانت نہیں کرتا، نہ اس پر جھوٹ بولتا ہے اور نہ ہی اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے، ایک مسلمان کا سب کچھ اس کی عزت، اس کا مال، اس کا خون، دوسرے پر حرام ہے، تقویٰ یہاں (دل میں) ہے۔ کسی آدمی کے براہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔“ امام ترمذی نے فرمایا: ”یہ حدیث حسن ہے۔“

حدیث کے حوالہ جات: (سنن ترمذی: 1927، سنن ابو داؤد: 4882)

تشریح:

اس حدیث پاک میں مسلمانوں کے باہمی رشتے کو واضح کیا گیا ہے اور مسلمانوں

کی حرمت، عظمت اور تقدس کو بھی بیان فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ”ایک مسلمان کی جان و مال اور عزت آبرود و رسول پر حرام ہے۔“

خطبہ ججۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے مسلمان کے جان، مال اور عزت و آبرو کے تقدس کو بیان فرمایا اور اس کی حرمت کو مکہ مکرہ، یومِ عرفہ اور ماہِ ذوالحجہ کی حرمت سے تشبیہ دی۔ اسی موقع پر حضور ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ”میرے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جانا، وہ یوں کہ تم ایک دوسرے کی گرد نیس مارنے لگو۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے مسلمانوں کی باہمی خوزیری کو کفر کے مشابہ قرار دیا۔ اسلام نے نہ صرف مسلمان بلکہ ہر بے قصور انسان کی جان کا تحفظ کیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

”مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَانَتِهَا قَتْلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَ مَنْ أَحْيَاهَا فَكَانَهَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا۔“

ترجمہ: ”جس نے کسی ایک انسان کو قصاص یا زمین میں فساد برپا کرنے (کے جرم) کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک انسان کی جان کو بچالیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کی زندگی کو بچالیا، (المائدہ: 32)۔“

اسلام ایک عام انسان کی جان کو اتنا احترام دیتا ہے کہ ایک بے قصور انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے اور بے قصور انسان کی جان بچانے کو پوری انسانیت کی جانوں کا تحفظ قرار دیتا ہے، کیونکہ بے قصور انسانی جان کی حرمت پوری انسانیت کا اجتماعی حق ہے، رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

ترجمہ: ”ایک مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی مانند ہے جس کا ہر جز دوسرے کی مضبوطی اور استحکام کا سبب بتا ہے اور پھر آپ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق اور تقویت کی وضاحت کے لیے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملا دیا، (صحیح البخاری: 481)۔“

اس حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے

ساتھ خیانت، جھوٹ اور اس امر سے منع فرمایا کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو کسی مصیبت میں بتلا دیکھے تو اسے بے یار و مددگار چھوڑ دے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ مصیبت سے نجات دلانے کے لیے وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے، پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تقویٰ کا مرکز دل ہے۔

اس حدیث میں ایک اور اخلاقی شعبہ جس کی تعلیم فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو اپنے آپ سے کم تر اور حقیر نہ سمجھے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ”عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، ایک شخص نے عرض کیا: ایک شخص چاہتا ہے: اس کا لباس اچھا ہو، اس کے جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر ہے)، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جیل ہے اور جمال (خوبصورتی) کو پسند فرماتا ہے، (دراصل) حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر جانے کا نام تکبر ہے،“

(صحیح مسلم: 259، سنن ترمذی: 1999)

حدیث نمبر: 16

توبہ کی اہمیت

”عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! تُوبُوا إِلَى اللَّهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ فَإِنِّي أَتُوْبُ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةً“، رواۃ مُسْلِم۔

(مشکوٰۃ المصالح، کتاب الصوم، باب الاستغفار والتوبہ، فصل اول، ص: 203)

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
سو (100)	مِائَةٌ	توبہ کرو	تُوبُوا
مرتبہ	مَرَّةٌ	میں توبہ کرتا ہوں	أَتُوْبُ

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو اور اس سے مغفرت طلب کرو، کیونکہ میں ایک دن میں سو بار اللہ سے توبہ کرتا ہوں، (صحیح مسلم: 6732)۔“

تشریح:

توبہ کے لفظی معنی ہیں: رجوع کرنا، ”تائب“ کے معنی ہیں: توبہ کرنے والا اور ”تَوَاب“ کے معنی ہیں: بہت توبہ کرنے والا، قرآن مجید میں مبالغہ کے صیغہ کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی آیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی صفت کے طور پر بھی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(۱) ”إِنَّهُ هُوَ الشَّوَّابُ الرَّحِيمُ“ -

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان ہے، (البقرہ: 37)۔“

(۲) ”إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَابِينَ وَيُحِبُّ الْمُسْتَطَهِرِينَ“ -

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں اور نہایت پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (البقرہ: 222)۔“

توبہ جب بندے کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی ہیں: بندے کا اپنے گناہوں کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور جب اللہ تعالیٰ کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی ہیں: ”اللہ تعالیٰ کا اپنی مغفرت کے ساتھ بندے کی جانب توجہ فرمانا“، علماء نے فرمایا: توبہ کا معنی ہے: ”محصیت سے طاعت کی طرف، غفلت سے ذکر کی طرف اور غیاب سے حضور کی طرف رجوع کرئے“ اور اللہ کے توبہ قبول کرنے کا معنی یہ ہے: ”دنیا میں بندے کے گناہ پر ستر (پردہ) کرے، اس طرح کہ کوئی اس کے گناہوں پر مطلع نہ ہو اور آخرت میں اس کو سزا نہ دئے“۔

علامہ علی قاری علامہ طبی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”توبہ کا شرعی معنی ہے: گناہ کو براجان کرنے کی الفور ترک کر دے، اس سے جو تقصیر ہوئی ہے، اس پر نادم ہو اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا عزم صھیم کرے اور جو گناہ اس سے ہو گیا ہے، اس کا تدارک اور تلافی کرے، (مرقات، ج: ۵، ص: 122)۔“

قرآن و سنت میں جہاں کہیں انبیاء و رسول عظام کے واقعات میں ان کی طرف

سے توبہ یا رجوع الی اللہ کا تذکرہ ہے، تو اس سے مراد یہ نہیں کہ کسی نبی یا رسول نے کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہوگی، بلکہ انبیاء و رسول کا توبہ واستغفار کرنا دراصل درجات کی بلندی اور مزید قرب الہی کے حصول کے لیے یا اپنی امت کی تعلیم و تربیت کے لیے ہوتا ہے۔ توبہ کے لیے صرف زبان سے کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ یا اللہ! میں توبہ کرتا ہوں، بلکہ یہ ایک جامع قلبی کیفیت، پختہ ارادے، عہد و پیمان اور قول فعل کی یگانگت کا نام ہے، لہذا توبہ کی چند لازمی شرائط ہیں:

- (۱) بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہ کا اعتراف (Confession) کرے۔
- (۲) اپنے فعل پر نادم ہو۔
- (۳) اپنے رب سے اپنی معصیت پر صدقِ دل سے معافی مانگے۔
- (۴) آئندہ ہر ایسی معصیت سے اجتناب کرنے کا پختہ عہد کرے۔
- (۵) اگر شریعت نے اس گناہ کی تلافی کی کوئی صورت مقرر کی ہے تو اس کے مطابق اس کی تلافی کرے، مثلاً: قضا نمازیں پڑھے، روزوں کی قضا کرے، ماضی کی زکوٰۃ ادا کرے، قسم کا کفارہ دے، نذر کو پورا کرے وغیرہ اور اگر بندے کا حق غصب کیا ہے تو اسے واپس کرے، اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کرے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ اپنے گناہ گار بندے کو کسی بشری کوتا ہی یا معصیت کی بنا پر ہمیشہ کے لیے دھنکارتا نہیں، مردوں نہیں بھہرا تا، بلکہ اگر وہ معصیت سے پلٹ کر اطاعت کی طرف آجائے تو رب کریم دوبارہ اسے اپنی آغوشِ رحمت میں لینے کے لیے تیار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہال زندگی کے آخری لمحے تک توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے، احادیث میں ہے:

- (۱) ”عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے، جب تک اس پر سکرات موت کا عالم طاری نہ ہو جائے، (سنن ترمذی: 3537)“

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے، (صحیح البخاری: 4757)۔

(۳) اگر المزني بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو، میں بھی دن میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں، (صحیح مسلم: 2702)۔

رسول اللہ ﷺ تو معصوم تھے، آپ سے معصیت کا صادر ہونا ناممکن تھا، اس کے باوجود آپ کا توبہ کرنا چند وجوہ سے تھا:

- (۱) تعلیم امت کے لیے، امت کے گناہ گاروں کو توبہ کی ترغیب دینے کے لیے۔
- (۲) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرتِ قطعی کی سند ملنے پر نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے۔
- (۳) بلندی درجات کے لیے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے محبوب بندوں کے لیے بلندی درجات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

حدیث نمبر: 17

بیٹیوں کی عمدہ تربیت کا اجر

عَنْ أَنَّى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ قَالَ مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتَّى تَبَلُّغا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ كَهَاتَيْنِ، وَضَمَّ أَصَابَعَهُ، رَوَاهُ مُسْلِمٌ، قَالَ النَّبِيُّ جَارِيَتَيْنِ أَئِي بُشْتَيْنِ۔ (ریاض الصالحین، باب ملاطفة الشیعیں والبنات، حدیث: 8، ص: 146)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
عال	پرورش کی	تَبَلُّغا	بالغ ہو گئیں
جاریتین	دو بیٹیاں	كَهَاتَيْنِ	ان دو بیٹیوں کی مثل برابری

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے دو لاکیوں کے بالغ ہونے تک پرورش کی، قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح آئیں

گے (راوی کہتے ہیں): آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں باہم ملا دیں، ”علامہ نووی فرماتے ہیں: ”جَارِيَتُينَ“ کا مطلب ہے: دو بیٹیاں۔

حدیث کے خواہ جات: (صحیح مسلم 6572، من ترمذی: 1914)

تفصیل:

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بچیوں کی خوشی سے پرورش کرنے والے والدین کو روزِ قیامت اپنا قرب اور رفاقت کی نوید سنائی ہے۔ عام طور پر لوگ بچیوں کی پیدائش سے ناخوش ہوتے ہیں اور ان کی پرورش کو اپنے لیے بوجھ خیال کرتے ہیں اور زمانہ جاہلیت میں لوگ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ اپنے اس گناہ کو نہ تو وہ جرم سمجھتے تھے اور نہ ان کے والوں میں ان بچیوں کے لیے کوئی رحم دلی یا ہمدردی تھی۔

ایسے تاریک ماحول میں تعلیماتِ مصطفیٰ ﷺ کی کرنیں نور بن کر بکھرتی ہیں اور سارے عالم کو منور کر دیتی ہیں، جس معاشرے میں عورت کی کوئی وقعت و قدر نہ تھی، وہاں اخلاق و کردار ایسے سنور جاتے ہیں کہ بھی کو رحمت، بیوی کو عزت، اور ماں کو جنت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ گویا ہر رشتہ، عورت کو قابلِ احترام ہستی کے روپ میں پیش کرتا ہے، اسے زندہ درگور ہونے سے بچا کر انسانیت کے عظیم رتبے پر بٹھا دیا۔ عورت پر خاندان کی کفالت کی ذمہ داری نہیں رکھی بلکہ گھر کے ماحول کو خوبصورت (جنت) بنانے کی عظیم ذمہ داری سونپ دی، بلکہ ہر رشتہ کے روپ میں اسے اپنے رشتہ داروں کی جانب ادا اور ترکے میں وارث بنایا۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے دو بچیوں کی کفالت اور ان کی تعلیم و تربیت کرنے والوں کو آخرت کے ایک بہت بڑے اعزاز سے نوازا ہے کہ اسے جنت میں رسالت مأب ﷺ کا خصوصی قرب عطا ہوگا اور اس قرب کی کیفیت کو دو انگلیوں کے قرب کے مساوی قرار دیا۔ اسلام میں اولاد کے حقوق برابر ہیں، لیکن عورت کو اللہ تعالیٰ نے تنہیٰ اعتبار سے اپنی حکمت کے تحت نازک بنایا ہے، اتنے عظیم اجر کی بشارت اس لیے بھی دی گئی کہ

لوگ حب رسول ﷺ سے سرشار ہو کر اور قرب رسول ﷺ کی چاہت میں اپنی بچیوں کی اچھی اور عمدہ پرورش کریں، ان کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دیں۔

حدیث نمبر: 18

ہر شخص جواب دہے

”عَنْ أَبْنِيْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَنِ الْبَيْتِ قَالَ: كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ، وَالبَرَّةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ زُوْجِهَا وَوَلَدِهَا، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ“، مُتَفَقٌ عَلَيْهِ۔

(ریاض الصالحین، باب حق الزوج علی المرأة، حدیث: 3، ص: 152)

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
ابنی رعیت، عوام	رَعِيَّتِهِ	تم میں سے ہر ایک	كُلُّكُمْ
گھروالے، زیر کفالت افراد	أَهْلِ بَيْتِ	نگہبان، حاکم، چرواحا	رَاعٍ
گھر	بَيْتِ	جواب دہ	مَسْئُولٌ

ترجمہ: ”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص حاکم ہے اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے متعلق سوال ہوگا، (کسی قوم، قبیلے یا ملک کا) سربراہ اپنی رعایا پر ذمہ دار ہے، ہر شخص اپنے خاندان پر ذمہ دار ہے، عورت (اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں) اس کے گھر کی نگہبان ہے، (الغرض) تم میں سے ہر ایک (اپنے دائرہ اختیار میں) ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے متعلق باز پرس ہوگی۔“

نوٹ: صحیح مسلم کے اصل متن میں لفظ ”اَلَا“ کا اضافہ ہے (اور یہ کلمہ عربی میں اس لیے آتا ہے کہ مخاطب متوجہ ہو جائے کہ انتہائی اہم بات بیان کی جانے والی ہے) اور ”وَالعَبْدُ رَاعٍ عَلَى مَالٍ سَيِّدٌ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ“ (اور نوکرا پہنچانے والے مال کا نگہبان ہے،

اس سے اس کی ذمہ داری کے متعلق سوال ہوگا) کا بھی اضافہ ہے۔

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 5200، صحیح مسلم: 4643)

تشریح:

حدیث میں اس امر کی تعلیم دی گئی ہے کہ ہر ایک شخص کا ایک دائرہ کار اور دائرة اختیار ہے، کسی کام کسی کا زیادہ اور کمترین ذمے داری کی سطح یہ ہے کہ انسان اپنی ذات پر حاکم ہے، پس ہر ایک سے اس کی حیثیت کے مطابق باز پرس ہوگی۔ الغرض جواب وہی لازمی امر ہے، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں تو اس سے راہ فرار اختیار کی ہی نہیں جاسکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ“۔

ترجمہ: ”اور (قیامت کے دن) اللہ کے سواتھ مہارا کوئی مددگار اور مالک نہیں، (التوبہ: 116)۔“

قرآن نے یہ بھی بتایا کہ ہر انسان سے اتنی جامع باز پرس ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہر نعمت کے بارے میں سوال ہوگا، فرمایا:

(۱) ”إِنَّ السَّمْعَ وَالبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُمْ مَسْؤُلًا“۔

ترجمہ: ”(ہر انسان سے اس کی) سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی (استعداد کے بارے میں) یقیناً باز پرس ہوگی، (بی اسرائیل: 36)۔“

(۲) ”ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَ مَيْدَنِ عَنِ التَّغْيِيرِ“۔

ترجمہ: ”پھر آج (قیامت) کے دن تم سے (رب کی عطا کی ہوئی) نعمتوں کے بارے میں لازمی طور پر پوچھا جائے گا (کہ تم نے انہیں رب کی رضا میں استعمال کیا یا اس کی معصیت میں، (الٹکاڑ: 8)۔“

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”(درحقیقت) دانا شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور موت کے بعد (یعنی آخرت) کے لیے عمل کرے اور (سب سے) عاجز (وکمزور) شخص وہ ہے، جس نے اپنے

نفس کو خواہشات کے تابع کر دیا اور اللہ تعالیٰ سے آرزویں کرتا پھرتا ہے۔

(سنن ترمذی: 2459)

امام ترمذی کہتے ہیں: ”دانَ نَفْسَهُ“ کے معنی ہیں: ”قبل اس کے کہ قیامت کا یوم حساب آجائے، اس نے اس دنیا ہی میں خود اپنا احتساب کر لیا“ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے:

”قبل اس کے (قیامت کے) دن تمہارا حساب ہو، خود ہی اس دنیا میں اپنا حساب کرلو (یعنی اپنی اصلاح کرلو) اور (آخرت کی عدالت میں) ایک بڑی پیشی کے لیے اپنے آپ کو خوب تیار کرلو اور جس نے دنیا میں کوڈاپنا احتساب کر کے (اپنی اصلاح کر لی) اس کا آخرت کا حساب (ان شاء اللہ) آسان ہو جائے گا۔“

اور میمون بن مهران نے کہا: ”بندہ پا کیزہ کردار کا مالک ہو، ہی نہیں سکتا تا وقت تکہ اپنا احتساب اس طرح نہ کرے جس طرح اپنے فریقِ مخالف کا کرتا ہے کہ اسے (اس معیار کا) طعام و لباس کہاں سے حاصل ہوا۔

حدیث پاک میں ارشاد ہوا: ”ہر ایک سے اس کی حیثیت کے مطابق باز پرس ہو گی۔“
اگر ایک شخص امیر خاکم یا سربراہِ مملکت و حکومت ہے یا منصب عدالت پر فائز ہے تو اس کا احتساب بھی اتنا ہی سخت ہو گا: ”جن کے رتبے ہیں سوا، ان کو سوامشکل ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث کے مطابق فقراءِ مونین، امراءِ مونین سے پانچ سو سال پہلے جنت میں چلے جائیں گے، کیونکہ امراء اہل ایمان سے تفصیلی جواب طلبی ہو گی کہ انہوں نے جاہ و منصب و اقتدار اور مال و دولت کس طرح حاصل کی اور ان نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا، آیا حلال ذرائع سے یہ سب کچھ حاصل کیا یا حرام ذرائع سے یعنی مکروہ فریب، دھوکا دہی، ظلم و تعددی اور باطل طریقوں سے یہ سب کچھ حاصل کیا، اسی طرح کسی محکمے، شعبے یا خاندان کے سربراہ سے اس کی حیثیت کے مطابق باز پرس ہو گی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”قُوَا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارٌ“ -

ترجمہ: ”اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ، (التحريم: 6)۔“ -

حدیث نمبر: 19

پڑوکی کی اہمیت

”عَنِ إِبْرَاهِيمَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ قَالَ: وَاللَّهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللَّهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللَّهِ لَا يُؤْمِنُ! قَيْلَ: مَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقُهُ“، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةِ الْمُسْلِمِ: ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقُهُ“، الْبَوَائِقُ: ”الْغَوَائِلُ وَالشَّرُورُ“ -

(ریاض الصالحین، باب حق الجار والوصیة، حدیث: 3، صفحہ: 160)

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
لَا يُؤْمِنُ	ایمان نہیں لائے گا	بَوَائِقُهُ	بَوَائِقُهُ کی جمع، مصیبت، شر، برائی
لَا يَأْمَنُ	مامون و محفوظ نہ ہو	الْغَوَائِلُ	غَائِلَةُ کی جمع، ہلاکت، فساد، شر
جَارُهُ	اس کا پڑوکی	وَالشَّرُورُ	شر کی جمع

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! (تین مرتبہ آپ نے قسم کے یہ الفاظ ارشاد فرمائے)، وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا، صحابہ نے عرض کیا: کون یا رسول اللہ!، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جس کے ہمائے اس کی شرارتیں سے محفوظ نہ ہوں“ - امام نووی فرماتے ہیں: صحیح مسلم کی روایت میں یہ ارشاد ہے: ”وَهُوَ شَخْصٌ جَنَّتَ مِنْ دَخْلِهِ لَا يَوْمٌ هُوَ كَانَ فِي شَرِّ أَشْرَارٍ“ - ”الْبَوَائِقُ“، الْبَوَائِقُ کی جمع ہے، اس کا مطلب ہے: مصیبت، فساد، ہلاکت، برائی۔

الْغَوَائِلُ: الْغَائِلَه کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں: فساد، ہلاکت، شر۔

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 6016، صحیح مسلم: 46)

تشریح:

رسول اللہ ﷺ نے پڑویوں کے حقوق کی اس قدر تاکید و اہمیت بیان فرمائی ہے کہ مذکورہ حدیث میں ابتداء ذات باری تعالیٰ کے اسم مبارک کی قسم ارشاد فرمائی اور پڑوی کو ایذا پہنچانے والے شخص کی جنت سے محرومی کی وعدہ سناتی ہے۔

تین قسم کے پڑوی:

عربی میں پڑوی اور ہمسائے کو ”جار“ اور پڑوں کو ”جوار“ کہتے ہیں، قرآن نے ہمسائے کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

”وَالْجَارِ الْأَذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ“ -

ترجمہ: ”اور رشتہ دار ہمسائے، اجنبی پڑوی اور مجلس کے ساتھی کے ساتھ نیک سلوک کرو۔“

(النساء: 36)

پہلا درجہ رشتہ دار پڑوی کا، دوسرا اجنبی پڑوی کا اور تیسرا مجلس یا سفر کے ساتھی کا ہے۔ ”وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ“ (پہلو کے ساتھی) سے مراد ہم جماعت، ہم سفر یا ایک دفتر اور ایک ادارے میں کام کرنے والے بھی ہو سکتے ہیں۔

پڑوی کے حقوق:

غیریب پڑوی کی مالی اعانت کرنا، بوقت ضرورت کام آنا، ہدیے اور تحفے دینا، بیماری کے موقع پر عیادت کرنا، اپنے کسی عمل یا حرکت سے ایذا نہ پہنچانا، انتقال کی صورت میں جنازے میں شریک ہونا، یہ سب پڑوی کے حقوق ہیں۔

نوٹ: پڑوی کے حقوق کے متعلق تفصیل حدیث: 7 میں گزر چکی ہے۔

ہمسائے کی عزت و آبرو کی حفاظت:

زنابدرین اور سنگین جرم اور گناہ کبیرہ ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے: ”پڑوی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنے والا اس گناز یادہ عذاب کا مستحق ہوگا، (مندرجہ: 23854)

غیر مسلم ہمسایہ کا حق:

اسلام نے غیر مسلم ہمسائے سے بھی حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا پڑوی ایک یہودی تھا، ایک بار آپ نے بکری ذبح کی تو گھروالوں سے فرمایا: ”تم نے میرے یہودی ہمسائے کو بھی کچھ بھیجا“۔ اس کا ایک تو انسانی پہلو ہے، کیونکہ اسلام انسانی اقدار کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور دوسرا اس کا فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ غیر مسلم حسن احلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے۔

حدیث نمبر: 20

صلہ رحمی کی برکات

”عَنْ أَنَّىٰ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُسَسْطَلَةً فِي رِثْقَةٍ، وَيُسَأَلَةً فِي أُثْرِهِ، فَلْيَصُلْ رَحِمَةً“، مُتفقٌ علیہ۔ وَمَعْنَى يُسَأَلَةً فِي أُثْرِهِ: أَيُّ يُؤْخَرُ لَهُ فِي أَجْلِهِ وَعُنْرِهِ۔

(ریاض الصالحین، باب بر الوالدین وصلة الارحام، حدیث: 8، صفحہ: 164)

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
اجل، موت	أُثْرِه	جو پسند کرے	مَنْ أَحَبَّ
اسے چاہیے کہ ملائے، تعلق کو جوڑے	فَلْيَصُلْ	کشادہ کیا جائے	يُسَسْطُ
اپنے قربت کے رشتے کو	رَحِمَةً	اسے مہلت دی جائے	يُسَأَلَةً
وقت مقرر، موت کا وقت		آجل	أَجَل

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے یا اس کی عمر دراز کی جائے، وہ صلہ رحمی کرے۔“ علامہ نووی فرماتے ہیں: ”يُسَأَلَةً فِي أُثْرِهِ“ کا معنی ہے: اس کی مدت اور عمر میں مہلت دی جائے۔

حدیث کے حوالہ جات: (صحیح البخاری: 5986، صحیح مسلم: 6404)

تشریح:

ہر شخص کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کی عمر دراز ہو، روزی کشادہ ہو، حالات سازگار ہوں، جو کرنا چاہے کر لے، جو سوچے یا جس چیز کی خواہش کرے، اسے مل جائے۔ اثر کسی کے پیچھے رہ جانے والے آثار کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد موت یا اس کا مقررہ وقت (اجل) ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”فَإِذَا جَاءَءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ“۔

ترجمہ: ”پس جب ان (افراد کی موت یا اموات کے زوال کا) مقررہ وقت آجائے تو اس میں نہ ایک لمحہ کی تقدیر ہوتی ہے اور نہ تاخیر، (الاعراف: 34)، نیز فرمایا:

”إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَءَ لَا يُؤَخُّرُ“۔

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے (کسی کی) موت کا جو وقت مقرر فرمایا ہے، جب وہ آجائے تو پھر وہ مؤخر نہیں ہوتا، (نوح: 4)۔“

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے، اموات کے عروج و زوال کا وقت مقرر ہے، اسی طرح جو رزق مقدر ہے، وہ مل کر رہے گا، جیسا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”رزق اسی طرح بندے کے تعاقب میں رہتا ہے جیسے موت“۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث پاک میں جو عمر کے زیادہ ہونے اور رزق کی کشادگی کی بات کی گئی ہے، اس سے کیا مراد ہے۔

امام سیعی بن شرف نووی نے اس کی یہ توجیہ بیان فرمائی ہے:

”عمر میں زیادتی کے ایک معنی یہ ہیں: اللہ تعالیٰ عمر میں برکت عطا فرماتا ہے، اسے تیکیوں کی زیادہ سے زیادہ توفیق نصیب ہوتی ہے، اس کا زیادہ سے زیادہ وقت ایسے کاموں میں صرف ہوتا ہے جو آخرت میں مفید ہوں گے اور وقت بے مقصد کاموں میں ضائع نہ ہو۔ اسی طرح لوح ححفوظ پر مأمور فرشتوں کے سامنے مثلاً: اس کی عمر چالیس سال درج ہے، لیکن جب وہ وقت اختتام پر آتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ان پر ظاہر فرماتا ہے کہ اس کی عمر میں اضافہ ہو گیا اور یہ

ساری برکات اسے ”صلہ رحمی“ کی برکت سے ملتی ہیں۔ ”صلہ رحمی“ کے معنی ہیں: قربات کے رشتے کو جوڑے رکھنا، اس سے عمر اور روزی دونوں میں برکت ہوتی ہے۔

”ازحام“ رحم کی جمع ہے، یہ لفظ ”رحم“ اور ”رحم“ بچہ دانی (Womb) کے معنی میں آتا ہے۔ اس کا مادہ اشتراق ”رحم“ ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات ”رحمن“ اور ”رحمیم“ مشتق ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی انہی صفاتِ جلیلہ کا عکس اور صدقہ ہے کہ ماں صد ہزار تکالیف اٹھا کر بچے کی اپنے ”رحم“ میں پرورش کرتی ہے اور اس کی جبیں پر شکن نہیں آتی اور ماں ہی کی نسبت سے قریب اور دور کے وہ تمام رشتے وجود میں آتے ہیں، جنہیں قرآن نے ”الْأَرْحَام“ سے تعبیر کیا ہے اور اسلام نے ”رشتہ قربات“ کی پاس داری پر بہت زور دیا ہے، چند منتخب احادیث مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(۱) ”الرَّحْمُ شُجْنَةٌ مِّنَ الرَّحْمِينَ، فَقَالَ اللَّهُ: مَنْ وَصَلَّكَ وَصَلَّتْهُ وَمَنْ قَطَعَكَ قَطَعْتُه“۔

ترجمہ: ”رحم“ (بمعنی رشتہ قربات) اللہ تعالیٰ کی صفت الرحمن سے مشتق ہے (یعنی اس کا پرتو اور عکس ہے)، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے رحم! جو تجھے ملائے رکھے گا، میں اسے اپنی ذاتِ کریم سے ملائے رکھوں گا اور جو تجھے توڑے گا، میں اسے اپنی نگاہ کرم و لطف سے جدا کر دوں گا، (صحیح البخاری: 5988)۔

نوٹ: لفظ ”شُجْنَةٌ“، ش کی تینوں حرکات (زبر، زیر اور پیش) کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ ”شُجْنَةٌ“ کے لغوی معنی ہیں: ”درخت کی الجھی ہوئی شاخ اور ایک دوسرے میں گھنگ گھاٹھنی“۔ حدیث کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ رحم (بمعنی رشتہ قربات اور اللہ تعالیٰ کی صفت ”الرحمن“) کا مادہ ایک ہے، یعنی ”رحم“۔ لہذا ”صلہ رحمی“ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان پیدائش سے پہلے وقت ”رحم مادر“ میں گزارتا ہے، تو مان کے دل میں اور اس نسبت سے قربات کے دیگر رشتہوں میں جوفطری میلان، شفقت اور محبت اللہ نے رکھی ہے، وہ اس کی صفت ”الرحمن“ کا فیضان ہے۔

(۲) ”الرَّحْمُ مُعْلَقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُولُ: مَنْ وَصَلَّنِي وَصَلَّهُ اللَّهُ وَمَنْ قَطَعَنِي قَطَعَهُ اللَّهُ“۔

ترجمہ: ”رحم“ عرشِ الہی کے ساتھ متعلق ہے اور (زبانِ حال سے) کہتا ہے کہ جو مجھے ملائے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے رحم و کرم سے ملائے رکھے اور جو مجھے توڑ دے اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ٹوٹ جائے، (مشکوٰۃ المصانع: 3921)۔

(۳) ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِفٌ“۔

ترجمہ: ”قطعِ حمی کرنے والا (یعنی رشتہ قرابت کو توڑ نے والا) جنت میں داخل نہیں ہوگا، (صحیح مسلم: 2556)۔

(۴) ”لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْهُكَافِيِّ، وَلِكِنَ الْوَاصِلُ الَّذِي إِذَا قُطِعَتْ رِجْمَهُ وَصَلَّهَا“۔

ترجمہ: ”واصل“، (صلہ رحمی کرنے والا) وہ شخص نہیں ہے جو کسی قرابت دار کی اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دے (یعنی ادلے کا بدلہ کے اصول پر عمل پیرا ہو) بلکہ حقیقت میں حق قرابت کو ادا کرنے والا (اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلیٰ انعام کا حقدار) وہ شخص ہے جو ان رشتہ داروں سے بھی تعلق جوڑے رکھے جو اس سے بناہ نہیں کرتے، (صحیح البخاری: 5991)۔

(۵) ایک شخص نے بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے رشتے دارا یے ہیں کہ میں ان سے ملنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں، مگر وہ تعلق توڑ لیتے ہیں، میں ان کے ساتھ اچھائی کرتا ہوں مگر وہ اس کا جواب برائی سے دیتے ہیں، میں ان کی زیادتیوں سے درگزر کرتا ہوں، مگر وہ مسلسل میرے ساتھ جہالت آمیز سلوک کرتے ہیں، (یعنی کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر تیرابر تاؤ (اپنے رشتے داروں سے) ایسا ہی ہے جیسا تو نے بیان کیا، تو تم ان کو گرم ریت کھلارہ ہے، ہو اور تم جب تک اپنی روشن پر قائم رہو گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے مقابلے میں تمہارا ایک مدگار رہے گا، (صحیح مسلم: 2558)۔



احادیث

(سنده یونیورسٹی کے منظور شدہ نصاب کے مطابق)

حدیث نمبر 1

بندے پر نعمت کے اثرات

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ أَنْ يَرَى أَثْرَ نِعْمَتِهِ عَلَى عَبْدٍ -

ترجمہ "اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس کی نعمت کے اثرات اس کے بندے پر نظر آئیں، (سنن ترمذی: 2819)"۔

تشریح:

اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے، اُسے دنیا کا مال و دولت اور طرح طرح کی نعمتوں عطا فرماتا ہے، تو اس بندے پر ان نعمتوں کے اثرات نمایاں طور پر نظر آنے چاہیں۔ انعاماتِ الہیہ کا اولین حق تو یہ ہے کہ ان پر اللہ کا شکردا کیا جائے اور شکر کی ایک احسن صورت یہ ہے کہ انسان خود بھی اپنی عملی زندگی میں ان نعمتوں سے مستفید ہو اور اللہ کے بندوں کو بھی ان سے فیض یا بکرے۔ اس کے طعام، لباس اور ہمن سے بھی ظاہر ہوتا ہو کہ یہ ایک خوش حال اور فارغ البال شخص ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفید ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اگر اس میں اسراف نہ ہونہ یہ تکبر کی غرض سے ہو، حدیث پاک میں آتا ہے:

”كُلُوا وَاشْرُبُوا وَالْبُسُوا وَتَصَدَّقُوا، فِي غَيْرِ إِسْرَافٍ وَلَا مَخِيلَةٍ“ -

ترجمہ: "کھاؤ اور پیو اور پہنوا اور صدقہ کرو، لیکن اسراف نہ تکبر کرو (بخاری: 5783)"۔

یعنی ممانعت نعمتوں سے استفادے میں نہیں، بلکہ اسراف اور تکبر میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بخل و امساک کی وجہ سے وہ اپنے آپ پر بھی تنگی مسلط کر دے اور دوسرے لوگوں کو بھی محروم رکھے یہ "کفر ان نعمت" بھی ہے اور اسے بد قسمی اور بد نصیبی سے تعبیر کیا جائے گا،

نبی کریم ﷺ سے لباس میں خوبصورتی کے بارے میں پوچھا گیا: کیا یہ تکبر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں بلکہ تکبر تحقیق کا انکار اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔

(احیاء علوم الدین: ج ۳ ص ۳۵۶)

یعنی اس کے طرز عمل اور طرز بود و باش میں توازن و اعتدال ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ اپنی امارت کا اظہار کھلنڈرے پن، چھپھورے پن، بے جا اسراف اور متکبرانہ ٹھانٹھ بائٹھ کے ساتھ کرے یا اپنی امارت کی وجہ سے لوگوں کو حقیر سمجھتا ہو اور خود کو بڑا سمجھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بھی ادا کرتا رہے۔

حدیث نمبر ۲

اپنے سے کم تر کو دیکھ کر شکر ادا کرنا

”إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلَى مَنْ فِي مَنْ فِي الْمَالِ وَالْخُلُقِ،

فَلْيُنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْهُ“ -

اللفاظ	معانی	اللفاظ	معانی
إِذَا نَظَرَ	جب و دیکھے	أَحَدُكُمْ	تم میں سے کوئی
مَنْ فِي	جسے برتری عطا کی گئی، یعنی جو افضل ہے	أَسْفَلُ مِنْهُ	جو اس سے کم تر ہو
عَلَيْهِ	صورت و شکل		
خُلُقِ			

ترجمہ: ”جب تم میں سے کوئی شخص کسی ایسے شخص کو دیکھے جسے مال و دولت اور صورت و شکل میں اس پر برتری عطا کی گئی ہے تو اسے چاہیے کہ (ایسے موقع پر) اپنے سے کم تر کو دیکھے، (صحیح البخاری: 6490)۔“

تشریح:

اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ مال و دولت، حسن و جمال اور جاہ و منصب

میں اپنے سے کسی بہتر اور برتر آدمی کو دیکھتا ہے تو وہ احساسِ کمتری میں بنتا ہو جاتا ہے اور اسے اپنی محرومی کا احساس ہونے لگتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک جانب تو وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے ”کفرانِ نعمت“ میں بنتا ہوتا ہے، اپنے رب سے دل ہی دل میں شکوہ و شکایت کرنے لگتا ہے، ہر وقت کڑھتا رہتا ہے اور دوسری طرف اپنے خوش حال اور صاحب حسن و جمال بھائی پر حسد کرنے لگتا ہے اور یہ تمام کیفیات مہلک اخلاقی امراض ہیں۔

چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے اس کا نہایت حکیمانہ نفیاتی حل تجویز فرمایا اور حکم دیا کہ ایسے موقع پر آدمی کو چاہیے کہ مال و دولت، جاہ و منصب اور حسن و جمال میں اپنے سے کمتر کو دیکھے تو اسے دوسروں کی محرومی کو دیکھ کر اپنی خوش نصیبی کا صحیح اندازہ ہو گا اور وہ اللہ کا شکر گزار بندہ بن جائے گا۔

یہ دنیاوی امور کے متعلق ہے اور رہا دینی امور کا معاملہ اور وہ امور جن کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے تو آدمی کو چاہیے کہ اس کی طرف دیکھے جو اس سے مرتبہ میں زیادہ ہے تاکہ فضائل کے حصول میں اس کی رغبت زیادہ ہو۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

”حضرت عبد اللہ بن الحشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مال داروں کے پاس کم جایا کرو، یہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ تم اللہ کی نعمت کو کم نہ سمجھو۔“

(فتح الباری: ج ۷، ص ۲۲۵)

یہ اس مرض کی دوا ہے، جب کوئی شخص اپنے سے دنیاوی اعتبار سے بڑے آدمی کو دیکھے گا تو حسد سے محفوظ نہیں رہ سکے گا، پس اس کی دوا یہ تجویز فرمادی کر اپنے سے دنیاوی مرتبہ میں کم شخص کی طرف دیکھتے تاکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں آسانی ہو، کیونکہ جب وہ اپنے سے کم مرتبہ آدمی کی طرف دیکھے گا اور اس کے اور اپنے حال پر غور کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور زیادہ آشکار ہوں گی مپھر وہ اللہ تعالیٰ کا اور زیادہ شکر ادا کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے بہتر حال میں رکھا ہے اور یہ نہیں سمجھے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نعمتیں کم دی ہیں۔

امام ترمذی حدیث روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :
 ”وَخُصْلَتِينَ جِنْ خَصْ مِنْ هُوَنَّى كَيْ، اللَّهُ تَعَالَى اَسْ كُوشَا كَر او رَصَابَر لَكَهْ دَيْ گَا: (۱) جو شخص دنیا
 میں اپنے سے کم درجے کے شخص کو دیکھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل پر اس کی حمد کرے (۲) اور جو
 دین میں اپنے سے زیادہ مرتبے کے شخص کو دیکھ کر اس کی اقتداء کرے اور جس نے دنیا میں
 اس شخص کو دیکھا جو اس سے زیادہ مرتبے کا ہے اور اس پر افسوس کرے کہ اس کو ایسی نعمتیں
 نہیں ملیں، تو اللہ تعالیٰ اس کو شاکر صابر نہیں لکھے گا، (ترمذی: 2512)۔“

حدیث نمبر 3

دینی بھائی سے محبت کا اظہار

”إِذَا أَحَبَ الرَّجُلُ أَخَاهُ فَلَيُخْبِرْهُ أَنَّهُ يُحِبُّهُ“

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
اپنے بھائی سے، اپنے بھائی کو	أَخَاهُ	جب محبت کرے	إِذَا أَحَبَ
کوہ اس سے محبت کرتا ہے	يُحِبُّهُ	تو اسے بتا دے	فَلَيُخْبِرْهُ

ترجمہ: ”جب آدمی اپنے دینی بھائی سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے بتا دے کہ وہ
 اس سے محبت کرتا ہے، (سنن ابو داؤد: 5124)۔“

تشریح:

اس حدیث پاک میں محبت سے مراد ایسی محبت نہیں ہے، جس کا سبب نفس کی شرارت و
 خباشت یا خوف یا طمع یا لذت یا فریب ذینما ہو، بلکہ ایسی محبت مراد ہے جو للہیت کی بنیاد پر ہو۔
 اس کا سبب دین و ایمان اور اخلاق حسنہ ہوں، جسے ایک اور حدیث میں ”الْحُبُّ فِي اللَّهِ“
 سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسی محبت کو اللہ کی محبت کا ذریعہ بتایا گیا ہے، حدیث شریف میں ہے:
 ”وَجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلْمُسْتَحَابِينَ فِي“

ترجمہ: ”میری رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کے لیے میری محبت
 واجب ہو گئی، (مصدرک للحکام: 7314)، یعنی جو لوگ ایک دوسرے سے اللہ کی رضا کی

خاطر محبت کرتے ہیں اور اس محبت سے کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہیں ہوتی، بلکہ خالص اللہ کے لیے ہوتا یہ لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی محبت واجب ہو گئی اور اللہ تعالیٰ بھی ایسے لوگوں سے محبت فرماتا ہے، ایک اور حدیث میں فرمایا:

”الْمُتَحَابُونَ فِي اللَّهِ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“

ترجمہ: ”اللہ کی رضا کی خاطر آپس میں محبت رکھنے والے قیامت کیے ون عرش کے سامنے میں ہوں گے، (منhadīth: 22031)۔“

حدیث میں ایسی پاک، بے غرض اور بے لوث محبت کے اظہار کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس دینی بھائی کے دل میں اس کے لیے ایسے ہی پاک جذبات پیدا ہوں اور ان کا آپس میں ربط بڑھے جو ان شاء اللہ خیر اور نیکیوں کے فروع میں معاون ہو گا۔

اظہارِ محبت زبانی بھی ہو سکتا ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ زبانی اظہار کے ساتھ ساتھ عمل سے اس کا ثبوت بھی فراہم کرے، ایسا نہ ہو کہ زبان سے تو محبت کا اظہار کرتا ہو اور عملًا اس کے خلاف ہو۔

حدیث نمبر 4

پڑوی کا خیال رکھنا

”إِذَا طَبَخْتَ مَرْقَةً، فَأَكْثِرْ مَاءَهَا، وَتَعَاهَدْ جِيَرَانَكَ“

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
کوئی سالن، شوربا	مرقة	جب تو پکائے	إذا طبخت
خیال رکھا کرو	تعاهد	زیادہ کر	أكثرا
		پڑوی (جارکی جمع)	جيران

ترجمہ: ”جب تم سالن پکا کتو (تحوڑا سا پانی زیادہ ڈال لیا کرو اور (کھانا ہدیۃ بھیج کر) اپنے پڑویوں کا خیال رکھا کرو، (صحیح مسلم: 2625)۔“

لئر تج

اس حدیث پاک میں دوہاؤں کی اعایم دی گئی ہے: ایک تو پڑوسیوں کے حقوق کا پاس رکھنا اور ان سے حسن سلوک کرنا، حدیث پاک میں ہے:

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مَا زَالَ جِبْرِيلُ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتَّىٰ ظَنِنْتُ أَنَّهُ سَيُؤْزَدُ لَهُ“۔

ترجمہ: ”جبریل امین مسلسل مجھے پڑوسیوں (سے حسن سلوک) کے بارے میں تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ (پڑوسیوں کو) دراثت میں حصہ دار بنادیں گے۔“

(سنن ترمذی: 1942)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا کہ تاکید انہائی درجے کی تھی۔

دوسرایہ امر کہ حسن سلوک کے لیے ضروری نہیں کہ اس کے لیے صرف اعلیٰ ترین مالی ایشارہ کو ذریعہ بنایا جائے، بلکہ معمولی باتیں بھی اس میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور باہمی تعلق اور محبت کی فضاضر اسازگار ہوتا ہے، مثلاً: یہ کہ سالن میں تھوڑا سا پانی ڈال دیا جائے اور پڑوسیوں کے گھر میں کچھ کھانا یا سالن تختے کے طور پر بھیج دیا جائے، اس سے آپ کے ہاں کچھ کمی نہیں آئے گی اور نہ کچھ زائد خرچ ہو گا اور دوسرے کی ولداری ہو جائے گی اور بقول کسے: ”دل بدست آور کہ حج اکبر است۔“

کچھ پڑوسی مالدار ہوتے ہیں، ان کے ہاں اس قسم کے ہدیے بھیجنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں ان کے لیے خیر کے جذبات موجود ہیں اور کچھ پڑوسی ایسے ہوتے ہیں جن کو واقعی آپ کے اس ہدیے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ان کے کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہوتی ہے، ایسے پڑوسیوں کا خیال رکھنا اور ان کے حالات سے باخبر رہنا انہائی ضروری ہے، حدیث میں ہے:

”لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُ الْجَارِ عَلَىٰ جَنَبِهِ“۔

ترجمہ: ”وہ شخص مومن (کامل) نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔“

(منابو بعلی: 2296)۔ ایک حدیث میں ہے: صحابہ کرام ہدیہ بھیجنے میں مسلم اور غیر مسلم پڑوی کا فرق نہیں کرتے تھے:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: انہوں نے ایک بکری ذبح کی تو (گھر والوں) سے کہا: کیا تم لوگوں نے میرے یہودی پڑوی کو ہدیہ بھیجا، (نہ بھیجا ہو تو بعثج دو)، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنائے: ”جبرائیل مجھے برابر پڑوی، کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرماتے رہے یہاں تک کہ مجھے گمان گزرا کہ وہ اسے وارث بنادیں گے، (ابوداؤد: 5152)۔“

پڑوی کا اطلاق مسلمان اور کافر، عابد اور فاسق، دوست اور دشمن، مسافر اور مقیم، نیک اور بد، نفع بخش اور ضرر رسان، رشتہ دار اور غیر رشتہ دار سب پر ہوتا ہے۔ پڑوں کی حدود کیا ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

”حضرت علی نے فرمایا: مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَهُوَ جَارٌ، یعنی جو تیری آواز سنے وہ تیرا پڑوی ہے اور حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا: حَدُّ الْجَوَارِ أَرْبَعُونَ دَارًا مِنْ كُلِّ جَانِبٍ“، یعنی ”پڑوں کی حد ہر طرف سے چالیس گھر ہیں، (فتح الباری: ج ۱۰، ص ۲۵۶)۔“

حدیث نمبر 5

بہترین جہاد انصاف کی بات

”أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ أَوْ أَمِيرٍ جَائِرٍ“

الغاظ	معانی	الفاظ	معانی	معانی
أَفْضَل	بہترین	كَلِمَةُ عَدْلٍ	النصاف کی بات	عَدْلٍ
جائیر	ظالم	جَائِرٍ		

ترجمہ: ”بہترین جہاد ظالم یا دشہا یا ظالم امیر کے سامنے انصاف کی بات کہنا ہے“ - (سنن ابو داؤد: 4344)

تشریح:

ظلم کو مٹانا اور عدل و انصاف کو پھیلانا اسلام کا ہم مقصد ہے، اسلام اور ایمان کے معنی سلامتی، امن و آشتی اور خوف و خطر کے ازالے کے ہیں، ظلم و تعدی، جورو جبر اور بے انصافی اسلام کی ضد ہے اور عدل و انصاف اور امن و سلامتی اسلام کا مذکور مقصد ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ سیاست، معاشرت اور معاشرت میں عدل کا دور دو رہ ہو، لیکن کسی ریاست و مملکت میں عدل تب ہی قائم ہو سکتا ہے، جب وہاں کا حاکم اعلیٰ اور اس کے کارکنان اور عمال انصاف پسند ہوں اور ایسے انصاف پسند حکمران کے لیے قیامت کے دن بڑا جر ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

”إِنَّ أَحَبَّ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ يَوْمُ الْقِيَامَةِ وَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا إِمَامُ عَادٍ“ -

ترجمہ: ”قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب عدل کرنے والا حکمران ہوگا، (ترمذی: 1329)“ اور اگر حکمران ظالم ہے تو اس کے بارے میں فرمایا:

”وَأَبْغَضَ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ وَأَبْعَدَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا إِمَامُ جَائِرٍ“ -

ترجمہ: ”اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند اور سب سے زیادہ اللہ (کی رحمت) سے دور ظالم حکمران ہوگا، (ترمذی: 1329)“ -

مسلمانوں میں اتنی جرأت و ہمت ہو کہ اگر حکمران ظلم و تعدی کرنا بھی چاہیں تو ان کا ہاتھ روک دیا جائے، ظلم کی بخشنی ہر سطح پر ضروری ہے، معاشرے سے برائی کو دفع کرنے کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُعْرِيْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَإِلَيْهِ، فَإِنْ لَمْ يَمْتَطِعْ فَنِقْلِيهِ، وَذَلِكَ أَصْعَفُ الْإِيمَانِ“ -

ترجمہ: ”تم میں سے جو شخص کوئی بات خلاف شرع دیکھے، تو اگر اسے ہاتھ سے روکنے کی

طااقت رکھتا ہو تو اسے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اس کو دل سے براجانے اور یہ ایمان کا سب سے معمولی درجہ ہے، (صحیح مسلم: 49)۔

یعنی جو منصب اور مرتبے کا مالک ہے، وہ ہاتھ سے برائی کو روکے اور جو صاحبان علم ہیں وہ زبان سے روکیں، لیکن اگر حاکم راہ راست سے ہٹا ہوا ہے اور فسق و فجور یا گمراہی کا شکار ہے تو اس وقت مشکل ترین مرحلہ ظالم و جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے، کیونکہ بعض اوقات اس کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے مثلاً: قید و بند کی صعوبتیں اور جان و مال کا اتنا لاف وغیرہ، اسی لیے اسے حدیث پاک میں ”بہترین جہاد“ قرار دیا گیا ہے اور یہ جہاد اکیلے ایک فرد یا طبقے کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس لیے صاحبان اقتدار، صاحبان علم اور عوام سب مل کر جب اس فریضے کو انجام دیتے ہیں، تو اس کے نتائج زیادہ بہتر ہوتے ہیں اور برائی کو مٹانے میں زیادہ مدد و گارثابت ہوتے ہیں۔

حدیث نمبر 6

منافق کی تین نشانیاں

”آیةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اتَّسِعَ خَانَ وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ“۔

اللفاظ	معانی	اللفاظ	معانی
آیۃ	نشانی	ثَلَاثٌ	تین
إِذَا حَدَّثَ	جب بانتکرے	كَذَبَ	جھوٹ، اس نے جھوٹ بولا
أَخْلَفَ	خلاف ورزی یا وعدہ خلافی کرے	إِذَا اتَّسِعَ	جب امین بنایا جائے
خَانَ	خیانت کرے	إِنْ صَامَ	اگرچہ روزہ رکھے
زَعَمَ	اس نے نگان کیا	وَصَلَّى	نمایا پڑھے

ترجمہ: ”منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے اور جب اسے امین بنایا جاتا ہے تو خیانت کرتا ہے، اگرچہ وہ روزے رکھتا ہوا اور نماز بھی پڑھتا ہوا اور بزم خویش یہ سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے، (مسلم: 59)۔“

تشریح:

منافق اسے کہتے ہیں جس کا عقیدہ کافرانہ و مشرکانہ ہو، مگر مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنے آپ کو مومن ظاہر کرے، یعنی منافق کے عقیدے و اقرار، قول و عمل اور ظاہر و باطن میں کھلا تضاد ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات وہ مکروہ فریب اور عیاری و مکاری سے اپنے نفاق اور خبث باطن کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، گویا:

ہیں کو اکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دھوکا دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا

اس لیے رسول کریم ﷺ نے اس حدیث پاک میں وہ علامتیں بیان فرمائیں جن سے منافق کو بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے۔

ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نفاق کی دو قسمیں ہیں: ایک نفاق اعتمادی اور دوسرا نفاق عملی، اس حدیث میں نفاق عملی کی تعریف بیان کی گئی ہے تاکہ مسلمان منافقوں اور منافقانہ عادات سے بچے رہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ”نفاق عملی“ کی سزا کے طور پر وہ ”نفاق اعتمادی“ میں مبتلا ہو جائیں۔

منافق کی علامتوں کو تین میں منحصر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ثواب اور عذاب کا مدار تین چیزوں پر ہے:

(۱) نیت، (۲) قول، (۳) فعل

اور منافق میں یہ تینوں چیزوں فاسد ہیں، نیت کا فساد اس طرح ہے کہ منافق جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے، کیونکہ وعدے کی خلاف ورزی اس وقت قابل مذمت ہے، جب وعدہ کرتے ہی دل میں اس کے خلاف کرنے کی نیت کر لے، لیکن اگر وعدہ کرتے

وقت اس کے پورا کرنے کا عزم ہو، پھر کوئی مانع پیش آجائے یا کسی اور سب سے اس کی رائے بدل جائے تو یہ نفاق کی صفت نہیں ہے، یعنی وعدہ کرتے وقت اس کے دل میں تھا کہ وہ اس کے خلاف کرے گا تو یہ نفاق کی صفت ہے۔ علماء کرام نے بیان کیا ہے: جب انسان کوئی وعدہ کرے تو اس کے ساتھ ان شَاءَ اللّٰهُ كَهْبَهْ لے، تاکہ وعدہ پورا نہ کرنے کی صورت میں جھوٹ کا مرتكب نہ ہو۔

قول کافاد یہ ہے کہ جب منافق بات کرتا ہے تو جھوٹ بتتا ہے اور فعل کافاد یہ ہے کہ منافق کے پاس جب امانت رکھوائی جاتی ہے تو وہ اس میں خیانت کرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ منافق کی نیت، قول اور فعل تینوں میں فساد ہوتا ہے اور اس کی ظاہری علامتیں تین ہیں: جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا اور خیانت کرنا۔ مزید یہ بھی بتایا گیا کہ ایسی نماز، روز سے اور عبادات جن سے ایمانی، روحانی اور اخلاقی انقلاب نہ آئے اپنے انوار و برکات سے خالی ہوتے ہیں اور محض اپنے تیس آپ کو مسلمان سمجھ لینا ہی کافی نہیں اسلام کو تھہ دل سے قبول کرنا بھی ضروری ہے اور اعمال کی قبولیت کا دار و مدار عمل کرنے والے کے عقائد پر ہے، اگر عقائد درست ہیں تو اعمال مقبول ہوں گے، اگر نہیں تو اعمال کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

حدیث نمبر 7

حرص ولاجح سے بچو

”وَاتَّقُوا السُّخَّ، فِإِنَّ السُّخَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلَى أَنْ سَقَكُوا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحْلَلُوا مَحَارِمَهُمْ“

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
إِتَّقُوا	بچو	السُّخَّ	مخل، حرث
أَهْلَكَ	ہلاک کر دیا	حَمَلَهُمْ	انھیں آمادہ کیا، برائی ہیئت کیا
أَنْ سَقَكُوا	کہ خون بھائیں	دِمَاءُ	خون

إِسْتَحْلُوا	حَلَالًا يَا سَجْهًا	مَحَارِمٌ	حَرَامٌ چیزیں
--------------	----------------------	-----------	---------------

ترجمہ: ”حرص ولاچ سے بچو کیونکہ بخل، حرص اور لاچ نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا اس (مکروہ جذبے) نے انہیں ایک دوسرے کی خوب ریزی اور ایک دوسرے کی محرمات کو حلال کرنے پر ابھارا، (صحیح مسلم: 2578)۔“

تشریح:

اس حدیث میں ”شَحّ“ کا لفظ آیا ہے جس کے متعدد معنی ہیں، شدید بخل کو شُحّ کہتے ہیں، بعض علماء نے کہا: وہ بخل جس کے ساتھ حرص بھی ہو، اس کو شُحّ کہتے ہیں اور بعض نے کہا: شُحّ کا معنی ہے: جو کچھ اس کے پاس نہیں، اس میں حرص کرنا اور جو کچھ اس کے پاس ہے، اس میں بخل کرنا۔

اس حدیث پاک میں حرص و ہوس اور بخل کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ اخلاقی بیماری اور ناپسندیدہ جذبہ پہلی امتیوں کی ہلاکت کا سبب بنائے، کیونکہ جب کسی شخص میں حرص اور لاچ انتہا کو پہنچ جائے تو وہ مال و دولت کی محبت میں انداھا ہو جاتا ہے اور اس کے حصول میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز زد نہیں رکھتا۔ مال کے حصول کے لیے کسی کی جان سے کھینٹا پڑے، کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو پر ہاتھ دالا پڑے، وہ کسی بات سے گریز نہیں کرتا اور جب یہ اخلاقی مرض قومی پیا نے پر پھیل جائے تو پھر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاس سے ہو جاتے ہیں، ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو پر دست درازی کرتے ہیں اور اس طرح باہمی نفرت و کدو رت اور جنگ و جدال سے خود اپنی قوت و طاقت کو تباہ کر کے دشمن کے لیے تزویہ بن جاتے ہیں، ہلاکت سے مراد آخرت میں تباہی و بر بادی بھی ہو سکتی ہے۔

احادیث مبارکہ میں سخاوت کی تحسین کی گئی ہے اور بخل کی مذمت بیان کی گئی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”السَّعْدُ قَرِيبٌ مِّنَ اللَّهِ، قَرِيبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ، قَرِيبٌ مِّنَ النَّاسِ، بَعِيدٌ مِّنَ النَّارِ، وَالْبَخِيلُ بَعِيدٌ مِّنَ اللَّهِ، بَعِيدٌ مِّنَ الْجَنَّةِ بَعِيدٌ مِّنَ النَّاسِ، قَرِيبٌ مِّنَ النَّارِ،“

وَالْجَاهِلُ السَّخِيْعُ أَحَبُّ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ عَابِدٍ بَخِيلٍ،

ترجمہ: "سخاوت کرنے والا اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے، جنت کے قریب ہوتا ہے، لوگوں کے قریب ہوتا ہے، دوزخ سے دور ہوتا ہے اور بخیل شخص اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے، جنت سے دور ہوتا ہے، لوگوں سے دور ہوتا ہے، دوزخ کے قریب ہوتا ہے اور سخی جاہل اللہ تعالیٰ کے نزدیک بخیل عابد سے زیادہ محبوب ہے، (ترمذی: 1961)"۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"أَنْفِقُوا وَلَا تُخْصِنُوا، فَمَنْ يُخْصِنَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ، وَلَا تُشْعِنُ، فَيُؤْمِنُ اللَّهُ عَلَيْكُمْ"

ترجمہ: "تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور گن گن کر خرچ نہ کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں گن گن کر دے گا اور تم اپنی تھیلی کامنہ بندہ رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر رزق کو بند کر دے گا"۔

(بخاری: 2591)

اللہ کی راہ میں خرچ کے وقت جیب کوتالا نہیں لگانا چاہیے، بلکہ اپنی وسعت کے مطابق دل کھول کر خرچ کرنا چاہیے، کیونکہ وسعت کے باوجود خرچ نہ کرنے سے رزق میں برکت ختم ہو جاتی ہے۔

نوٹ: حدیث نمبر 8 کامتن، ترجمہ اور تشریح حدیث نمبر 12 صفحہ 130 پر ملاحظہ فرمائیے۔

حدیث نمبر 9

جنت اور دوزخ کے راستے

"حُجَّبَتِ النَّارُ بِالسُّهَوَاتِ وَحُجَّبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ"

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
حُجَّبَتْ	ڈھائکی گئی ہے	شَهَوَاتِ	نسانی خواہشات، شہوت کی جمع
مَكَارِهِ	ناپسندیدہ چیزیں (مکروہ کی جمع) یہاں اس سے مراد مصائب و مشکلات ہیں۔		

ترجمہ: "دوزخ کوشہتوں کے ساتھ ڈھانپ دیا گیا ہے اور جنت کو تکلیفوں اور مشقوں کے ساتھ ڈھانپ دیا گیا ہے، (بخاری: 6487)"۔

تشریح:

یہ حدیث نبی ﷺ کی جو امعاں الکلم میں سے ہے اور اس میں شہوات کی مذمت ہے، ہر چند کہ انسانوں کے نفس شہوات کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس حدیث میں عبادات اور طاعات پر برا بیگنیتھ کیا ہے۔ لوگ عبادات اور طاعات ناپسند کرتے ہیں اور ان پر عبادات اور طاعات دشوار ہوتی ہیں اور جنت کو تکلیف دہ اور مشقت والے کاموں کے ساتھ ڈھانپ دیا گیا ہے، پس جنت تک آدمی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک کہ تکلیف دہ اور مشقت والے کاموں کی وادی کو عبور نہ کر لے اور دوزخ سے اس وقت تک نجات نہیں پاسکتا، جب تک کہ شہوات کے تقاضوں کو ترک نہ کر دے، اس لیے مومن پر واجب ہے کہ ان کاموں میں کوشش کرے جن کی وجہ سے وہ جنت میں داخل ہو جائے اور دوزخ سے دور ہو جائے، خواہ یہ اس کے اوپر دشوار ہو۔

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ شہوت رانی، شہوت پرستی، نفس کی باطل خواہشات کی غلامی اور بندگی اور ان تمام مکروہ جذبات کی تکمیل کے لیے حلال و حرام کی حدود و قیود کو توڑ دینا ایسی راہ عمل ہے، جس کی آخری منزل جہنم ہے۔ اس لیے اگر آدمی عذاب جہنم سے بچنا چاہتا ہے تو اسے نفس کی تمام باطل خواہشات، شہتوں اور تقاضوں کو قابو میں رکھنا ہوگا اور شریعت کی لگام دینی ہوگی، مگر نفس امارہ کو قابو میں رکھنا، ایمان پر ثابت قدم رہنا اور تقوے کی پگڑنڈی پر پھونک پھونک کر قدم رکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے، یہ مشکلات و مصائب کا راستہ ہے، باطل قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ یعنی ایمان و اسلام پر کار بندر بننے کے لیے اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

اس حدیث میں مکاریہ اور مشقت والے کاموں سے مراد وہ کام ہیں جن کا مکلف کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے اور ان کاموں کو بجا لائے اور جن

کاموں سے منع کیا ہے ان کو ترک کر دے، جیسا کہ عبادات کو صحیح طریقہ پر ادا کرنا اور ان کی حفاظت کرنا اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، ان سے قولًا اور فعلًا اجتناب کرنا۔ ان پر مکارہ اور پر مشقت کاموں کا اطلاق اس لیے کیا گیا کہ ان کاموں پر عمل کرنے والے کو مشقت ہوتی ہے اور اس کے لیے یہ کام مشکل ہوتے ہیں۔

شہوات سے مراد دنیا کی وہ چیزیں ہیں، جن سے انسان کو لذت حاصل ہوتی ہے اور شریعت نے ان کو منع کیا ہے، نیز اس لیے بھی کہ شہوات کے تقاضوں پر عمل کرنا ان چیزوں کے ترک کا باعث ہوتا ہے، جن کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جنت اور دوزخ دونوں کا اللہ تعالیٰ نے حجاب سے ڈھانپ دیا ہے، جنت کے اوپر مشقت کے کاموں کا حجاب ڈال دیا ہے اور دوزخ کے اوپر شہوات اور لذید چیزوں کا حجاب ڈال دیا ہے، اس لیے جنت میں وہ لوگ داخل ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کریں گے اور اس راہ میں مشکلات اور مصائب کی مشقتوں کو برداشت کریں گے اور دوزخ میں وہ لوگ داخل ہوں گے جو عیش و عشرت میں بتلار ہتے ہیں اور اللہ کی رضا کے خلاف اپنی مرضی کی زندگی گزارتے ہیں۔

حدیث نمبر 10

امنی اولاد کو نماز کا حکم دینا

اس حدیث کا متن، ترجمہ اور تشریح حدیث نمبر 14 کے تحت صفحہ 216 پر ملاحظہ فرمائیے۔

حدیث نمبر 11

دوست بنانے کا معیار

”الرَّجُلُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ، فَلَيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ“

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
آلرَّجُلُ	آدمی	خَلِيلُ	دوست

مَنْ يُخَالِلُ	كُسَّ سَدْوَسْتَ كَرْتَاهُ	فَلْيَنْظُرْ	چا پیے کہ دیکھ لے
----------------	----------------------------	--------------	-------------------

ترجمہ: ”آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تو کسی کو دوست بنانے سے پہلے) تم میں سے ہر ایک کو خوب سوچ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کیسے شخص کو دوست بنارہا ہے۔“
(سنن ترمذی: 2378)

تشریح:

خلیل کا معنی ہے: وہ دوست جس کی محبت دل کی گہرائی میں جاگزین ہو۔ یہ خلت سے بناتا ہے اور خلت اس محبت کو کہتے ہیں جو دل کے اندر پیوست ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اس لیے فرمایا کہ ان کے دل میں اللہ کی محبت پیوست ہو جکی تھی اور وہ تمام مخلوق سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کے ہو چکے تھے۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ صحبت اور حلقہ یاراں کا انسان پر گہرا اثر پڑتا ہے، اگر اس کے دوستوں اور احباب کا حلقہ نیک ہے وہ دین دار اور باکردار ہیں تو ان سے آدمی دینداری سکھے گا اور ان سے متاثر ہو کر اپنے اخلاق و کردار کی اصلاح کرے گا، جن لوگوں کے درمیان دنیاوی رشتہوں اور تعلق کی وجہ سے محبت ہو، قیامت کے دن وہ محبت، رشتہ اور تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے اور جو لوگ متقین ہیں ان نیک لوگوں کی دوستی قیامت کے دن بھی کام آئے گی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

”الَا خَلَّا عُيُونَ مِنْذِبَعْصُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌ إِلَّا الْمُتَّقِينَ“۔

ترجمہ: ”اس دن گھرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، ما سو متقین کے۔“

(از خرف: 67)

اس لیے اپنا حلقہ احباب بناتے وقت دوستی کے تمام معیارات سے بڑھ کر اس کے عمل و کردار کو فوقيت دینی چاہیے اور کسی بعمل اور بدکردار کو اپنا دوست نہیں بنانا چاہیے، اگر خدا نخواستہ کسی کا حلقہ احباب بدکردار اور بدقاش افراد پر مشتمل ہے تو اس سے آدمی کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ آہستہ آہستہ سرایت کرنے والے زہر کی طرح انسان کے کردار کو گھننا لگتا رہے گا اور آدمی کو احساس نہیں ہو گا، اس لیے آدمی کو شروع ہی میں احتیاط کرنی

چاہیے کہ کوئی غلط اور بے دین آدمی اس کا دوست اور ہمدرد بن کر اس پر اثر انداز نہ ہوا اور دوست معاشرے میں آدمی کی پہچان ہوتے ہیں۔

حدیث نمبر 12

عقل مند شخص کون؟

”الْكَيْسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَبِلَ لِهَا بَعْدَ الْمَوْتِ،
وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتَبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَهَّبَى عَلَى اللَّهِ الْأَمَانِ“۔

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
الْكَيْسُ	دان، ہوشیار، عکنند	دَانَ	ذلیل کی، اس سے مراد عاجزی اور انکساری ہے
مَنِ اتَّبَعَ	جس نے پیروی کی	تَهَّبَى	آرزو
هَوَى	خواہش نفس	آمَانِ	آرزو یکیں، مطالبات نفس

ترجمہ: ”دانادہ ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع کیا اور آخرت کے لیے عمل کیا اور عاجزو ہے جس نے خواہشات نفس کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ سے (نفس کی باطل خواہشات کی بھیل کی) آرزو کرتا رہا، (سنن ترمذی: 2459)۔“

تشریح:

نفس انسانی بڑا پر فریب اور پر خطر ہے، یہ انسان کو دل ہی دل میں بزرگانگ دکھاتا ہے اور براہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اس لیے نبی ﷺ نے فرمایا: عقل مند آدمی وہ ہے جو نفس کے فریب میں نہ آئے، بلکہ نفس کو اپنا تابع بنالے اور آخرت کے لیے عمل صالح کی شکل میں زادِ راہ تیار کرے۔

ہماری نظر میں عقل مند آدمی وہ ہے جس کو اپنے مستقبل کی فکر ہو، اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر ہو، جو دنیاوی اثاثے بنائے، پینک بیلنس ہو، بنگلہ ہو، گاڑی ہو اور دنیاوی نفع و نقصان کاماہر ہو، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اصل عقل مندوہ ہے جو نفس کو اللہ تعالیٰ کے احکامات کا پابند اور مطیع بنالے اور اس کو اپنی آخرت کی فکر ہو اور موت

کے بعد کی زندگی کے لیے تیاری کر لے، وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ دنیا میں میں کتنا ہی کمالوں، کتنا ہی ترقی کر لوں آخر کار اس دنیا سے جانا ہے اور موت کے بعد مجھے اس دنیاوی زندگی کے متعلق جواب دینا ہے، اس لیے وہ موت کے بعد کی زندگی کے لیے تیاری کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ سب سے زیادہ عقل مند اور معزز کون ہے،

آپ ﷺ نے فرمایا:

”أَكْثَرُهُمْ ذُكْرُ الدِّيَةِ وَأَشَدُهُمْ اسْتِعْدَادًا لِلِّمَوْتِ قَبْلَ نُزُولِ الْمَوْتِ أُولَئِكَ هُمُ الْأُكْيَاسُ ذَهَبُوا بِشَرَفِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ -

ترجمہ: ”موت کا زیادہ ذکر کرنے والے اور موت کے نزول سے پہلے اس کے لیے بہت زیادہ تیاری کرنے والے، یہ لوگ سب سے زیادہ عقل مند ہیں، ان لوگوں نے دنیا اور آخرت کی بزرگی کو پالیا، (المعجم الكبير للطبراني: 13536)۔“

سب سے کمزور اور نادان شخص اس کو قرار دیا جو نفس امارہ کا محکوم اور غلام بن جائے اور اس حقیقت کو بھول جائے کہ یہ زندگی عارضی ہے اور ایک دن اس نے جانا ہے وہ دنیا اور اس کی لذات میں منہمک ہو کر اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اللہ کی ذات سے آس لگائے بیٹھا رہے کہ اس کے نفس کی باطل خواہشات کسی طرح سے پوری ہو جائیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ انسان موت سے غافل ہوتا ہے اور جب انسان موت سے غافل ہو جائے تو لذات میں اس کا انہاک بڑھ جاتا ہے، اس لیے موت کا ذکر اس کی لذات میں انہاک کو کم کرتا ہے۔

حدیث نمبر 13

حقیقی طاقتوں

”لَيْسَ السَّدِيدُ بِالصَّرَعَةِ، إِنَّمَا السَّدِيدُ الَّذِي يَتَلَلَّ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ“ -

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
آل سَدِيدُ	بہادری، قوی	الصَّرَعَةُ	لوگوں کو زیادہ بچھاڑنے والا

ترجمہ: ”طاقة در در اصل، و نہیں ہے جو اپنے تم مقابل کو (کشتی میں) پچھاڑ دے بلکہ (حقیقت) طاقتور ہے جو غصے کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے، (صحیح مسلم: 2609)۔“

تشریح:

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا صلی و شمن اور اصل تم مقابل انسان کا نفس امارہ ہے اور فطری بات ہے کہ دو موقع پر انسان بے قابو ہوا جاتا ہے اور حد اعدالت سے تجاوز کر بیٹھتا ہے، ایک انتہائی مسرت کے لمحات میں اور دوسرا عالم غینظ و غضب میں اور یہی لمحات انسان کی آزمائش ہیں اور اس کی انسانیت کے لیے مقام امتحان ہیں، بقول بہادر شاہ ظفر :

ظفر آدمی اس کونہ جانے گا، ہو وہ کیا، ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

انسان کو تمام خرابیاں اس کی شہوت اور غضب کی وجہ سے پیش آتی ہیں اور انسان جب غضب پر قابو پالیتا ہے تو باقی صفات پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے، اس لیے اس حدیث میں ترغیب دی گئی ہے کہ غصہ پر قابو رکھیں، حدیث میں ہے:

ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: مجھے وصیت کیجیے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: لَا تَغْضُبْ تَمْ غَصَّرْ نَهْ كرنا، اس نے کئی بار پوچھا تو آپ نے یہی فرمایا: تم غصہ نہ کرنا،
(صحیح البخاری: 6116)

دوسروں کو پچھاڑنا اور چت کرنا کوئی کمال نہیں بلکہ اصل طاقت اور کمال یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی مخالفت کرتے ہوئے غصہ پر قابو پالے اور صبر و حلم کو واپنائے اور غضب کے بارے میں ایک اور حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا: غصہ ایمان کو فاسد کرتا ہے:

”إِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الإِيمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبْرُ الْعَسْلَ“

ترجمہ: ”بے شک غصہ ایمان کو اس طرح خراب کرتا ہے، جس طرح الیوا شہد کو خراب کرتا ہے، (شعب الایمان: 7941)۔“

اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو

”مُرُوا أَذْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا، وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ
وَفَرِّقُوا يَنِينَهُمْ فِي الْبَضَاجِعِ“ -

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
سن کی جمع سال	سِنِينَ	حکم دو	مُرُوا
جدا خدا کرو	فِرِّقُوا	سات سال کا	سَبْعِ سِنِينَ
انہیں مارو، سرزنش کرو	وَاضْرِبُوهُمْ	بستر، آرام گاہیں	الْبَضَاجِعِ

ترجمہ: اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں، اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو انہیں سزادے کر نماز کا عادی بناؤ اور ان کے بستر الگ الگ کر دو۔
(سنن ابو داؤد: 495)

تشریح:

اس حدیث میں نماز کی اہمیت اور والدین کی ذمے داری کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ ایک عاقل و بالغ مسلمان پر نہ صرف یہ کہ خود نماز پڑھنا فرض عین ہے، بلکہ اپنے اہل و عیال اور بچوں کو بھی اس راستے پڑھانا اور نماز کا عادی بنانا بھی ان کی ذمے داری ہے نماز ایک اہم فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مُّؤَقُّتاً“ -

ترجمہ: ”بے شک مومنین پر نمازان کے مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے، (النساء: 103)“ -

اس لیے اس اہم فریضہ کو ادا کرنے کی مشق پہلے سے ہونی چاہیے، تاکہ جب اس عمر کو پہنچ جائیں جس عمر میں نماز فرض ہو جاتی ہے تو ان کو کوئی تکلیف اور مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے، بلکہ وہ پہلے ہی سے اس کی تربیت لے چکے ہوں، چونکہ سات سال کی عمر میں بچ پاشور ہو جاتا ہے، اس لیے فرمایا کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کی ترغیب دو،

اور انہیں نماز پڑھنے کا حکم بھی دو، اگر وہ اس ترغیب و تلقین سے نماز کے عادی بن جائیں تو فہما، ورنہ جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں مناسب انداز میں سرزنش اور سزا دے کر نماز کے عادی بناؤ اور جب اولاد بالغ ہو جائے تو پھر وہ اپنے عمل کی خود زمے دار ہے۔

اسی طرح حکم دیا کہ دس سال کی عمر کے بچوں کو الگ الگ سلانا چاہیے تاکہ ان میں خود اعتمادی بھی پیدا ہو اور وہ نفسیاتی امراض کے شکار نہ ہوں۔ اسلام کا اپنا ایک تربیتی انداز ہے اور بچوں کی تربیت کی ذمے داری ان کے والدین پر ہے، اس لیے فقہاء نے لکھا ہے: بچوں کی زبان کھلتے ہی اللہ اللہ اور پھر پورا کلمہ لا الہ الا اللہ سکھائیں، جب سمجھ دار ہو جائیں تو ادب سکھائیں، کھانے، پینے، ہنسنے، بولنے، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے، پھرنے، بزرگوں کی تعظیم، ماں باپ اور اساتذہ کے آداب سکھائیں، قرآن اور نماز کے متعلق تمام امور، نماز کے سائل اور طریقہ سکھائیں، جب وہ یہ سب سیکھ جائیں، تو پھر اس کو نماز پڑھنے کا حکم دے اور یہ زبانی تاکید کی حد تک ہو، سات سال سے دس سال کی عمر تک زمی اور پیار سے نماز کی تلقین کرتے رہیں، جب دس برس کی عمر میں تربیت کا اثر ظاہر ہو جائے اور وہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگیں تو تمہیک، ورنہ تادیباً اس کو مار کر نماز پڑھا جائیں تاکہ جوانی کی دلہیز پر قدم رکھنے سے پہلے نماز کے عادی ہو جائیں۔

حدیث نمبر 15

نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والے کا اجر

”مَنْ دَلَّ عَلَىٰ خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ“

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
من دل	نیکی	خیرو	جس نے رہنمائی کی
فاعل	کرنے والا	أَجْرٌ	ثواب، بدلہ

ترجمہ: ”جس نے کسی کو نیکی کا راستہ دکھایا تو اسے بھی نیکی کرنے والے کے برابر اجر ملے گا، (سنابوداورد: 5129)۔“

تشریح:

اس حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ ایک ہے نیکی کرنا اور دوسرا نیک بات یا نیک کام میں کسی کی رہنمائی کرنا، نبی ﷺ کا فرمان ہے: نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والے کو بھی اس نیک کام کے کرنے والے کے برابر ثواب ملے گا۔

نیک کام کی ترغیب دینا اسلام میں اور برائی سے روکنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے، اس کو شریعت کی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نبی عن المنکر کہتے ہیں اور اس کی بڑی فضیلت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةً يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَا مُرْؤُنَ بِالْمُعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُقْلِحُونَ“ -

ترجمہ: ”اور تم میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت ہوئی چاہیے، جو اچھائی کی طرف بلا کسی اور نیک کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کر دیں اور وہی لوگ فلاح کو پہنچنے والے ہیں، (آل عمران: 104)۔“

جب تک کسی قوم میں نیکی پر رہنمائی کرنے والے موجود ہیں گے، اس قوم میں اصلاح کا عمل جاری رہتا ہے اور برائیوں کا سدابہ ہوتا رہتا ہے، جب نیکی کی ترغیب دینے کا عمل رک جائے تو معاشرہ فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔

حدیث نمبر 16

صلہ رحمی کرنے پر رزق اور عمر میں اضافہ
”مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبَسِّطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، وَيُنْسَالَهُ فِي أَثْرِهِ، فَلَيَصِلْ رَحِمَهُ“ -

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
مَنْ أَحَبَّ	جو پسند کرے، جو یہ چاہے	يُبَسِّط	رزق میں فراغی کی جائے
يُنْسَالَهُ	دراز کی جائے	فَلَيَصِلْ	اسے مؤخر کر دیا جائے، اس کی عمر کرے کرے

رشتہ قرابت	رَحْمٌ	نیشن، یہاں عمر مراد ہے	اکٹھ
------------	--------	------------------------	------

ترجمہ: ”جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے اور اس کی عمر دراز کی جائے تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے، (صحیح مسلم: 2557)۔“

تشریح:

”صلہ رحمی“ یعنی رشتہ داروں اور قرابت داروں کے ساتھ تعلق جوڑ نے اور رابطہ مضبوط کرنے کے دو فائدے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا خیر کا صلہ و طریقے سے دیا جاتا ہے: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ رزق میں کشادگی عطا فرمادیتا ہے اور دوسرا عمر میں اضافہ فرماتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں ”صلہ رحمی“ پر بہت زور دیا گیا ہے۔

ایک روایت میں ہے: ایک موقع پر جب حضور ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم صلہ رحمی کی ترغیب دے رہے تھے تو ایک صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم اس رشتہ دار سے تول سکتے ہیں جو ہم سے ملنا چاہے، جو ہم سے ملنا ہی نہ چاہے، اس سے ہم کسی مل سکتے ہیں، اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

”صِلْ مَنْ قَطَعَكَ، وَأُعْطِ مَنْ حَرَمَكَ، وَاعْفُ عَنْ مَنْ ظَلَمَكَ۔“

ترجمہ: ”جو تم سے قطع تعلق کرے اس سے تعلق جوڑ و اور جو تم کو محروم کر دے اس کو دے دو اور جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کر دو، (مندادحمد: 17452)۔“

حدیث نمبر 17

اصل مالداری دل کا غنی ہونا ہے

”لَيْسَ الْغَنِيُّ عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغَنِيًّا غَنِيَ التَّقْفِيسِ،“

معانی	الفاظ	معانی	الفاظ
ساز و سامان	الْعَرَض	بے نیازی، مالداری	غِنِي

ترجمہ: ”مالداری ساز و سامان کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ اصل مالداری دل کا غنی ہونا ہے، (صحیح مسلم: 1051)۔“

تشریح:

”غُنیٰ“ کے لفظی معنی ہیں: ”بے نیازی، محتاج نہ ہونا“؛ دنیا والوں کے نزدیک بظاہر مالدار وہ ہے جس کے پاس دنیوی مال و دولت کی کثرت ہے، لیکن نبی ﷺ نے فرمایا: جس دولت کے ہوتے ہوئے بھی ہوں زخم نہ ہو، یعنی مزید دولت کی طلب ہو، دل کا چین اور روح کا سکون ناپید ہو، ہر وقت انسان کو اس کی فکرگی رہے، اس کے لئے جانے اور چھن جانے کا خطرہ درپیش ہو تو یہ درحقیقت ”غُنیٰ“ (مالداری) نہیں ہے، بلکہ فقر اور محتاجی ہے۔ حقیقی ”غُنیٰ“ تو یہ ہے کہ دل کو فرار نصیب ہو، روح کو سکون مل جائے اور آدمی چین کی نیز سوئے، بقول شاعر:

تو نگزی بہ دل است نہ بہ مال
بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال

اس حدیث میں مذکور ہے: کوئی شخص مال اور اسباب اور ساز و سامان کی کثرت کی وجہ سے غُنی نہیں ہوتا، کیونکہ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس مال بہت زیادہ ہوتا ہے، لیکن وہ فقیر ہوتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا کیا ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ ہمیشہ مال میں اضافہ اور زیادتی کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور یہ پروانہیں کرتے کہ یہ مال ان کے پاس کہاں سے آتا ہے، پس گویا کہ وہ مال کے اعتبار سے فقیر ہیں، کیونکہ وہ اپنے پاس موجود مال کو کم سمجھتے ہیں، ان کو مال کے جمع کرنے پر بہت زیادہ طمع، لالج اور حرص ہوتی ہے اور حقیقت میں غُنی وہ ہے جو دل سے مستغنی ہو، جس شخص کے پاس تھواڑا مال ہو اور وہ اس پر قناعت کرے اور زیادہ کی حرص نہ کرے، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر پر راضی ہے اور اپنے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرتا ہے اور جس کا دل فقیر ہو وہ دنیا پر حریص ہوتا ہے اور حرص دنیا اس کو رذائل اور گھٹیا افعال میں مشغول کرتا ہے اور دنیا اس کا سب سے بڑا مقصد بن جاتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے۔

نوث: حدیث نمبر ۱۸، ۱۹ اور ۲۰ کا متن، ترجمہ اور تشریح گز رچکی ہے۔

سوالات

- ۱۔ قرآن کا تعارف، خصوصیات اور دوسری الہامی کتب سے اس کا موازنہ تحریر کیجئے۔
- ۲۔ اعجازِ قرآن پر ایک نوٹ تحریر کیجئے۔
- ۳۔ تدوین قرآن پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجئے۔
- ۴۔ ”سورۃ الحجرات“ کا جمالی خاکہ اور اس میں دی گئی تعلیمات کا خلاصہ تحریر کیجئے۔
- ۵۔ سورۃ الحجرات کی آیات نمبر ۲ تا ۵ کا ترجمہ تحریر کیجئے اور بتائیے کہ ان میں کس اہم بات کی تعلیم دی گئی ہے، آداب نبوی پر نوٹ لکھیے۔
- ۶۔ سورۃ الحجرات کی آیات نمبر ۹۔ ۱۰ کا ترجمہ تحریر کیجئے اور بتائیے کہ مسلمانوں کے دو گروہوں میں تنازعہ ہو جائے تو اس سے کس طرح نہ مٹنا چاہیے۔
- ۷۔ سورۃ الحجرات کی آیات ۱۱، ۱۲ کا ترجمہ تحریر کیجئے، نیز بتائیے کہ ان میں کن اخلاقی مغاسد سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ احادیث کی روشنی میں تشریح کیجئے۔
- ۸۔ سورۃ الحجرات کی آیات ۱۰ تا ۱۳ کی روشنی میں اسلامی اخوت و مساوات پر نوٹ لکھیے۔
- ۹۔ حدیث و سنت کی تعریف لکھیں۔
- ۱۰۔ سنت کی جیت کو قرآن سے ثابت کیجئے۔
- ۱۱۔ احادیث نمبر ۳، ۸، ۹، ۱۲، ۱۳ اور ۱۴ کا ترجمہ و تشریح کیجئے۔



دین اسلام

توحید:

اسلامی عقائد اور ایمانیات میں سب سے اولین اور اہم عقیدہ "عقیدہ توحید" ہے، عقیدہ توحید سے مراد یہ ہے: "اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات و صفات میں ایک مانا اور ایک جانا،" یعنی دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کی وحدانیت پر یقین رکھنا اور زبان سے تسلیم و اقرار کرنا اور اپنے اعمال کو اس عقیدے کے تقاضوں کے مطابق کرنا اور اس کی صداقتوں کے سانچے میں ڈھانا۔

عقیدہ توحید کی بنیاد اس بات پر ہے کہ یہ کائنات کی حادثہ اتفاقی کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئی اور نہ بغیر تنظیم، ترتیب اور تدبیر کے خود بخود چل رہی ہے، بلکہ اس کا ایک خالق، مرنی، مدبراً اور منظم ضرور ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے، اُسے باقی رکھے ہوئے ہے اور اس کی تدبیر، ترتیب اور تنظیم اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق فرمارہا ہے اور وہی انسان کی بندگی کا بلا شرکت غیر ممکن ہے۔

چنانچہ قرآن و حدیث میں وجود باری تعالیٰ اور توحید کے دلائل مختلف پیرائیوں سے ایسے لغشیں انداز میں دیے گئے ہیں کہ اگر انسان تھوڑی دیر کے لیے خالی الذہن ہو کر کھلے دل سے غوکرے تو اسے تعلیم کیے بغیر چارہ نہ رہے، ذیل میں ہم بعض دلائل کا تفصیل سے تذکرہ کرتے ہیں:

وجود باری تعالیٰ کے دلائل

۱۔ نظام کائنات کے نظم و ضبط سے استدلال:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَ الشَّهْسُرُ تَجْرِي لِمُسْتَقْرَرٍ لَهَاۤ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزُ الْعَلِيُّم۝ وَالْقَمَرُ قَدْ رَأَةٌ

مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعَرْجُونِ الْقَدِيرِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَبْغِي لَهَا أَنْ تُذْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا
الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۝ وَكُلُّ فِلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝

ترجمہ: "اور سورج اپنی مقررہ منزل کی طرف رواں دواں ہے، یہ خداوند عزیز و علیم کا مقرر کیا ہوا نظام ہے اور ہم نے چاند کے لیے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ وہ (اپنی مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد) بھور کی بو سیدہ شاخ کی مانند ہو جاتا ہے، نہ تو سورج کی یہ مجال کہ (وہ پیچھے سے) چاند کو آپکڑے اور نہ رات کی یہ طاقت کہ دن سے آگے نکل جائے، (یہ: 38-40)"۔

(۲) "وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خَلْفَةً لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَذَّرَّ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا"۔

ترجمہ: "اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کا (Succession) قائم کیا ہے، اس کے لیے جو یہ چاہتا ہے کہ نصیحت قبول کرے یا شکر ادا کرے، (الفرقان: 62)"۔

(۳) "الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طَبَاقًا ۝ مَاتَرًا فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفْوِيتٍ ۝ فَإِنْ رَاجِعَ
الْبَصَرَ ۝ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُوٰرٍ ۝ ثُمَّ إِنْ رَاجِعَ الْبَصَرَ ۝ كَرَّتِينَ يَنْقَلِبُ إِلَيْكُ الْبَصَرُ ۝ خَاسِئًا وَهُوَ
حَسِيرٌ ۝"۔

ترجمہ: "(اللہ وہی ہے) جس نے ایک دوسرے کے اوپر سات آسمان بنائے، (اے مخاطب!) تو رحمن کے نظم تخلیق میں کوئی خلل نہیں دیکھے گا، پس دوبارہ دیکھ کیا تو (ان میں) کوئی شگاف دیکھتا ہے، پھر بار بار نظر اٹھا کر دیکھ، تیری نظر تھک کر تیری طرف ناکام پلٹ آئے گی، (الملک: 3-4)"۔

مذکورہ بالا آیات کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی پیدائش اور ساخت، سورج چاند اور سیاروں کی ایک طے شده مربوط اور لگے بندھے نظام کے تحت گردش، گردش لیل و نہار اور مہہ و سال اور موسموں کی تبدیلی وغیرہ ان تمام چیزوں کو اپنے وجود، خلائق اور صناعی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، تاکہ انسان غور کرے اور یہ نتیجہ اخذ کرے کہ کوئی مخلوق خالق کے بغیر، مصنوع صانع کے بغیر اور نظم منتظم کے

بغير وجود میں نہیں آ سکتا، آخر کوئی توزات ہے جس کی قدرت اور کنٹرول سے نظامِ ارضی و سماوی، نظامِ مش و قمر و سیارگاں، گردش لیل و نہار اور افلاؤک و سماوات کی کوئی ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز سر منحراف نہیں کر سکتی۔ حیات و کائنات اور نفس و آفاق کی وسعتیں، بلندیاں، گہرائیاں اور پہاڑیاں اس کے وجود کی روشن ترین دلیلیں ہیں۔

ایک ان پڑھ بدوسے کسی نے پوچھا تو نے خدا کو کیسے جانا، اُس نے نہایت سادہ ساجواب دیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ لق دوق صحراء اور گیستان میں کسی رہ گزر پر میلنگنیاں اونڈ کے وجود پر اور نشانات قدم چلنے والے کے وجود پر دلالت کرتے ہیں، تو یہ کیونکہ ممکن ہے کہ اتنی بڑی وسیع و عریض کائنات اپنے خالق کے وجود پر دلالت نہ کرے۔ اگر اس کائنات پر کسی کامستحکم کنٹرول نہ ہوتا تو مش و قمر اور سیارے آپس میں نکرا جاتے، شب و روز کا نظام قائم نہ رہتا، زمین و آسمان نکرا کر پاش پاش ہو جاتے اور کچھ باقی نہ رہتا کیونکہ اتفاق سے اتنے بڑے نظام کا قائم و دائم رہنا عقل سے بعید ہے۔

۲- زرعی پیداوار سے استدلال:

کسان ایک دانہ گندم زمین میں کاشت کرتا ہے، پھر ایک غیبی طاقت اس کے وجود کو فنا کر کے اس سے ایک باریک کوپل نکالتی ہے جو اس قدر زم و نازک ہوتی ہے کہ ایک بچہ بھی ہاتھ میں لے کر مسل ڈالے تو مکمل طور پر فنا ہو جائے۔ لیکن کون ہے جو اس میں اتنی قوت و طاقت پیدا کرتا ہے کہ وہ سخت سے سخت زمین کا سینہ چیر کر باہر بھی نکلتی ہے اور اس کے اندر اپنی جڑیں بھی مسحکم کرتی ہے۔ پھر شبنم کے قطرے اور نیم سحر کے جھونکے اس میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں، سورج کی کرنیں اس میں پختگی لاتی ہیں اور وقت مقررہ پر ہونے والی بارشیں اس میں ہریاں اور غمو پیدا کرتی ہیں، یہاں تک کہ اس تدریجی عمل سے گزر کر فصل تیار ہو جاتی ہے، کٹ جانے کے بعد تیز ہوا کیس دانے کو بھوے سے الگ کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس تخلیقی عمل میں بظاہر مختلف عوامل کا فرمان نظر آتے ہیں اور کائنات کی ہر چیز اپنا حصہ ادا کرنے میں چاک و چوبند نظر آتی ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کون ہے جو درحقیقت

یہ عمل تخلیق فرماتا ہے اور اس نے ہر چیز کو اپنے اپنے کام پر لگا رکھا ہے ظاہر ہے یہ صرف اور صرف قادر و قیوم اور خالق و مالک اللہ عزوجل کی واحد ذات ہے، چنانچہ فرمایا:

”ءَأَنْتُمْ تَرَأَوْنَهُ أَمْ نَحْنُ الظَّرِيرُونَ ۝ لَوْ تَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلَمْنَا
تَفَكَّهُونَ ۝ إِنَّا لِمَعْرُوفٍ ۝ بِلْ نَحْنُ مَهْرُوذُونَ ۝“

ترجمہ: ”بھلا بتاؤ تو سہی تم جو کچھ زمین میں بو کر آتے ہو، اس کو تم آگاتے ہو یا ہم آگاتے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس فصل کو بالکل ملیا میث کر دیں اور تم کف افسوس مل کر یہ کہتے رہ جاؤ کہ ہم پر اچانک آفت آپڑی یا ہم بالکل محروم ہو گئے، (الواقعہ: 64-67)۔“

اگر کبھی انسان غلط فہمی میں بستا ہو کر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ سب محض اس کی عالمگردی، دانائی اور محنت کا کرشمہ ہے اور وہ خود اس پر قادر ہے، تو اس کی اس غلط فہمی کو بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں رفع فرمایا، ارشاد ہوتا ہے:

”إِنَّمَا مِثْلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا أَنْزَلَهُ مِنَ السَّمَاءِ فَأَخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَخْدَتِ الْأَرْضُ رُحْرُقَهَا وَأَثْرَيَتْ وَظَلَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَدِيمُوْنَ عَلَيْهَا ۚ أَتَهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَسِيدًا گَانُ لَمْ تَعْنَ بِالْأَمْسِ ۖ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَكَبَّرُونَ“۔

ترجمہ: ”پس حیاتِ دنیوی (کے عروج و زوال) کی مثال ایسی ہے، جیسے ہم نے آسمان سے پانی اتارا جس کے باعث زمین کی سربزی گھنی ہو کر اگی جسے انسان بھی اور حیوان بھی کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین کا حسن (سربزی و شادابی) کے باعث، نکھر آیا اور وہ خوب مزین ہو گئی اور اس کے مالکوں نے یقین کر لیا کہ اب انہوں نے اس (پیداوار) پر قابو پالیا ہے (تو اچانک، اس پر رات یادن کو کسی وقت ہمارا حکم (عذاب) آپڑا، پس ہم نے (اسی طرح) ملیا میث کر کے رکھ دیا گویا کل یہاں کچھ تھاہی نہیں، یونہی ہم وضاحت سے (اپنی قدرت کی) نشانیوں کو اس قوم کے لیے بیان کرتے ہیں جو غور فکر کرتی ہے، (یوس: 24)، اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

٤٦

وَكَاتِنْ قِنْ دَأَبْلَهُ لَتَحْمِلُ مِذْقَهَا إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ”۔
”وَكَاتِنْ قِنْ دَأَبْلَهُ لَتَحْمِلُ مِذْقَهَا إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ”۔
ترجمہ: ”اور کتنے ہی جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ہی ہے جو انہیں
بھی اور تمہیں بھی روزی پہنچاتا ہے، وہ سننے والا اور جانے والا ہے، (عنکبوت: 60)۔“

۳۔ جانوروں کے دودھ سے استدلال:

جانوروں سے ہم جو دودھ حاصل کرتے ہیں، یہ اس چارے سے حاصل ہوتا ہے
جسے جانور کھاتے ہیں، یہ چارہ جانور کی او جھڑی میں پہنچتا ہے، اور پر کے حصے میں خون، نحلے
ھے میں گوبرا اور درمیانی حصے میں دودھ کا قوام تیار ہوتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ
سے مختلف مراحل سے گزار کر جانوروں کے تھنوں تک پہنچا دیتا ہے، مگر اس قدر مہارت،
صفائی اور طہارت کے ساتھ کہ نہ گوبرا کا کوئی ذرہ اور نہ خون کا کوئی قطرہ اس میں شامل
ہوتا ہے، سرخ رنگ کے سیال خون اور بد بودا ر گوبرا کے درمیان سے صاف اور سفید دودھ کی
نہر جاری ہو جاتی ہے کیا یہ اس کی قدرت و تخلیق کا مظہر نہیں ہے، ارشاد فرمایا:

”وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لِعَبْرَةٌ نُسْقِيْكُمْ فِي مَيَّاْقٍ بُطْوَنَهُ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمِ لَبَنًا خَالِصًا
سَآبِغًا لِلشَّرِبِ بَيْنَنَّ“ ۔

ترجمہ: ”ان جانوروں میں تمہارے لیے غور و فکر کا موقع ہے، ہم تم کو گوبرا اور خون کے درمیان
سے خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے، (انخل: آیت 66)۔“

۴۔ ہوا اور پانی سے استدال:

ہوا اور پانی انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں، جن کے بغیر سلسلہ حیات زیادہ دیر
تک قائم رہنا مشکل ہے۔ ان دونوں میں سے ہوا سب سے اولین ضرورت ہے، جس کے
 بغیر چند منٹ تک بھی انسان یا کسی بھی حیوان کا رشتہ حیات قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ
نے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور دنیا میں کہیں بھی کسی انسان کی اپنی تدبیر یا
حسن انتظام کے بغیر ہی اسے اسی طرح ہوا بہم پہنچائی جاتی ہے جس طرح ہوا بندانڈے میں
مرغی یا پرندے کے ایک نوازائیدہ چوزے کو یا سمندر کی تہہ میں ایک مچھلی کو یا زمین کے اندر

کسی کیڑے کو پہنچائی جاتی ہے۔

اسی طرح پانی کی فراہمی کا نظام بھی بیانی طور پر قدرت نے اپنے ہاتھوں میں لیے رکھا ہے۔ قابل غور بات تو یہ ہے کہ کارپوریشن اگر اپنے پائپ لائن کے ذریعے پانی فراہم کرے تو ہم اس کے انتظام کو بلا چون وچم کرتے رہتے ہیں اور خالق واللہ جس نے روئے زمین کے ہر خطے میں اپنی مخلوق کے لیے پانی کی فراہمی کا عالمی نظام قائم کر رکھا ہے اس کے وجود اور تصرف حقیقی کو ماننے سے ہم انکار کر دیں۔ حالانکہ یہ اُسی کا تو انتظام ہے کہ کہیں وہ انسانوں کے لیے ٹھنڈا میٹھا پانی میدانی کنوں کی شکل میں زیر زمین استاک کرتا ہے۔ کہیں پہاڑی چشموں کی شکل میں اسے خود رواں کر دیتا ہے۔ کہیں برفانی تودوں کی شکل میں اسے پکھلا کر نہروں اور دریاؤں میں رواں دواں فرماتا ہے، کہیں بادلوں کی شکل میں اسے استاک کرتا ہے اور ہواؤں کے دوش پر جہاں اس کی مشیت ہوتی ہے، لے جا کر برساتا ہے کیا یہ سب کچھ اس کی وجود کی منہ بولتی دلیل نہیں ہے، ارشاد فرمایا:

”وَمِنْ أَيْتَهُ الْجَوَافِ فِي الْبَحْرِ كَلَّا عَلَمْ رَأَى إِنْ يَسَاوِي سُكِّينَ الرِّيحِ قَيْظَلْنَ سَرَّاً وَأَكَدَ عَلَى ظَهُورِهِ“۔

ترجمہ: ”اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی سمندوں میں رواں دواں پہاڑوں کی مانند جہاز ہیں، اگر چاہے تو ہواؤں کو روک لے او یہ جہاز سمندر میں کھڑے کے کھڑے رہ جائیں، (اشوری: 32-33)“۔ نیز فرمایا:

”وَمِنْ أَيْتَهُ أَنْ يُرِسِّلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرًا تَوْلِيدًا يَقْلُمُ قِنْ رَاهْمَتِهِ وَلَتَجْرِيَ الْفُلُكُ بِإِمْرِهِ وَلَتَبْتَغُوا مِنْ فَصْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَسْكُرُونَ“

ترجمہ: ”اور اس کے نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایسی ہواں ہیں بھیجا ہے جو تمہیں بارش کی آمد کی خوشخبری دیتی ہیں کہ تم اس کی رحمت پا سکو اور انہی ہواؤں سے اس کے حکم سے جہاز چلتے ہیں تا کہ تم (تجارت کے ذریعے) اللہ کا فضل ڈھوند سکو اور اس نعمت پر اس کا شکر ادا کر سکو، (الروم: 46)“۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

”أَقْرَءَنَا مِنْ الْمَاءِ الَّذِي شَرَبْنَا ۖ إِنَّمَا أَنْتُمْ أَنْتَلْسُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ
الْمُنْزِلُونَ ۚ لَوْتَشَاءُ جَعْلَنَةً أَجَاجًا قَلْوَلًا تَشْكُرُونَ ۚ“ -

ترجمہ: ”کیا وہ پانی جو تم پینے ہو اسے بادلوں سے تم نے اتنا رہے یا ہم اتنا نے والے
ہیں، اگر ہم چاہیں تو اسے اس قدر کڑوا کر دیں کہ پی نہ سکو، پھر تم کیوں اس کا شکر ادا نہیں
کرتے، (الواقعہ: 68-70)۔“

۵۔ انقطاع اسباب سے استدلال

ہماری اس موجود، محسوس اور مشاہداتی دنیا میں علت اور طول اور سبب و مسبب
کا ایک طویل سلسلہ ہے، ہر چیز اپنے وجود میں کسی سبب اور علت کی محتاج ہے، عالم آب
و گل میں کوئی شے بغیر سبب کے ظہور میں نہیں آتی اور ہر ممکن کا کوئی نہ کوئی سبب ہے۔ اب
اگر اسباب و مسببات کا سلسلہ یونہی چلتا رہے تو ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو جائے گا جو عقل اور
عادتاً محال ہے، پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں جا کر سلسلہ اسباب کی
ایسے سبب پر ختم ہو جاتا ہے جو خود اپنی ذات سے قائم ہے اور اپنے وجود میں کسی اور کا محتاج
نہیں ہے، وہ امکان و احتیاج سے پاک ہے، بس وہی واجب الوجود ہے اور تمام عالم کا موجود
اور خالق ہے۔ جیسے آپ اپنی پیدائش کے ظاہری اسباب کا تعین کرنے چلیں اور سلسلہ تو والد و
تناسل میں اپنے آباء کا حوالہ دیتے چلے جائیں۔ مگر آخر کار یہ سلسلہ آدم علیہ السلام پر جا کر
رک جائے گا اور ان کی تخلیق کا کوئی عقلی اور مادی سبب ملا نادشوار ہو جائے گا، سو ائے اس کے یہ
تسلیم کر لیا جائے کہ اسے خداوند تعالیٰ اور قادر و قیوم نے اپنی مشیت سے پیدا کیا ہے۔

۶۔ انسانی وجود اور اس کے تخلیقی مراحل سے استدلال:

الله رب العزت نے انسان کو قرآن میں بارہا متوجہ کیا ہے کہ وہ اپنی حقیقت پر
غور کرے کہ اس کی اصل کیا ہے۔، پھر خود بتایا کہ تمہیں ایک بے جان مادے سے پیدا کیا،
جو پہلے ”نُفَّهَ“ تھا، پھر اسے ”عَلَّقَهَ“ مجذد خون کی طرح، بنایا، پھر اسے مُضْغَه گوشت کا

لو تھر ابنا یا، پھر ہڈیوں اور گوشت کے امترانج سے تمہارا مادی وجود تیار ہوا، پھر اس نے اسے صورت عطا کی، ارشاد فرمایا:

”هُوَ الَّذِي يُصْوِرُ لَكُمْ فِي الْأَنْهَارِ كَيْفَ يَسْعَءُ“۔

ترجمہ: ”وہی تو ہے جو تمہیں ماوں کے رحموں میں جو صورت چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔“

(آل عمران: 6)

پھر وہ خالق و مالک انسان کو ماں کے پیٹ سے نکال کر خارجی دنیا میں لاتا

ہے، فرمایا:

**”وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهِتُكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ
الْأَقْدَةَ لِتَعْلَمُ دِسْكُرُونَ“۔**

ترجمہ: ”اور اللہ نے تمہیں ماوں کے پیٹ سے (روح ڈال کر) نکالا اس طرح کہ تم کچھ جانتے نہ تھے اور پھر (اس نے اپنی قدرت سے) تمہیں (سنے کے لیے) کان دیے، (دیکھنے کے لیے) آنکھیں دیں اور (سمجنے کے لیے) دل و دماغ دیے تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ، (نحل: 78)،“ اور فرمایا:

”سَرِّ يَوْمِهِمْ أَيْتَنَافِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ“۔

ترجمہ: ”ہم انھیں اپنی قدرت و وجود کی نشانیاں دکھلائیں گے آفاق عالم میں اور خود ان کی ذات میں یہاں تک کہ یہ بات ان پر بالکل واضح ہو جائے کہ ذات باری تعالیٰ حق ہے۔“

(حمد و سجدہ: 53)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”پاک ہے وہ ذات جس نے چربی کی ایک بوٹی سے دکھایا، نرم ہڈی سے سنوا یا اور گوشت کے ایک ٹکڑے کو گویا کر دیا۔“

جو لوگ انسان کو محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھتے ہیں وہ اس بات کی کیا تو جیہہ کریں گے کہ انسان کے جسم میں ہر جگہ گوشت ہے، پھر بولنے کا خاصہ صرف زبان میں کیوں ہے اور دیکھنے کے لیے صرف آنکھیں کیوں مخصوص ہیں، جسم کے کسی اور حصے کی چربی کو آلہ بینائی

کیوں نہ بنایا۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ شطرنج کا موجد کتنا عظیم شخص تھا کہ اُس نے شطرنج کے خانوں میں اتنی بے شمار چالیں ایجاد کر لیں۔ آپ سینکڑوں مرتبہ کھلیلیں، ہر بار بازی مختلف ہو گی، آپ نے فرمایا: میں اس سے کہیں زیادہ بڑے امر پر تعجب کرتا ہوں کہ انسان کا چہرہ صرف بالشت بھر کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے حدود اربعہ میں اربوں کھربوں بلکہ لا تعداد انسانی چہرے پیدا کیے اور ہر چہرہ دوسرے سے مختلف، اتنی لا تعداد صورتیں لیکن ہر صورت اور ہر شکل میں ایک انفرادیت ہے، یہ ہے اس کی مصوری اور نقاشی، اس کا انکار عقل سلیم کیونکر کر سکتی ہے اور چہرہ تو بہت بڑی بات ہے ایک دوائچ کا انگوٹھا، کسی ایک انگوٹھے کی لکیریں دوسرے سے نہیں ملتیں اور پھر ہر ایک کاذ، ہن جدا، سوچ جدا، رنگ و خدوخال میں انفرادیت حتیٰ کہ ہر انسان ایک مستقل کائنات ہے۔

توحیدے دلائل:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”لَوْ كَانَ فِيهِمَا إِلَهٌ مُّلْكٌ إِلَّا لِلَّهُ لِفَسْدِ تَمَّا“

ترجمہ: ”اگر اس زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبد بھی ہوتا تو ان کا نظام درہم برہم ہو جاتا، (الانبیاء: 22)۔“

کیونکہ اگر بفرض محال دو خدامان لیے جائیں تو ہر ایک کے لیے قدرت کاملہ تسلیم کرنی پڑے گی۔ ہر ایک حرکت و سکون اور موت و حیات پر قادر ہو گا۔ فرض کیجیے: ایک خدا زید کو مارنا چاہتا ہے اور دوسرا زندہ رکھنا چاہتا ہے، اب دونوں باتیں بیک وقت و قوع پذیر نہیں ہو سکتیں کیونکہ اجتماع ضدین محال ہے۔ لازماً ایک بات ہو گی دوسری نہ ہو سکے گی، جس خدا کی مشیت دارادہ نافذ نہ ہو سکا، وہ مجبور قرار پائے گا اور جو مجبور ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ خدا تو ہے وہی جو ”فَعَالٌ لَّمَّا يُرِيدُ“ ہے، (جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے)، (ہود: 107)، اور جس کی شان یہ ہو:

”إِذَا آَتَاهُ دَشِيْعًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“

ترجمہ: ”بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے کہتا ہے: ہو جاتو وہ ہو جاتی ہے۔“ (لئیں: 82)

(۲) مشہور کہادت ہے: ”دو بادشاہ درائیے نہ گنجد“، یعنی دو بادشاہ ایک ریاست میں نہیں سا سکتے، لہذا اگر زمین و آسمان میں ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو ان کا آپس میں تصادم ناگزیر ہتا، اور ان کا تصادم کائنات کی مکمل تباہی پر منتج ہوتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”هُما كَانَ مَعَهُ مِنْ رَبِّهِ إِذَا لَرَأَهُ هَبَ كُلُّ إِلَيْهِ بِإِيمَانٍ وَلَعَلَّا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ“۔

ترجمہ: ”اور اس کے ساتھ کوئی اور معبد نہیں ہے، ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہر ایک اپنی مخلوق کو لے کر چل پڑتا اور وہ ایک دوسرے پر چڑھاتی کرتے، (المونون: 91)، نیز فرمایا:

”قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ إِلَهٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذَا لَا يَتَعْنَوُ إِلَى ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا“۔

ترجمہ: ”کہہ دیجیے: اگر اللہ کے ساتھ کچھ اور معبد بھی ہوتے جیسا کہ کفار کہتے ہیں، تو تب وہ صاحب عرش کی طرف راستہ ڈھونڈتے، (بنی اسرائیل: 42)۔“

(۳) اس کے علاوہ قرآن مجید نے متعدد آیات میں جا بہ جا مختلف اسلوب اور انداز بیان اختیار کرتے ہوئے عقیدہ توحید کو لنшин انداز میں ذہن نشین کرایا ہے، چنانچہ فرمایا:

”اللّٰہُ لَا إِلٰہَ إِلَّا هُوَ“۔

ترجمہ: ”اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، (البقرہ: 255)۔“

”هُوَ اللّٰہُ الَّذِي لَا إِلٰہَ إِلَّا هُوَ“۔

ترجمہ: ”وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی لاائق عبادت نہیں، (الجھر: 22)۔“

(۴) سورہ اخلاص بطور خاص توحید کے بیان پر مشتمل ہے، جس میں ارشاد ہوتا ہے:

”قُلْ هُوَ اللّٰہُ أَحَدٌ ۝ أَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوا
أَحَدٌ ۝“۔

ترجمہ: ”کہہ دیجیے: وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر (اور مقابل) ہے، (الإخلاص: 1-4)۔“

شہادی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: مراتب توحید چار ہیں:
 (۱) یہ کہ صفت، وجوب وجود، کو اللہ کے ساتھ خاص کرنا کہ اس کے سوا کوئی واجب الوجود نہیں، (۲) ہر شے کا خالق اللہ کو مانتا، یہ دونوں مراتب مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے نزدیک بھی مسلم تھے، (۳) ہر شے کا مذم صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھے، (۴) اس کے سوا کسی دوسرے کو مستحق عبادت نہ سمجھا جائے، یہ دونوں مرتبے آپس میں لازم و ملزم ہیں، ان دونوں مراتب میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے، جن میں بڑے گروہ تین ہیں: اول: نجومی (کو اکب پرست)، دوم: مشرکین عرب، سوم نصاریٰ۔

شرک کی تعریف:

اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی جملہ صفات یا کسی ایک صفت میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرانا۔ قرآن نے عرب میں راجح بہت سے مشرکانہ عقائد کا ذکر کیا ہے، مثلاً:
 (۱) وہ وجود باری تعالیٰ کے تو قائل تھے، لیکن اپنے معبد ان باطلہ کو خدا کا نائب قرار دیتے تھے، انھیں امور میں متصرف سمجھتے تھے اور ان کی عبادت کو تقرب الہی کا ذریعہ سمجھتے تھے چنانچہ قرآن مجید میں ان کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:
 ”مَا لَعِنْدُهُمْ إِلَّا لِيُقْرَبُونَ إِلَى اللَّهِ بِأَنْلَاقٍ“۔

ترجمہ: ”ہم ان کی عبادت محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کریں“۔
 (الزمر: 3)

”وَيَقُولُونَ هُوَ لَا يُشْفَعَ عَنْ أَنَّا عِنْدَ اللَّهِ“۔

ترجمہ: ”یہ (معبد ان باطلہ) اللہ کے نزدیک ہمارے سفارشی ہیں، (یوس: 18)“۔
 (۲) بعض مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:
 ”أَمْ لَهُ الْبَنَّةُ وَلَكُمُ الْبَنَّوْنَ“۔

ترجمہ: ”کیا اس کے لیے بیٹیاں ہوں اور تمہارے لیے بیٹے، (الطور: 39)“۔

(۳) یہود عزیز علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور نصاریٰ عسکری علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عَزِيزٌ أَبْنَى اللَّهُ وَقَالَتِ النَّصَارَى مَسِيحٌ أَبْنُى اللَّهُ۔

ترجمہ: ”اور یہود نے کہا: عزیز اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاری نے کہا: مسیح، اللہ کے بیٹے ہیں۔“

(التوبہ: 30)

دہریوں کا عقیدہ:

قرآن مجید میں ہے:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاةٌ لَّا يَأْتُ مَوْتٌ وَّنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا اللَّهُ هُنَّ

ترجمہ: ”دنیا کی زندگی ہی (تو سب کچھ ہے) ہم مر جاتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں اور ہمیں زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے، (الجاثیہ: 24)۔“

یہ لوگ ہیں جو کسی ما بعد الطبعاتی (Meta Physics) وجود کے قائل نہیں ہیں، یہ کائنات کو ایک حادثہ اتفاقی سمجھتے ہیں اور کائنات میں جو ظاہری نظام اور تسلسل ہے اُسے بھی محض بخت و اتفاق قرار دیتے ہیں۔

وجود باری تعالیٰ اور علوم جدیدہ:

جدید علوم میں سائنس سرفہrst ہے، سائنس کی بنیاد حواس، مشاہدے، تجربے اور عقل پر ہے۔ اصولی طور پر سائنسی علوم کا تعلق مادی دنیا سے تھا اور اس کا ما بعد الطبعات سے کوئی تعلق نہیں ہے، جب کہ عقیدہ توحید اور امور غیریہ سے متعلق تمام معتقدات غیر مادی اور ما بعد الطبعاتی ہیں، لہذا سائنس اور اسلامی معتقدات میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ تا ہم وجود باری تعالیٰ کے بارے میں غیر مذہبی سائنسدانوں کے دو نظریات ہیں:

ایک نظریہ یہ ہے کہ جس چیز تک مادی وسائل، سائنسی آلات، مشاہدات و تجربات اور عقل و خرد سے ان کی رسائی ہو جائے اسے وہ مان لیتے ہیں اور جس چیز تک ان کی رسائی نہ ہو سکے اس کے وجود کا کلیہ انکار کر دیتے ہیں، یہ نظریہ بجائے خود ”غیر سائنسی فک“ ہے اور خلاف عقل ہے، کیونکہ کسی چیز کا عدم علم اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ بہت سے علمی اکشافات، سائنسی ایجادات اور کائنات کے اسرار و موز کے بارے میں بہت سی

معلومات ایسی ہیں جو آج کے انسان کو معلوم ہیں لیکن آج سے دو سال پہلے کے انسان کو معلوم نہیں تھیں تو کیا ان کی لاعلی ان اشیاء و ایجادات کے عدم ثبوت کا سبب بن سکی اور عین ممکن ہے کہ بہت سی ایسی اشیاء کا ہم آج تک نہیں جانتے، بل کہ انسان اس پر مطلع ہو جائے اور اس کے بارے میں مکمل علم حاصل کر لے۔

دوسرانظر یہ ہے کہ جس چیز تک ہمارے ذرائع علم کی رسائی نہیں ہوگی اگر ہم اس کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں ہیں تو اس کے انکار کی بھی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، ہمیں ایسی چیزوں کے بارے میں توقف کرنا چاہیے۔

لہذا ہم ذاتِ باری تعالیٰ اور دیگر امور غیریہ کا نہ اثبات کرتے ہیں اور نہ انکار یہ نقطہ نظر اگرچہ بظاہر سائنسک اور معقول نظر آتا ہے، لیکن دراصل غیر معقول اور غیر حقیقت پسندانہ ہے، کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ اور دیگر امور غیریہ جو مابعد الطبيعاتی حقائق ہیں اور غیر مادی اشیاء ہیں۔ ان تک مادی ذرائع و اسباب اور آلات سے رسائی کی کوشش ہی غیر معقول غیر سائنسک اور غیر حقیقت پسندانہ ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ذاتِ باری تعالیٰ کو جانے کا ایک ہی قطعی اور یقینی ذریغہ ہے، جس کا سرچشمہ خود اس کی اپنی ذات ہے اور وہ ہے ”وَحْيٌ رَبَّانِي“ جو نبوت و رسالت کے ذریعے اس نے خود اپنے بندوں تک پہنچائی ہے اور جس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

انفرادی اور اجتماعی زندگی پر عقیدہٗ توحید کے اثرات ۱۔ مخلوق کی بندگی سے نجات:

جو شخص اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر یقین کامل رکھتا ہے، وہ اسے خالق و مالک، علیم و خبیر اور قادر و قیوم سمجھتا ہے۔ اس کی جیبن نیازِ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہیں جھک سکتی، بڑے سے بڑے صاحب اقتدار و اختیار انسان کائنات کے بڑے سے بڑے عجوبے، قوت و طاقت کے بڑے سے بڑے مظہر مثلاً سورج، چاند، کواکب و نجوم،

آگ، پھاڑ، بادوباراں، دیوی و دیوتا، جن و ملک وغیرہ سب کو اپنی طرح اللہ کی مخلوق سمجھتا ہے، اس لیے کسی کے آگے ”سجدہ بندگی“ بجانبیں لاتا، بقول شاعر:

یہ ایک سجدہ ہے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یعنی خالق حقیقی کا بندہ مخلوق کی بندگی سے نجات پایتا ہے۔

۲۔ مقام انسانیت کا اور اک:

جب انسان خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے تو عرفانِ رب کے فیضان سے اسے عرفانِ ذات بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق بلا مقصد اور بلا سبب نہیں ہے، اس کا اس کائنات میں ایک مقام ہے، ایک انفرادیت ہے، وہ شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ آخر قدرت کی کیا مصلحت و حکمت ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے ایک حقیری شے ہوتے ہوئے بھی پوری کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔

بڑے بڑے قوی الجثہ حیوانات، پھاڑوں کی رفتیں، زمین کی وسعتیں، سمندروں کی گہرائیاں اور جولانیاں، فضاوں کی وسعتیں اور پہاڑیاں، سب اس کے تصرف میں، اس کے زیر نگیں اور اس کے کنٹروں میں ہیں۔ تب اسے حسas ہوتا ہے کہ وہ کائنات کے لیے نہیں بلکہ کائنات اس کے لیے ہے، اس کا مقام مخلوق میں سب سے اعلیٰ اور سب سے برتر ہے، اس کا منصب، منصبِ خلافتِ الہیہ ہے۔

۳۔ اصلاحِ نفس اور عدل سخاوت اور شجاعت الیٰ صفات سے آرائشی:

جوں جوں اللہ کی ذات پر انسان کا ایمان راخن ہوتا ہے اور وہ اسے قادر مطلق سمجھتا ہے، اس کا ایمان ہوتا ہے کہ موت و حیات اور رزق اسی کے وسیت قدرت میں ہے۔ وہ علیم و خبیر ہے اور سمجح و بصیر ہے اور انسان کے ظاہر و باطن سب سے باخبر ہے، ہر عمل کا وہ حساب لے گا۔ احتساب کا یہ احساس انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات سے اور دوسرے انسانوں سے عدل و انصاف سے پیش آتا ہے، وہ اللہ کی راہ میں اور انسانیت کی فلاح کے

لیے اپنے مال خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتا، کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ ہوتا ہے، وہ اللہ کی امانت میں چلا جاتا ہے اسی طرح جسے اس بات پر ایمان ہو کر موت و حیات اللہ کے دست قدرت میں ہے وہ باطل کی کسی قوت سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا اور باطل سے جب بھی مقابلہ درپیش ہوتا ہے وہ شجاعت اور بہادری سے مقابلہ کرتا ہے اور جان کی قربانی سے بھی درلغ نہیں کرتا۔

۲۔ عالمگیر انسانی اخوت کی بنیاد:

اس وقت بھی اور تاریخ کے ہر دور میں انسانوں کو مختلف طبقات میں اور مختلف خانوں میں بائنا جاتا رہا ہے، کہیں ذات پات کی بنیاد پر، کہیں رنگ و نسل کی بنیاد پر کہیں زبان کی بنیاد پر، کہیں علاقائیت اور جغرافیائی بنیاد پر، کہیں خاندانوں اور قبیلوں کی بنیاد پر انسان کو انسان سے جدا کیا گیا ہے، فرد کو فرد سے اور اقوام کو اقوام سے لٹایا جاتا رہا ہے۔ انسانیت ہمیشہ کثی رہی، تڑپتی رہی، لرزتی رہی اور چند درندہ صفت لوگ انسانیت کی اس تباہی، قتل عام اور رسولی کا تمماشہ دیکھتے رہے اور مفادات سکھتے رہے۔

عقیدہ توحید ایک ایسی بنیاد ہے جس پر عالمگیر انسانی اخوت کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے، کیونکہ انسان دُنیا میں جہاں کہیں بھی ہوا گروہ اللہ جل شانہ، کی ذات پر کامل ایمان رکھتا ہے اور اسکے رسول کے لائے ہوئے دین پر کار بند ہے تو وہ دوسرے انسان کا بھائی ہے جو اسی عقیدے اور نظریے کا حامل ہے خواہ اس کا رنگ، وطن، علاقہ، قبیلہ، زات، خاندان جو بھی ہو، گویا نظریہ اسلام اور توحید کی بنیاد پر جو اخوت وجود میں آتی ہے، وہ سرحدوں کی پابند نہیں ہوتی، مولانا جائی علیہ الرحمہ نے کہا تھا:

بندہ عشق شدی ترکِ نسب کن جائی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیز سے نیست

اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام مومنینا و فرزندان تو حید کو آپس میں بھائی قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اللہ کے بندوں کو بھائی بھائی بن جانے کی تاکید فرمائی

ہے اور ان سب کو ایک عمارت سے اور ایک جسم سے تسلیہ دی ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھنے کا نتیجہ ہے، علامہ اقبال نے کہا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لیکر تابہ خاک کا شفر
اور علامہ اقبال ہی کے بقول:

بتان رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تو رانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

۵۔ دنیوی اور اخروی نجات کا ضامن:

انسانی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ انسان آج تک ایسے نظام زندگی اور روابطہ حیات کی تلاش و جستجو میں سرگردیاں ہے جو اس کی فوز و فلاح اور کامیابی کا ضامن ہو۔ انسان نے مختلف ادوار میں آج تک متعدد نظام تخلیق کیے، نت نئے تجربات کیے لیکن انسان کا بنا یا ہوا کوئی بھی نظام حرف آخر ثابت نہ ہو سکا۔ چنانچہ آج تک بہتر سے بہتر کی جستجو جاری ہے۔ کیونکہ انسان کا خود ساختہ نظام چونکہ انسانی ذہین کی تخلیق ہوتا ہے اور انسانی ذہن محدود ہونے کی بنا پر لا محدود تقاضوں اور ضرورتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا اور پھر زبان و مکان اور شخصی اور گروہی مفادات کی گرفت سے نکل نہیں پاتا، اس لیے اس کی سوچ بھی مفادات کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہذا انسانی فلاح اور نجات، دنیوی و اخروی کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے کہ انسان خود اپنا ہادی بننے کی بجائے اپنے خالق سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرے اور اس کی عطا کرده ہدایت کو قبول کر کے اس پر عمل کرے، اسی میں اس کی فلاح و نجات ہے۔



رسالت

اسلامی عقائد میں عقیدہ رسالت نہایت اہمیت کا حامل ہے، حتیٰ کہ کوئی شخص رسول کو مانے بغیر خدا کو مان بھی لے تو اس کا یہ ایمان مقبول نہیں ہے۔ اگر مقام رسالت کی ادنیٰ بے ادبی ہو جائے تو عمر بھر کی کمائی ہوئی نیکیاں اکارت ہو جاتی ہیں، اگر کوئی شخص کمالات رسالت کو بڑھا کر الوہیت کی سطح پر لے آئے تو شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

الحاد اور دہریت نے شبہات پیدا کر دیے کہ نبی کی کیا ضرورت ہے، وصالِ خدا تو اس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ رسول کی حیثیت ایک مرکز ملت اور سربراہ مملکت سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے اس کی افعال اور اقوال قیامت تک باقی رہنے والے قوانین کی اساس نہیں بن سکتے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ رسول ہماری طرح ایک عام انسان تھے فرق صرف یہ ہے کہ ان پر وحی آتی تھی، اس لیے ضرورت نبوت اور منصب نبوت کی خصوصیات پر چند اہم نکات پیش کیے جا رہے ہیں:

ضرورت نبوت:

انسان اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے احکام کی معرفت کے لیے قدم قدم پر رسول کا محتاج ہے، نجاتِ آخرتی تو دور کی بات ہے حیات دنیوی میں بھی انسانی معاشرے کے لیے تعلیمات نبوت کے بغیر کوئی صالح نظام وجود میں نہیں آ سکتا، علماء کرام نے عقل سلیم کی تفہی کے لیے ضرورت نبوت پر متعدد دلائل دیئے ہیں جس میں چند ایک یہ ہیں۔

(۱) اللہ نے جس طرح انسانی محسوسات کے لیے جسم کو پیدا فرمایا، معانی کے ادراک کے لیے عقل سلیم کو پیدا کیا، اسی طرح وحی اور غیب کے ادراک کے لیے نبوت کو پیدا فرمایا۔

چنانچہ نبوت نام ہی ”اطلاق الغیب“ کا ہے، ہمارے پاس نبی کے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ملائک، جنت و جہنم اور عالم آخرت کی تفصیلات کو جاننے کا کوئی اور

ذریعہ نہیں ہے۔

(۲) آنکھ کی بصارت سے جو نور طاہر ہے، اس سے اشیاء کو اس وقت تک نہیں دیکھا جاسکتا جب تک کہ کوئی خارجی نور (مثلاً: نہش و قمر، کواکب و نجوم، برق اور چراغ وغیرہ) اس کی مدد کے لیے موجود نہ ہو، اسی طرح عقل کی بصیرت جو نور باطن ہے، اور جسے ذات باری تعالیٰ کی معرفت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس وقت تک ذات الہی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی جب تک ”نور نبوت“ اس کا ہادی و رہبر اور معاون نہ ہو۔

(۳) یہ درست ہے کہ حواس انسانی ذریعہ علم ہیں، لیکن بعض اوقات حواس غلطی کر جاتی ہیں، مثلاً: تیز رفتار سواری میں بیٹھے ہوئے شخص کو درخت اور اشیا ساکن ہونے کے باوجود متحرک نظر آتے ہیں، سراب پر پانی کا گماں ہوتا ہے، حواس کی ایسی غلطیوں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا فرمایا، اسی طرح بعض اوقات عقل انسان بھی بھٹک جاتی ہے، پس ضروری تھا کہ اسے راہ راست پر لانے کے لیے بھی کسی مصلح اور ہادی کو پیدا کیا جاتا اور جو حقیقت عقل کی اصلاح کرنے والی ہے، وہی نبوت ہے۔

(۴) بعض لوگوں کا یہ خیال قطعاً باطل ہے: ”جب انسان کے پاس حواس اور عقل دونوں موجود ہیں تو اسے ہدایت کے لیے نبوت اور رسالت کی کوئی ضرورت نہیں ہے“، خدا کی معرفت کے لیے نہ حواس کافی ہیں نہ عقل۔ جن لوگوں نے معرفت باری تعالیٰ کے لیے حواس کو کافی سمجھا وہ مظاہر کائنات کی پرستش میں بتلا ہو گئے کسی نے آگ کی پوجا کی، کسی نے گنوماتا کی، کوئی بُت پرستی کا شکار ہوا اور کوئی کواکب کو پوچنے لگا اور جنہوں نے عقل پر اعتماد کیا ان میں سے اکثر لوگ خدا کے منکر ہو گئے اور جو صریح انکار کی جرأت نہ کر سکے، انہوں نے تلاشِ حق میں ٹھوکریں کھائیں اور معرفت کی راہوں سے بہت دور جا پڑے۔ عقل نارسا نے انھیں شکوک و اوہام میں بتلا کر دیا، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِنْ تُطْعِمُ أَكْثَرَهُمْ فِي الْأَرْضِ يُضْلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَبَعُونَ إِلَّا لَذَنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ۔

ترجمہ: "اگر تو اطاعت کرے اکثر ان لوگوں کو جوز میں میں ہیں، تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکار دیں گے، وہ تو محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور تخمینے، قیاس اور انکل کے سوا ان کے پاس کیا رکھا ہے، (الانعام: 116)"۔

اہنہا حقیقتِ مطلقہ (Absolute Reality) تک رسائی کے لیے صرف اور صرف ایک ہی قطعی اور یقینی ذریعہ ہے جس کا سرچشمہ فیض خود اسی کی ذات ہے اور وہ ہے نبوت و رسالت۔

(۵) اگر عقل ہادی مطلق اور ہیر کامل بن سکتی تو تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں بڑے بڑے عقلاً اور فلاسفراً نت نئے فلسفے اور ما بعد الطیبعتی نظریات قائم کیے گئے۔ مگر کبھی بھی کسی ایک دور کے یا مختلف ادوار کے عقلاً اور فلاسفراً کسی ایک نظریے پر مجتمع نہ ہو سکے، ان کے تصورات، عقائد اور نظریات میں تضاد اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا منبع علم، سرچشمہ فیض اور امام ہدایت ناقص ہے اور جو بجائے خود ناقص ہے، کبھی معلم کامل اور ہادی مطلق نہیں بن سکتا اور اس پر کبھی بھی غیر مشروط اور مطلق اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے عکس ہم دیکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ نبوت کی ایک لمبی کڑی ہے۔ ان کے زمانے، ان کی اقوام اور ان کے خطے مختلف ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی اساس تعلیمات، اصول، عقائد اور نظریہ آخرت میں ذرہ بھر بھی تضاد، تصادم، نکراو اور الجھاؤ نہیں ہے۔ اس کا سبب صرف اور صرف یہی ہے کہ ان کا سرچشمہ فیض منبع ہدایت اور مرکز ہدایت ایک ہی ہے اور وہ ہے ذات باری تعالیٰ، ان کا ذریعہ علم ایک ہے اور ہے وحی خداوندی، وہ قطعی، یقینی، حق اور سچ ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

(۶) اگر کوئی یہ کہے کہ ہدایت کے لیے تو "کتاب الہی" کافی ہے، ابے مضبوطی سے ٹھائے رکھو، نبی کی ذات سے وابستگی کی اور چھٹے رہنے کی کیا ضرورت ہے، تو جواباً عرض ہے: اول تو وہ "کتاب ہدایت" اور "وحی الہی" بھی ہم تک براہ راست نہیں پہنچی بلکہ

نبی اور رسول کے دلیلے ہی سے پہنچی ہے، تو یہ صریح ظلم اور احسان فراموشی ہو گی کہ ہدایت کو لے لیا جائے اور بادی کو نظر انداز کر دیا جائے۔

دوم یہ کہ اگر مخفی کتاب ہدایت ہے یہ نازل کی گئی ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ احکام و ادالہ تو اچھے ہیں، مگر ہمارے لیے قابل عمل نہیں ہیں، ان پر عمل کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے یا یہ کہ ہم عمل تو کرنا چاہتے ہیں مگر طریقہ عمل نہ ہمیں معلوم ہے اور نہ کتاب میں اس کی کوئی ضاحت کی گئی ہے، (مثلاً: صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ اور حج کے احکام) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت سے اس قسم کے تمام خدشات اور اعتراضات کا سدہ باب فرمایا، اس نے کتاب کے ساتھ صاحب کتاب کو بھی مبوث فرمایا جو ہیں تو انسان ہی کی نوع سے مگر ایسے انسان کامل کہ جس پر ملائکہ بھی رشک کریں۔

صاحب قرآن نے انسانیت کو قرآن پر عمل کر کے دکھایا، نمونہ عمل اور اسوہ حسنہ قائم کیا، احکام الہی کی توضیح و تشریع کی اور عمل کا طریقہ بتایا اور واضح فرمادیا کہ نبی کا عمل ہی مدعا و مقصود قرآن ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمْ أَصْلِنِي"۔
ترجمہ: "جس طرح مجھ کو نماز پڑھتے دیکھو، ویسے ہی نماز پڑھو، (صحیح البخاری: 6008)"۔

اور فرمایا:

"إِذَا خَذَلْتُمْ مَنَّا سِكْنُمْ"

ترجمہ: "مجھ سے مناسک حج سکھو، (صحیح مسلم: 1297)"۔

یعنی قرآن کتاب ساکت ہے اور نبی کتاب ناطق، قرآن الفاظ ہیں اور سیرت رسول اس کے معانی، جس طرح لفظ کا رشتہ معنی سے ٹوٹ جائے تو وہ مفید نہیں رہتا۔ اسی طرح قرآن کو اگر "صاحب قرآن" سے الگ کر دو تو اس کی ہدایت سے ہم مستفید و مستفیض نہیں ہو سکتے۔

(۷) انسان جسم اور روح سے مرکب ہے، اسی لیے اس میں حیوانی تقاضے بھی ہیں اور ملکوتی بھی۔ انسان کی روحانیت اور ملکوتیت اس بات کی مقاضی ہے کہ اس کا رشتہ عالم بالا سے قائم

ہو۔ خالق سے ربط و نسبت، اس سے اکتساب فیض اور اس کی ذات کی معرفت انسان کی فطری ضرورت ہے، مگر ذات باری تعالیٰ سے انسان کے استفادے اور اکتساب فیض کے لیے کوئی وسیلہ، کوئی ربط اور کوئی واسطہ ضروری تھا، کیونکہ انسان کثیف ہے اور وہ لطیف، انسان مادی ہے اور وہ نور حضن، انسان عاجز و مجبور ہے اور وہ قادر و مختار، انسان ایک ذرہ ناچیز ہے اور وہ سحر ناپیدا کنار، انسان محدود و ممتنا ہی ہے اور وہ لاحد و دولا ممکن ہے اور وہ واجب الوجود، لہذا انسان اس سے اکتساب کرے تو کیسے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو پیدا فرمایا، جنہیں یہ ملکہ عطا فرمایا کہ اللہ کی ذات سے فیض حاصل کریں اور بندوں کو فیض پہنچائیں، گویا ان کی شان یہ ہو: ”ادھر اللہ سے واصل، ادھر مخلوق میں شامل“۔

یہاں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ معاذ اللہ! اللہ فیض پہنچانے پر قادر نہیں ہے، بلکہ ہر بندے میں براہ راست یا فرشتے کے توسط سے اکتساب فیض کی استعداد، صلاحیت و الہیت ہی نہیں رکھی گئی۔

منصب نبوت و رسالت:

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جو مراتب اور درجات عطا کیے ہیں، ان میں نبوت کا درجہ، نبی کا مرتبہ، رسول کا عہدہ اور منصب سب سے بڑا سب سے نمایاں اور سب سے ممتاز ہے، ان نفوسِ قدسیہ کو اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں میں سے منتخب فرماتا ہے اور ان کے ظاہر و باطن کو خصوصی کمالات، اخلاق و کردار اور علم و عمل کی عظیمتوں سے سرفراز فرماتا ہے۔

ان کے نفوس اللہ کے انوار و تجلیات سے مزین ہوتے ہیں۔ ان کی بشریت سب انسانوں سے اعلیٰ اور ان کی نورانیت ملائک سے افضل ہوتی ہے۔ ان کی خواہشات، ان کی سوچ، ان کی فکر، ان کا ظاہر اور ان کا باطن اللہ کی مشیت اور مرضی کے سانچے میں داخل جاتا ہے، یہ پیکر انسانیت اللہ کی ذات و صفات کے مظہر ہوتے ہیں، اس لیے ان کی حیثیت منفرد اور ممتاز ہوتی ہے جس کے چند پہلو زیل میں ذکر کیے جاتے ہیں:

ا۔ شارع کتاب اللہ:

نبی کا کام صرف کتابِ الہی کو پڑھ کر سنا نہیں ہوتا، بلکہ اس کی تشریح، وضاحت اور معانی و مطالب کی وضاحت بھی ہے، رسول کبھی اپنے قول سے کتابِ الہی کے معانی کو بیان فرماتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ كُرْتَبَيْنَ لِلنَّاسِ مَائِرِلَ إِلَيْهِمْ“۔

ترجمہ: ”اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو احکام واضح طور پر بیان فرمادیں جو ان کی طرف نازل کیے گئے ہیں، (انخل: 44)۔“

اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لیے قرآن مجید کے الفاظ نازل فرمائے، لیکن ان الفاظ کے معانی بیان کرنے کو رسول اللہ ﷺ کے پرد کر دیا، اگر نبی نہ ہوتے تو ہم قرآن کریم کی دی ہوئی ہدایات سے بھی مکمل طور پر مستفید نہیں ہو سکتے تھے، مثلاً: لفظ صلوٰۃ کے کئی معانی ہیں، لیکن لفظ صلوٰۃ سے جو اللہ تعالیٰ کا مقصود ہے، وہ ہمیں نبی ﷺ کی وضاحت اور آپ کی عملی سنت سے معلوم ہوا۔

۲۔ شارع احکام خداوندی:

نبی کی حیثیت مغض پیغام بریا قادر کی نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کی طرف سے مجاز اور با اختیار شارع ہوتا ہے، اس کا امر اللہ کا امر اور اس کی نبی خدا کی نہیں ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”أَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأَطْقَى الَّذِي يَجْدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَا مِنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبِيثَ وَيَعِظُهُمْ عَنِ الْمُحْرَمَاتِ وَالْأَعْلَمُ أَنَّهُمْ كَانُوا عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ امْتَنَعُوا هُوَ عَلَيْهِمْ أَوْلَادُهُمْ وَنَصْرَاؤُهُ وَاتَّبَعُوا التُّورَاةَ الَّذِي أُنْزَلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْفَلِحُونَ“۔

ترجمہ: (یہ وہ ہیں) جو پیر وی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی اُسی ہے، جس کے ذکر کو وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ (نبی) انھیں نئکی کا حکم دیتا ہے اور انھیں

برائی سے روکتا ہے اور پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور نتاپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ اتار پھینکتا ہے اور وہ زنجیریں (کاث پھینکتا ہے) جن میں وہ جگڑے ہوئے تھے، پس جو لوگ ایمان لائے (اس نبی امی پر) اور ان کی تعظیم کی اور ان کی برداشتی اور اس نور کی پیروی کی جوان کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ کامیاب دکاران ہیں، (الاعراف: 157)۔

دوسری آیت میں ارشاد باری ہے:

”مَا أَشْكُمُ الرَّسُولَ فَخَذُوهُ وَمَا نَهِّكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا“ -

ترجمہ: ”جو کچھ تمھیں رسول دیں اسے لے لوا و جس سے روکیں، اس سے بازاً جاؤ۔“ (اعشر: 7)

مندرجہ بالا دونوں آیات میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دینے والا، روکنے والا،
حلال کرنے والا اور حرام کرنے والا قرار دیا گیا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی واضح فرمادیا کہ
اس امر و نبی اور تحلیل و تحریم سے اس کی کوئی ذاتی غرض و ابستہ نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی فلاح
اور دنیوی و آخری کامرانی انہیں مقصود ہے اور چونکہ وہ علم رب انبی سے فیض یا ب ہیں، اس لیے
جس چیز کو حلال قرار دیتے ہیں وہ طیب اور پاک ہے اور جس چیز کو حرام قرار دیتے ہیں، وہ

خبیث اور نتاپاک ہے۔

۳۔ قاضی اور حکم مطلق:

رسول، اللہ کے دیے ہوئے علم و اختیار سے لوگوں کے معاملات کا فیصلہ فرماتے ہیں، مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ رسول کا فیصلہ کسی حاکم، سربراہ، مرکزلت یا جج کے نیٹے کی طرح ہوتا ہے کہ جس کے خلاف بعض صورتوں میں اپیل ہو سکتی ہے یا نظر ثانی ہو سکتی ہے یا ممکن ہے عدالتی فیصلہ ہونے کی بنا پر اسے ظاہراً تو تسلیم کر لیا جائے، مگر دل سے اسے تسلیم نہ کیا جائے یا اس میں کسی قسم کی غلطی یا ناصافی کا شہر کیا جائے، بلکہ یہ ایسا فیصلہ ہے جو بظاہر تو زبان رسالت سے نافذ ہوا، لیکن حقیقتاً اللہ کا فیصلہ ہے، کیونکہ یہ علم الہی اور نورِ نبوت کی

روشنی میں کیا جاتا ہے، اسی لیے اس میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا، سو اسے اس کے کہ دل کی گہرائیوں سے اسے تسلیم کیا جائے اور اگر بھی کے فیصلے پر اپنے دل میں نا انصافی یا غلطی کا ادنی سماشناہ بھی محسوس کرتا ہے تو وہ منافق یا کافر تو ہو سکتا ہے، مومن ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أُمْرًا أُنْيَكُونَ لَهُمُ الْخَيْرَ مِنْ أَمْرِهِمْ“

ترجمہ: ”کسی مومن مرد اور عورت کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر لیں تو پھر (وہ یہ سمجھیں یا چاہیں) ان کے لیے اس میں (اسی قبول کرنے یا اس پر عمل کرنے میں) کوئی اختیار ہے، (الاحزاب: 36)، ایک اور مقام پر فرمایا:

”فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فَإِنَّمَا شَجَرَ بِيَنْهُمْ كُمْ لَا يَعِدُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا قِيمَاتَهُنَّا هُنَّا مُسْلِمُو الْسَّلِيمَانَ“

ترجمہ: ”آپ کے رب کی قسم! یہ (لاکھ ایمان کا دعویٰ کریں مگر یہ اس وقت تک) مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ یہ آپ کو آپ کے جھگڑوں میں (دل سے) حکم تسلیم نہ کر لیں اور پھر آپ کے فیصلے پر دل میں تنگی بھی محسوس نہ کریں اور اسے پوری طرح سے تسلیم کر لیں۔“

(الناء: 65)

۲- معلم کتاب و حکمت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا إِنَّ أَنْفُسَهُمْ يَشْتُرُونَ عَلَيْهِمْ أَثْيَرَهُ وَلَيُذْكَرُ كُلُّهُمْ وَيُعَلَّمُهُمُ الْكِتَابُ وَالْحِكْمَةُ“

ترجمہ: ”اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان میں انہی میں سے ایک عظیم رسول مسجوب ث فرمایا، جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تذکیرہ فرماتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، (آل عمران: 164)۔“

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی چار خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

(۱) آیاتِ الہیہ کی تلاوت۔

(۲) تزکیہ نفوس: یعنی افراد انسانی کے باطن اور قلوب واذہان کو پاک و صاف کرنا تاکہ ان کے دل و دماغ باطل عقائد اور فاسد خیالات و نظریات کی آلاش سے پاک و صاف ہو جائیں اور تعلیماتِ نبوت کے نور کا عکس ان پر پڑ سکے، اسی کو تربیتِ نبوی یا طریقت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

(۳) تعلیم کتاب: اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کا کام محض آیات کو پڑھ کر سنانا نہیں، بلکہ ان کے معانی، مطالب و مفہوم کو بھی بیان کرنا ہے تاکہ اس کے پیغامِ ہدایت کو سمجھا جاسکے۔

(۴) تعلیم حکمت: بعض مفسرین نے حکمت سے مراد ”حدیث و سنت“ کو لیا ہے، یعنی اسلام کی تعلیمات صرف قرآن اور کلامِ الہی پر ہی مشتمل نہیں ہیں، بلکہ حدیث بھی اس میں شامل ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”أَلَا إِنَّ أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ“

ترجمہ: ”سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کی مثل، اس کے ساتھ ہے، (مندرجہ: 17174)۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیضِ نبوت سے مستفید ہونا چاہتا ہے، اسے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث سے بھی اکتساب فیض کرنا ہو گا، کیونکہ حدیث رسول ہی حکمت نبوت کا آئینہ ہے۔

ایمان بالرسول کے تقاضے:

اسلامی عقائد و ایمانیات میں ”ایمان بالرسول“ نہایت اہم ہے، چنانچہ رسالت پر ایمان کے بغیر ذات باری تعالیٰ اور اس کی وحدانیت پر ایمان بھی مقبول نہیں ہے، کیونکہ ”ایمان بالرسول“ اللہ کی معرفت کا اور تمام معتقدات کو ماننے اور جانے کا ذریعہ اور واسطہ ہے۔

چنانچہ علم الکلام میں اسلام کی مختصر ترین اور جامع تعریف یہ کی گئی ہے: ”رسول اور

جو کچھ رسول لے کر آئے، ان سب پر ایمان لانے کا نام اسلام ہے، یعنی رسول اور تعلیمات رسول کو مان لیا ہی اسلام ہے۔ کیونکہ ”مَاجَاهَ بِهِ الرَّسُولُ“ یا تعلیمات رسول میں توحید ہے لے کر آخرت تک تمام عقائد، نماز سے حج تک تمام عبادات اور دین کی تمام تفصیلات و تجزیات خود بخود رسالت پر ایمان اور رسول کے ساتھ تعلق اور وابعثی اور رسول کے مقام کو سمجھا جتنا ہم ہے، اتنا ہی مسئلہ تازک بھی ہے، کیونکہ اگر مقام رسالت میں ادنیٰ سی بھی گستاخی کر لی تو عمر بھر کے اعمال چلے گئے، بقول شاعر:

ادب گائیست زیر آسمان از عرش تازک تر
نفس گم کر دہی آید جنید د بایزید این جا

اگر مقامِ نبوت کو الوہیت کے ساتھ ملا دیا تو شرک کا خطرہ ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے کہ یہود نے حضرت عزریٰ علیہ السلام کو اور انصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے دیا، اس لیے ضروری ہے کہ ذاتِ رسول سے اپنے تعلق کو قرآن و حدیث کی روشنی میں استوار کیا جائے اور جس قدر ممکن ہو رسول سے اپنے رشتہ غلامی و جان ثاری و جان ساری کو مسلکم کیا جائے۔

۱۔ محبت رسول:

رسول اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق اور نسبت کی بنیاد ”محبت“ ہے اور یہی ایمان کی کسوئی اور معیار ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ ذَالِكُمْ وَأَلِدِهِ وَأَلِدِهِ وَالنَّاسُ أَجْمَعُونَ“۔

ترجمہ: ”تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا تو قنیکہ وہ مجھے اپنے والدین اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ کہجئے، (صحیح البخاری: 15)۔“

بعض لوگوں نے اس حدیث پاک کے معنی میں لیے ہیں کہ ”مطلق ایمان“ کی نہیں بلکہ ”کمال ایمان“ کی نفی ہے، یعنی مومن کامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس حدیث میں محبت رسول کو مدارِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔ لہذا جس درجے کی رسول اکرم ﷺ سے محبت ہو

گی، اسی درجے کا ایمان بھی اسے نصیب ہو گا۔ اگر محبت رسول کامل ہے تو مرتبہ ایمان بھی کامل ہے، محبت رسول میں کچھ کمی ہے تو ایمان میں بھی کمی ہو گی اور اگر خدا نخواستہ محبت رسول بالکل نہیں ہے تو پھر نعمت ایمان بھی میسر نہیں ہو سکتی اور محبت کا محض زبانی دعویٰ ہی کافی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں اور معیار پر پورا اتنا بھی ضروری ہے۔

۲۔ اتباع و اطاعت رسول:

اتباع کے معنی ہیں: پیچھے پیچھے چلنا، پیروی کرنا، نقش قدم پر چلنا اور اطاعت کے معنی ہیں: کہا مانا، فرمایا برداری کرنا، رسول اکرم ﷺ کی اتباع اور اطاعت دونوں لازمی ہیں بالفاظ دیگر محبت رسول کا تقاضا اور قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ رسول جو عمل کریں اسے بھی اپنا د اور جوار شاد فرمائیں اس پر بھی عمل کرو، یعنی آپ کا قول عمل دونوں کی تعمیل ہم پر لازم ہے، قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات اس پر شاہد ہیں:

(۱) "قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تَحْبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوهُنِّي يُحِبِّبُكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ"۔

ترجمہ: "اے رسول! کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میروی پیروی کرو اللہ خود تم سے محبت فرمائے گا اور تمہیں اپنا محبوب بنالے گا، (آل عمران: 32)"۔

(۲) "أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ"۔

ترجمہ: "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، (النساء: 59)"۔

(۳) "مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ"۔

ترجمہ: "اور جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، (النساء: 80)"۔

(۴) "إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ"۔

ترجمہ: "بے شک جو لوگ (اے رسول!) آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ (درحقیقت) اللہ کی بیعت کرتے ہیں، (الفتح: 10)"۔

(۵) "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ"۔

ترجمہ: ”ہم نے رسول اس لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“

(النام: 64)

حدیث پاک میں ہے:

”فَمَنْ أَطَاعَ مُحَمَّدًا فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ، وَمَنْ عَصَى مُحَمَّدًا فَقَدْ عَصَى اللَّهَ، وَمُحَمَّدٌ رَّفِيقٌ بَيْنَ النَّاسِ“۔

ترجمہ: ”جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اللہ کے جانے والوں اور نہ مانے والوں میں محمد ﷺ ہی وجہ امتیاز ہیں، (صحیح البخاری: 7281)۔“

انبیاء کرام کی خصوصیات

عصمت:

نبی کا ایک مرکزی وصف عصمت ہے، اسی وصف کی اساس پر شریعت کی عمارت قائم ہے، اگر نبوت سے عصمت کو الگ کر دیا جائے تو نبی کے لائے ہوئے دین کی کوئی ساکھ (Credibility) اور اعتماد قائم نہیں رہتا۔ علامہ سعد الدین تفتازانی نے عصمت کی جو تعریف کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

”گناہوں کے تمام مفاسد اور نیکیوں کے تمام فوائد پر نظر رکھنے کی وجہ سے نبی کو ایک ایسا ملکہ فاضلہ اور وصف رائخ حاصل ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ معصیت پر قدرت کے باوجود اس سے بچا رہتا ہے اور جوں جوں اس کے سینے پر وحی الہی کے انوار کی بارش ہوتی ہے اور اللہ سے اس کا رابطہ قوی رہتا ہے، اس وصف کا رسول بڑھتا چلا جاتا ہے۔“ علماء اسلام نے عصمت انبیاء پر جو عقلی و نقلي دلائل پیش کیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) نبی کے تمام افعال و اقوال دلیل شرعی ہوتے ہیں، اگر اس کے افعال و اقوال میں

محیت آجائے، تو ان سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

(۲) نبی کے صدق پر مجزہ دلیل ہوتا ہے، اگر نبی معاذ اللہ! جھوٹ بولے تو مجزہ سے اعتماد ساقط ہو جائے گا۔

(۳) اگر فاسق ہو تو اس کی پیروی حرام ہو گی، حالانکہ امت پر نبی کی پیروی واجب ہے۔

(۴) قرآن مجید میں انبیاء کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(الف) ”كُلُّ قَوْنِ الصَّلِحِينَ“، ترجمہ: ”یہ سب نیک ہیں، (الانعام: 85)۔“

(ب) ”وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُضْطَفَينَ إِلَّا خَيَارٌ“

ترجمہ: ”یہ ہمارے نزدیک اخیار اور پسندیدہ ہیں، (ص: 47)۔“

(۵) شیطان نے بھی خدا کے سامنے اعتراف کیا کہ وہ انبیاء کو گمراہ نہ کر سکے گا:

”قَالَ فَيَعْزِزُنِي لَأَغْوِيَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٦﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصُونَ ﴿٧﴾“۔

ترجمہ: ”میں ان سب کو گمراہ کروں گا مگر تیرے منتخب بندے میرے دام تزویر میں نہیں آئیں گے، (ص: 82-83)۔“

(۶) انبیاء فتن سے پاک ہوتے ہیں، ان کی گواہی کا قبول کرنا واجب ہے، کیونکہ وہ اللہ کی ذات پر گواہ ہوتے ہیں۔

(۷) انبیاء کرام فرشتوں سے افضل ہوتے ہیں اور جب فرشتے معصوم ہیں تو انبیاء کی عصمت بدرجہ کمال ثابت ہو گی۔

بعثت سے پہلے اور بعد میں نبی سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا، نہ کبیرہ، نہ صغیرہ، نہ سہوا، نہ عمداً۔ البته نیان اور اجتہادی خطاب نبی سے ممکن ہے، قرآن میں جن زلات انبیاء کا ذکر ہے، وہ سب اسی قبل سے ہیں اور انبیاء کا ان پر استغفار کرنا محض ان کی تواضع اور انکسار ہے۔

۲۔ وہبیت:

منصب نبوت ایک (Trusteeship) ہے، ایک عہد ہے، ایک انتہائی اہم

ذمہ داری ہے اور ایک اعزاز ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے چھے چاتا ہے منتخب فرماتا ہے، یہ ایک وہی (Gifted) نعمت ہے، ایک عطا یہ الہی ہے، یہ اکسلبی (Acquired) چیز نہیں جسے کسب و کیان، ریاضت، جدوجہد یا علم و فضل کی بنیاد پر حاصل کیا جاسکتا ہو یا جس کے استحقاق اور حصول کا دعویٰ کیا جاسکتا ہو۔ اگرچہ یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہر نبی اپنے امیتیوں اور تمام انسانوں سے فضل و کمال، علم و عمل، شرف اور بزرگی میں سب سے بڑھ کر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ بِرِسَالَتِهِ“

ترجمہ: ”اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کے عطا کرے اور منصبِ نبوت تفویض کرے۔“

(الانعام: 124)

یہ اس کا اپنا انتخاب اور چناؤ ہے، ظاہر ہے اپنے بندوں کی صلاحیتوں کو وہی سب سے بہتر جانتا ہے۔ نبوت اور رسالت کے علاوہ باقی تمام کمالات کبی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کسب کمال کے لیے اللہ کی توفیق کا شامل ہوتا ضروری ہے، ورنہ ایسا علم و فضل کہ توفیق ایزدی، سایہ رحمت خداوندی اور فیضِ نبوی جس کے شامل نہ ہو، بعض اوقات گمراہی کا باعث بھی بن جاتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

”أَصْلَهُ اللَّهُ عَلَى عِلْمٍ“، ترجمہ: ”اس کے علم کے باوجوداً اللہ نے اسے گمراہ کر دیا۔“

(الجاثیہ: 23)

۳۔ بشریت:

اللہ تعالیٰ نے نبی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ان ہی میں سے نفوس قدیسیہ کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب فرمایا، اس کی حکمتیں جو ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ چونکہ نبی اپنی امت کے لیے اسوہ اور نمونہ عمل ہوتا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ ”صاحب اسوہ“ کا تعلق بھی اسی نوع سے ہو، جس کے لیے وہ ہادی بن کر آیا ہے تاکہ کوئی

امتی یہ عذر نہ پیش کر سکے کہ نبی کی تعلیمات تو بہت اعلیٰ وارفع ہیں، لیکن ان پر عمل کرنا طاقت بشری سے باہر ہے۔

۲۔ ہر فرد کو اپنی نوع کے ساتھ انس اور الافت ہوتی ہے، جب کہ دوسری نوع کے ساتھ اجنبیت و حشمت سی محسوس ہوتی ہے، اگر نبی کا تعلق جن یا ملائک کی نوع سے ہوتا تو انسان اس سے اتنا قرب محسوس نہ کرتے، اسی لیے قرآن نے فرمایا:

”لَقَدْ جَاءَكُمْ رَّسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ
رَّءُوفٌ بِالْمُنْكَرِ“۔

ترجمہ: ”تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آیا، تمہارا تکلیف میں پڑنا اس پر گراں گزرتا ہے اور مومنوں کے ساتھ تو نہایت ہی شفیق اور مہربان ہے، (التوبہ: 128)۔“

۳۔ قرآن نے یہ بھی بتلا دیا کہ بنی نوع انس سے نہ ہوتے بلکہ فرشتوں میں سے ہوتے تو دو صورتوں میں سے ایک ضرور ہوتی، اگر وہ بنی اپنی اصل ملکوتی شکل میں آتا تو کسی کو نظر ہی نہ آتا، پھر اس سے انسان فیض کیسے حاصل کرتے، دوسری صورت یہ ممکن تھی کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے تو فرشتہ ہوتا، لیکن لوگوں کے درمیان بشری صورت اختیار کر کے آتا، اس صورت میں وہ پھر شہبے میں بتلا ہو جاتے کہ جو شخص صورتا ہم جیسا بشر ہے، اسے نبی کیسے مان لیں، چنانچہ فرمایا:

”وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَّبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلِيسُونَ“۔

ترجمہ: ”اور اگر ہم اس (نبی) کو فرشتہ بنانا کرنا زل کرتے تو لامحالہ اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور ہم انہیں اسی شہبے میں ڈال دیتے جس میں اب بتلا ہیں، (الانعام: 9)۔“

الہذا کفار و منکر یعنی نبوت فرشتے کی اس بشری صورت کو اس کی اصل حقیقت سمجھ کر اس پر وہی اعتراضات کرتے جوانہوں نے ہر ”نبی بشر“ پر مختلف ادوار میں کیے جیسے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا:

”وَقَالُوا إِمَّا هُنَّ الْرَّسُولُ يَا كُلُّ الظَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ“۔

ترجمہ: ”یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا بھی لھاتا ہے اور بازاروں میں چلنا پھرتا بھی ہے۔“

(القرآن: 7)

۲۔ قرآن نے جہاں یہ بنایا کہ نبی بشر ہیں وہاں عام انسان اور مقام نبوت میں فرق کو بھی واضح فرمادیا:

”قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُؤْتُونِي الْحُكْمُ إِنَّمَا إِلَهُكُمُ إِلَهٌ وَاحِدٌ“

ترجمہ: ”(اے حبیب! کافروں سے) فرمادیجئے کہ (میں اللہ نہ ہونے میں) تم جیسا بشر ہوں (پس فرق یہ ہے کہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ (میرا اور) تمہارا معبود ایک ہے، (سورۃ الکھف: 110)“

اسی طرح حدیث میں حضور نے صحابہ کرام کو صوم و صالح (افطار کیے بغیر مسلسل روزہ رکھنے) کی ممانعت کے موقع پر فرمایا:

”أَيُّكُمْ مُشْلِمٌ إِنِّي أَبِيَتُ يُطِعِّمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي“

ترجمہ: ”تم میں سے کون میری مثل ہے میں اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی، (بخاری: 7242)“

اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا: ”إِنِّي لَسْتُ كَهْمَيْتَكُمْ“، ترجمہ: ”میں تم جیسا نہیں ہوں، (بخاری: 2360)“

الہذا معلوم ہوا کہ ”إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، (الکھف: 110)“ میں مماثل صرف نوع میں ہے اور عدم الہویت میں ہے۔ علم و عمل، فضل و کمال اور شرف و مجد میں نہیں ہے اور نہ کوئی اس کا تصور کر سکتا ہے، امتی کی سو برس کی نمازیں نبی کے ایک سجدے کی عظمت کے مساوی نہیں ہو سکتیں۔

۲۔ تعلیمات منجانب اللہ:

قرآن نے یہ بھی فرمایا:

”وَمَا يُطِقُ عَنِ الْهَوَى ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُؤْتَ لِهِ ۚ“

ترجمہ: "اور وہ اپنی خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کہتے، وہ تو صرف وہی بات کہتے ہیں جس کی انھیں وہی کی جاتی ہے، (النجم: 3-4)"۔

یعنی زبان مصطفیٰ ﷺ کی ہوتی ہے اور کلام خدا کا ہوتا ہے۔ کبھی الفاظ اور معانی دونوں اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں جنہیں ہم ”وَحْيٌ مُّتَلَوٌ“ یا قرآن کہتے ہیں اور کبھی معانی اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں اسے اصطلاح میں ”وَحْيٌ غَيْرٌ مُّتَلَوٌ“ یا حدیث کہتے ہیں، بہر حال ان کا اللہ سے خصوصی رابطہ اور تعلق ہوتا ہے اور ان کا کام اللہ کے پیغام ہدایت کو بندوں تک پہنچانا ہے۔

ختم نبوت

پاکستان کی تاریخ میں ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کا دن تاریخی اہمیت کا حامل ہے، اس دن پاکستان کی قومی اسمبلی نے پوری قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا اور اب وہ آئینی طور پر مسلمانوں سے الگ قوم ہیں اور دیگر غیر مسلموں کی طرح ایک غیر مسلم اقلیتی فرقہ ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ”ختم نبوت“ کے مفہوم کی مختصر اوضاحت کر دی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جس قدر چیزیں پیدا فرمائی ہیں، ان کو تدبیج اپنے کمال طبعی تک پہنچایا ہے، جب تک کوئی چیزاپنے کمال طبعی تک نہیں پہنچتی، اس میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح وہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے منتها کے کمال تک جا پہنچتی ہے۔

یہی قانونِ قدرت نظامِ شریعت اور سلسلہ نبوت و رسالت میں جاری و ساری رہا۔ شرائع، احکام الہی اور نبوت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور ارتقائی منازل طے کرتا ہوا سید الانبیاء ختم المرسلین محمد رسول اللہ تک پہنچ کر اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ رسالت نبوت اور شریعت کی تمام عظمتیں آپ پر ختم ہو گئیں۔ انبیاء سابقین علیہم السلام کی شریعتیں اور سیرتیں زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط نہ تھیں، مثلاً عیسیٰ علیہ السلام نے تجدی کی زندگی گزاری اور ازاد دو اجی زندگی کے لیے ان کی سیرت میں کوئی نمونہ نہیں، سلیمان علیہ السلام نے شاہی زندگی گزاری اور فقر کے لیے ان کی زندگی میں کوئی اسوہ نہیں، اسی طرح سابقہ شریعتوں میں کامل بُنی کی ضرورت تھی، جس کی سیرت میں انسان کی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے ہدایت ہو، قیامت تک پیش آنے والے حالات اور مسائل کے لیے رہنمائی اور حل موجود ہو، چنانچہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”آلیوْمَا أَكْلَمْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتَمَّتُ عَلَيْكُمْ بِعَهْدِي“ -

ترجمہ: ”آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا، (المائدہ: 3)۔“

قرآن نے اس آیت میں واشگاف الفاظ میں اعلان فرمادیا کہ دین مکمل ہو گی ہے اور وہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جو ہدایت دینا تھیں وہ خاتم النبیین کے ذریعے دے دی گئیں، اب اس میں مزید گنجائش نہیں۔

جب تک سلسلہ نبوت و رسالت جاری رہا، ایک نبی آتا اور اللہ کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی امت تک پہنچاتا، پھر دوسرا نبی آتا اور اس نظام اخلاق اور احکام شریعت کی تمجیل کرتا اور سلسلہ رشد و ہدایت کو آگے بڑھاتا۔ بعض انبیا اور سل علیہم السلام اصحاب شریعت تھے اور بعض سابق نبی کی شریعت کی تجدید کے لیے یا اپنے ہی دور کے صاحب شریعت نبی کی معاونت و رفاقت کے لیے تشریف لائے۔ پہلے نبیوں کی زندگی اور سیرت میں حیاتِ انسانی اور نظام اخلاق کا کوئی حصہ رہ جاتا تو اسے پورا کرنے کے لیے دوسرا نبی آتا، مگر پھر بھی ایسے نبی کی ضرورت باقی تھی جو آکر اخلاقیات، معيشت، معاشرت، سیاست حتیٰ کہ زندگی کے تمام شعبوں کے لیے سلسلہ رشد و ہدایت کو مکمل کر دے تاکہ ادھورے اخلاق پورے ہو جائیں، دین و دنیا کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ چنانچہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ علیہ السلام تشریف لائے اور ایسا جامع اور کامل نظام پیش کیا کہ جس میں ایک عالم سے لے کر عابد تک، سپاہی سے لے کر پسالار تک اور تاجر سے لے کر قاضی تک سب کے لیے ہدایت ہے۔ آپ کی آمد سے پہلے انسانی اخلاق کے جوش بے ناتمام تھے، وہ تمام اور کامل ہو گئے، اسی لیے آپ نے فرمایا:

”بِعَثْتُ لِأَتَّبِعَمْ صَالِحَمُ الْأَخْلَاقِ“

ترجمہ: ”میں صالح اخلاق کی تمجیل کے لیے بھیجا گیا ہوں، (منداحمد: 8952)۔“

پہلے انبیاء مخصوص قوموں کی ہدایت کے لیے معموت ہوتے تھے، اس وقت اور اس زمانے میں حکمت خداوندی کا تقاضا بھی تھا۔ آخر کار رحمت خداوندی نے تقاضا کیا کہ تمام انسانیت کو اپنی آغوش میں لے اور ایک ایسا نبی بھیج کر جس کی شریعت میں رنگِ نسل، خاندان اور قبیلہ، خطہ و ملک اور زبان و بیان کی کوئی قید نہ ہو، جس کا پیغام ہدایتِ قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے ہو اور جس کے بعد کسی بھی قبیلے، قوم یا خاندان کے لیے کسی ہادی کا ضرورت باقی نہ رہے، چنانچہ آپ تحریف لائے اور اعلان فرمایا:

”قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا“

ترجمہ: ”اے لوگو! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، (الاعراف: 158)“
”وَمَا أَنْتَ سَلِينَكَ إِلَّا كَافَةً لِلنَّاسِ“

ترجمہ: ”اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے رسول بن کر بھیجا ہے، (سما: 28)“
”لہذا اگر کوئی شخص یا فرقہ آپ کے بعد کسی شخص کی نبوت کو جائز سمجھتا ہے، تو وہ قرآن کی ان آیات کا منکر قرار پائے گا اور قرآن کا منکر صریح کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء سابقین پر جتنی کتابیں بھیجیں، ان میں سے کسی کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا، چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بعض کا توانام و نشان بھی باقی نہ رہا اور جو رہ گئیں وہ بھی تحریف سے نجٹ نہ سکیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل فرمایا تو اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا، نزول قرآن کو ساڑھے چودہ صدیاں بیت گئیں، مگر آج تک ایک حرف اور ایک لفظ کا بھی روبدل نہ ہوا، یہ قرآن اور صاحب قرآن کا جیتا جا گتا مجھہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إِنَّا هُنَّ نَزَّلْنَا الِّذِيْ كُرَأْ إِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ“

ترجمہ: ”ہم ہی نے ذکر (قرآن) اُتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں،“

(الحجر: 9)

ساتھ ہی یہ اعلان بھی فرمادیا کہ قرآن صرف اپنے زمانہ نزول کے لوگوں کے لیے ہی پیغام ہدایت نہیں، بلکہ قیامت تک سب انسانوں کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے:

”وَأُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّ الْقُرْآنَ لِأُنْذِرَ كُمْبِهِ وَمَنْ يَدْعُ“ -

ترجمہ: ”مجھ پر یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمھیں (یعنی عہد نبوت کے لوگ) اور (قیامت تک) ہر اس شخص کو ڈراوں جس تک یہ پیغام پہنچے۔“

(الانعام: 19)

نبی کریم ﷺ سے پہلے انبیاء کرام کسی مخصوص علاقے کے لیے ہوتے تھے اور انہی لوگوں کی ہدایت اس نبی کے فریضہ نبوت میں شامل تھی۔ اللہ کی حکمت نے چاہا کہ ایک ایسا نبی آئے، اس کا مشن ملکوں اور علاقوں کی حدود و قیود سے ماوراء ہو، اس کا پیغام سب کے لیے ہو اور اس کے سایہ رحمت میں ہر ایک کو پناہ مل سکے۔ چنانچہ بالآخر ختم المرسلین ﷺ سے تشریف لائے اور آپ کی نبوت عامہ اور کاملہ کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا:

(۱) ”وَمَا أَنْزَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ -

ترجمہ: ”اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، (الانبیاء: 107)۔“

(۲) ”تَبَرَّكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا“ -

ترجمہ: ”بڑی برکت والا ہے وہ رب جس نے اپنے بندہ خاص پر فرقان (قرآن) اتنا تاکہ وہ اس کے ذریعے تمام جہانوں کو (اللہ کے عذاب سے) ڈرائے، (الفرقان: 1)۔“

پھر واضح طور پر اعلان فرمادیا: ”یہ نبی اب آخری نبی ہے، اس کے بعد کوئی اور نبی یا رسول (تشريعی یا غیر تشريعی، ظلی یا بروزی، اصلی یا تبعی) نہیں آئے گا،“ چنانچہ فرمایا:

”مَا كَانَ مُحَمَّدًا أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّنَ“ -

ترجمہ: ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں، (الاحزاب: 40)۔“

مرزا غلام احمد قادر یانی نے دھوکا ذینے کے لیے لفظ ”خاتم“ کی یہ تفسیر کی کہ اس کے معنی مہر کے ہیں، لہذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کی مہر ہیں، آپ جس پر مہر لگادیں وہ نبی بن جاتا

ہے اور مرزا پر بھی بقول ان کے آپ نے مہر لگادی، اس لیے وہ نبی ہوئے۔

جو اباً گزارش ہے: "خَاتَمُ النَّبِيِّنَ" کے معنی ہیں: سلسلہ نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہو سکتا، ورنہ نبی بنانا حضور کا کام نہیں، اللہ کا کام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أَللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ إِرْسَالَتَهُ"۔

ترجمہ: "اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کسے رسول بنائے اور امانت نبوت و رسالت کے تفویض کرے، (الانعام: 124)"۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا يَئِي بَعْدِي"۔

ترجمہ: "میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، (صحیح البخاری: 3455)"۔

ایک حدیث میں فرمایا: "أَنْبِياءُ كَرَامٌ مِّنْ مِنْ مِثَلِي هُوَ، جِئِيْسَ إِيْكَنْ خَصْ نَى مَكَانَ بَنَيَا، اسْ كَوْكَمْلَ كَيَا مَگَرَّاً سِ مِنْ اِيْكَ اِيْنَثَ كَيِّ جَلَّهَ چَحْوَذَ دِي، تو اِيْكَ آدَمِي اسْ مَكَانَ مِنْ دَاخِلَ ہوا اور کہا: کیا ہی اچھا مکان ہے سوائے اس ایینٹ کی جگہ کے، تو میں وہی ایینٹ ہوں "خُتَمٌ بِالْأَنْبِيَاءُ" مجھ پر سلسلہ نبوت ختم کر دیا گیا ہے، (شعب الایمان: 1405)، یعنی نبوت و رسالت کی عمارت میری ذات سے کامل ہو گئی، میری ذات پر سلسلہ نبوت ختم ہو گیا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔



آخرت

عقیدہ آخرت اسلام کے بنیادی اور اہم ترین عقائد میں سے ایک ہے، یوں کہہ لیجئے کہ ایمانیات، عبادات اور اخلاقیات کی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے، ان میں سے ایک مرکزی ستون ”ایمان بالآخرۃ“ ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اس بات پر کامل یقین رکھنا کہ یہ ساری کائنات ایک دن فنا ہو جائے گی اور تمام انسان مرنے کے بعد دوبارہ اللہ کی حکومت سے جی اٹھیں گے، پھر اللہ کی عدالت میں ان تمام اعمال کا حساب و کتاب اور باز پرس (Accountability) ہو گی جو انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں کیے ہوں گے، پھر ان کے لیے جنت یا جہنم کی صورت میں جزا یا سزا کے فیصلے کا نفاذ ہو گا۔ آخرت کی اسی مسولیت، محابے، جوابدی اور جزا اور ایمان رکھنے کا نام عقیدہ آخرت ہے۔ اسلام کی رو سے یہ دنیا دارالعمل ہے اور آخرت دارالجزاء ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہاں انسان عمل کا جیسا نجبوئے گا، آخرت میں جزا کے طور پر ویسا ہی پھل پائے گا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

”وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهُ الْحَيَاةُ الْمُؤْكَلُونَ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ“ -

ترجمہ: ”اور بے شک آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے، اگر وہ جانتے، (العنکبوت: 64)“ - قرآن مجید میں آخرت کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے، قرآن نے آخرت کا ذکر مختلف ناموں کے ساتھ کیا ہے، جن سے درحقیقت اس کی مختلف صفات اور کیفیات کا اظہار ہوتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

یوْمُ الدِّين: بد لے کا دن، جزا و سزا کا دن۔

یوْمُ الْبَعْث: مرنے کے بعد دور بارہ جی اٹھنے کا دن

یوْمُ الْحِشْرَة: (لوگوں کے) جمع کرنے کا دن، اسی لیے میدان قیامت کو محسّہ (جمع ہونے کی جگہ) بھی کہتے ہیں۔

يَوْمُ الْحِسْبَرِ:
يَوْمُ الْقِيَامَةِ:

مُرْدُولُوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا دن، اسے يَوْمُ النُّشْأَهِ کہتے ہیں۔
قبوں سے اٹھنے کا دن، موت کے بعد دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہونا، ایسا دن
جس کا قائم ہونا محقق ہے۔

الْقَارِعَةُ: دل ہلا دینے والی کڑک، اس سے مراد ہے: ”وقوع قیامت کے وقت
جو دل ہلا دینے والی آوازیں پیدا ہوں گی، جب اجرام فلکی آپس میں نکرا کر ریزہ ریزہ
ہو جائیں گے، جب فلک بوس پہاڑ ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، اس وقت جوزہ گداز
گزگڑا ہٹ اور روح فرسا کڑک پیدا ہو گی، اس کا اندازہ لگانا ممکن ہے۔“

يَوْمُ الْبِيْزَانُ: جس دن بندوں کے اعمال خیر و شر کا موازنہ کرنے کے لیے اللہ کا
میزان عدل قائم ہو گا، جس کی ماہیت و کیفیت کا اس دنیا میں تعین مشکل ہے، بس اس پر
ایمان لانا کافی ہے۔

سورۃ الحاقة، سورۃ التغابن اور دیگر سورتوں میں قیامت قائم ہونے، اس کائنات کے
زیر دبر اور ریزہ ریزہ ہونے، صور پھونکے جانے، مُرْدُولوں کے دوبارہ زندہ کیے جانے، حشر
کے میدان میں جمع ہونے، صحیفہ اعمال بندوں کے حوالے کرنے، میزان عمل اور جزا و سزا
کے فاذ کا ذکر ہے۔

آخرت کے بارے میں باطل نظریات کا عقلی تجزیہ

ا- مادہ پرستوں یاد ہر یوں کا نقطہ نظر:

یوں تو تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب میں کسی نہ کسی طور پر آخرت کا تصور موجود ہے
لیکن مادہ پرستوں اور دہریوں کا ایک ایسا مختصر سارگ روہ ہر زمانے میں موجود رہا ہے جو آخرت
کا انکر ہے، ان کی تمام تر علمی، عملی اور فکری ارتقاء کی آخری منزل فقط اور فقط یہی دنیا ہے، ان
کا مذہب بقول شخصے یہی ہے: ”بابر بیش کوش کے عالم دوبارہ نیست“۔

قرآن مجید میں ان لوگوں کے نظریات کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

(۱) ”إِنْ هُنَّ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ“۔

ترجمہ: ”ہمارے لیے تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے، ہم (اسی دنیا میں) مریں گے اور جنہیں گے اور ہمیں مرکر دوبارہ زندہ نہیں ہونا ہے، (المومنون: 37)۔“

(۲) ”وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الْدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذِلِّكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُونَ“۔

ترجمہ: ”(دہریے) کہتے ہیں: سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ ہماری دنیاوی زندگی ہی سب کچھ ہے، ہم یہیں مرتے ہیں اور یہی جیتے ہیں اور ہمیں زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے اور انہیں اس کی حقیقت کا علم نہیں ہے (بلکہ) وہ تمحض گمان و قیاس پر بات کرتے ہیں، (الجاشیہ: 24)۔“

منکرین آخرت کا رد اور قرآنی دلائل

۱۔ آخرت تقاضائے فطرت:

انکارِ آخرت کا کوئی عقلی جواز نہیں ہے اور یہ موقف سراسر غیر منطقی ہے، کیونکہ ہم تاریخ انسانی کی ابتداء سے لے کر اب تک یہ دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ انسانی سوسائٹی میں بعض افراد ظالم ہیں اور بعض مظلوم، بعض جابر ہیں بعض مجبور، بعض دوسروں کے حقوق غصب مظلومی، مجددی اور ناداری کی مجسم تصویر بنے اپنے حقوق کو سلب ہوتے ہوئے اور اپنے آشیانے کو جلتے ہوئے دیکھتے ہیں، مگر ہزار خواہش انتقام اور تمدنائے عدل و انصاف کے باوجود کچھ کرنہیں پاتے۔ آج کے بعض نام نہاد مہذب معاشروں میں اگر عدل نام کی کوئی چیز سر بازار ہوتا رہتا ہے۔

اس لیے عقل انسانی بڑی شدت سے یہ تقاضا کرتی ہے اور فطرت کا یہ مطالبہ ہے کہ کوئی تو ایسی جگہ ہونی چاہیے، ایک دن لازماً ایسا آنا چاہیے اور کوئی عدالت ایسی بھی لگنی چاہیے جہاں ظالموں، غاصبوں، جابروں اور انسانی جان و مال اور عزت و عفت کے لیبروں

اور اپنے خالق و مالک اور مُنْعِم و مُرَبِّی کی خدائی کا انکار کر کے اپنی خدائی کا اعلان کرنے والوں کو قرار واقعی سزا ملے، جہاں کسی کامال و دولت اور کسی کا جاہ و منصب (Status) عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو، جہاں عدل قبل فروخت نہ ہو، جہاں مظلوم، مجبور اور بے کس کو بن مانگے اور بلا قیمت انصاف ملے، جہاں ظالم کمزور ہو اور مظلوم ضعیف و توانا، جہاں آہِ مظلوم سے واقعی عرش پلتا ہوا دکھائی دے اور بے کس اور بے نوا کی فریاد سے ظالموں کے قصور و ایوان گرجائیں، کیونکہ اگر ایسا کبھی نہ ہو اور کہیں نہ ہو تو لازم آئے گا کہ فطرت ظالم ہے، تقدرت نے عدل کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت انصاف پسند ہے اور اس کے اصول مساوات پر مبنی ہیں۔

ظاہر فطرت میں اس کی جھلک آپ کو صاف نظر آئے گی، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ سورج کی روشنی اور حرارت کا فیض ایک غریب کی کثیا کو بھی اتنا ہی پہنچتا ہے جتنا کہ امیر کے محل کو، ہوا جب چلتی ہے، بارش جب برستی ہے، چاند اور ستارے جب نور افشاں ہوتے ہیں تو تقدرت کی فیاضی امیر و غریب میں، حاکم و مکوم میں اور چھوٹے اور بڑے میں تمیز نہیں کرتی، سب کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اگر انسان کے دل و دماغ سے آخرت کی جوابد ہی کا خوف نکل جائے تو پھر ظالم کے ظلم کی کوئی انتہا نہیں رہے گی، انسانیت پر حیوانیت اور درندگی کا راج ہو گا اور ”جس کی لاثمی، اُس کی بھینس“، مقدس اصول قرار پائے گا اور صرف طاقتور کو ہی جینے کا حق حاصل ہو گا، مجبوروں، بیکسوں، مظلوموں اور بے نواؤں کے لیے امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہے گی اور انسانیت پر اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

پس ہم کہتے ہیں کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ جہاں ہر سو عدل ہو گا اور یہی دن دراصل آخرت کا دن ہو گا اور جہاں منصب عدالت پر خالق کون و مکان کی ذات جلوہ افروز ہو گی، وہاں نہ دولت کی جھنکار کام آئے گی، نہ ناقص سفارش کا دور دورہ ہو گا اور نہ کسی کا اثر درسوخ چل سکے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ”وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجِزُّ نَفْسٌ عَنْ تَقْرِيسِ شَيْءًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُضَرُّونَ“ -

ترجمہ: ”اور ڈروں دن سے جب کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی کو معاوضہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد سکے گی، (البقرہ: 48)۔“

(۲) ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَتَقْرِيرُوا مِنَّا رَأْقَلُكُمْ قَنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا يَبْعُدُ فِيهِ وَلَا
خُلْلٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكُفَّارُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ“ -

ترجمہ: ”اے ایمان والو! جو کچھ (مال و متاع) ہم نے تم کو عطا کیا ہے، اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ (نیکیوں اور اجر و ثواب کی) خریدو فرودخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی، (البقرہ: 254)۔“

(۳) ”وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَمُمْلِأ
يُظْلَمُونَ“ -

ترجمہ: ”اور اس دن (کے انجام) سے ڈر جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، (البقرہ: 281)۔“

۲۔ منکرین آخرت کی غلط فہمی کا ازالہ:

منکرین آخرت کے عقیدے اور نقطہ نظر کی بنیاد ایک غلط مفروضے پر ہے اور وہ یہ کہ انسان جب ایک مرتبہ مرجائے گا، مرکر مٹی میں مل جائے گا تو اسے پھر کون زندہ کر سکتا ہے، اس کا دوبارہ جی اٹھنا اور زندہ ہونا ناممکن ہے، جب موت کے بعد زندگی ہی نہیں تو حساب و کتاب کیسا اور جزا اور سزا کیسی، قرآن نے ان کے زعم باطل کور دکرتے ہوئے فرمایا:

(۱) ”هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينَ قَنَ الدَّهْرُ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَذْكُورًا“ -

ترجمہ: ”یقیناً انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جب اس کا نام و نشان تک نہ تھا، (الدہر: 1)۔“

(۲) ”قَالَ مَنْ يُنْبِيُ الْعِظَامَ وَهِيَ رَاسِيْمٌ ۝ قُلْ يُنْبِيْهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوْلَ مَرَّةً“ -
ترجمہ: ”انہوں نے کہا: ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی، کہہ
دیجیے: وہی (اللہ انہیں دوبارہ) زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا“ -

(۳) ”كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَ كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَخْيَاكُمْ ثُمَّ يُمْبَتِّكُمْ ثُمَّ يُحْبِيْكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِمْ تُرْجَعُونَ“ -

ترجمہ: ”تم کیوں کر اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم منعدوم تھے، اس نے تمہیں وجود عطا کیا،
پھر وہی تمہارا رشتہ حیات سلب کر لے گا، پھر وہی تمہیں (دوبارہ) زندہ کرے گا، پھر تمہیں اسی
کی طرف پلٹ کر جانا ہے، (البقرہ: 28)“ -

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ”حیات بعد الموت“ کی ایک حسی مثال بھی دی گئی
ہے ارشاد ہوتا ہے:

(۴) ”وَ مِنْ أَيْتَهُ أَنْكَ تَرَى الْأَنْرَضَ خَائِسَةً فَإِذَا آتَيْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ
وَرَأَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لِمَنْ يُوْلِي إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ -

ترجمہ: ”اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں یہ بھی ہے: تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک اور بخرا
ہو جاتی ہے، پھر جب ہم اس پر بارش بر ساتے ہیں تو وہ جھومنے لگتی ہے اور کھل اٹھتی ہے،
بے شک وہ (قادر مطلق) جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا ہے، وہ مردہ انسانوں کو بھی زندہ
کرنے والا ہے، بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، (آلہ السجدہ: 39)“ -

مندرجہ بالا آیات میں قرآن نے جس حقیقت کی طرف بار بار متوجہ کیا ہے، وہ یہ
ہے کہ تم اس بارے میں ترد کر رہے ہو اور شے میں بنتا ہو کہ ایک مرتبہ موت آجائے تو
دوبارہ زندگی کیوں نہ ممکن ہے؟، لیکن تم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ ایک وقت تھا کہ تم
معدوم تھے، تمہارا نام و نشان تک نہ تھا، نہ تمہاری خاک تھی نہ راکھ، نہ وہ نطفہ آب جو تمہاری
اصل ہے، نہ تمہارا جسم اور نہ جان، پھر اس اللہ نے اپنی قدرت سے تمہیں وجود عطا کیا، تمہیں

عدم سے وجود میں لایا) (تمہیں حیات بخشی، تو وہی خدا اس بات پر بھی قادر ہے کہ مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دے، سو مشکل تو تمہارا نقش اول تھا کہ تم بے نام و نشان تھے اور جب وہ اس کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تو اب نقش ثانی اور حیات ثانی تو اس کی نسبت اس کے لیے بہت آسان ہے، کیونکہ اب تمہارا کچھ نشان تو باتی ہے، ہڈی ہے، خاک ہے، راکھ ہے، روح ہے وغیرہ، لہذا اس پر کیوں تعجب کرتے ہو، اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو خلق اول پر کرنا چاہیے۔

منکرین آخرت کا جزا و سزا کا نزالہ فلسفہ:

منکرین آخرت کہتے ہیں کہ انعقادِ جزا و سزا کے لیے آخرت پر ایمان لانے اور قیامت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے، ان کا ضمیر (Conscience) خود میزانِ عدل ہے، نیکی اور اچھائی پر انسان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے اور گناہ اور بدی پر اس میں چھپن، گھٹن اور کھنک سی محسوس ہوتی ہے، بس یہی اطمینانِ ضمیر اور سکونِ قلب و روح اس کی نیکی کی جزا ہے اور ضمیر کی بے چینی و بے قراری اور روح کا اضطراب اور قلب کی گھٹن اس کے گناہ کی سزا ہے، اس نقطہ نظر کے روی میں مندرجہ ذیل گزارشات پیش خدمت ہیں:

اول: یہ ایک باطل مفروضہ ہے، کیونکہ اگرچہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک حد تک ضمیر خیر و شر کی کسوٹی ہے، لیکن قلب کی کیفیات اور ضمیر کی واردات کو حقیقی جزا و سزا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیا انسانی عقل اس بات کو تسلیم کرے گی کہ بیسیوں قتل، ڈاکے، چوری، اور بدکاری کی وارداتوں پر محض ضمیر کی چھپن اور ذہنی اضطراب کافی سزا ہے، ہرگز نہیں، اس لیے حدیث کی رو سے ضمیر کا عرفانِ خیر و شر ایمان کی کسوٹی تو ہے، خیر و شر کی مکافات نہیں ہے۔

دوم: ضمیر کا عرفانِ خیر و شر بھی صرف اسی وقت تک ہے، جب تک کہ وہ فطرت سلیم پر قائم ہو، کیونکہ جب عقائدِ باطلہ، اعمالیں سائیہ، بدترین ماحول اور سوسائٹی کی وجہ سے خود ضمیر ہی بگڑ جائے، قلب میں شقاوت و قساوت آجائے، ذہن و دماغ مریض و مفلوج ہو جائیں، تو ضمیر برائی پر ندامت کرنے کی بجائے اس پر ناز کرنے لگتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں

ارشاد ہے: حضرت لوط علیہ السلام اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”أَيْنُكُمْ لَتَأْتُونَ إِلَيْجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ لَا تَأْتُونَ فِي نَادِيْكُمُ الْمُسْكِرِ“۔

ترجمہ: ”کیا تم ہی وہ نہیں ہو کہ مردوں سے بدغسلی کرتے ہو اور عام راستوں پر ڈاکے ڈالتے ہو اور اپنی مجلسوں میں کھلے بندوں گناہ اور فواحش کا ارتکاب کرتے ہو، (العنکبوت: 29)۔“

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مشرکین، کفار، منافقین، اہلِ فسق و فجور، ظالمین، منکرین اور جابرین عام طور پر اپنے طرز عمل پر مطمئن و مسرور نظر آتے ہیں، وہ اپنے موقف پر ندامت و شرمساری کی بجائے فخر و مبالغات کا اظہار کرتے ہیں، وہ اپنی برائی کو برائی، گناہ کو گناہ اور باطل کو باطل نہیں سمجھتے، بلکہ اسے اچھائی، نیکی اور حق گردانیت ہیں کیونکہ درحقیقت ان کے ضمیر مرچکے ہوتے ہیں، قرآن نے انہی کیفیات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”لَمْ قَسْتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذِلْكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهَا الْأَنْهَرُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشْقَقُ فِي خُرُوجٍ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشِيقَةِ اللَّهِ“۔

ترجمہ: ”ان کے دل پتھر کی مانند ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت، کیونکہ بعض پتھروں اور چٹانوں سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں، پانی کے چشمے اہل پڑتے ہیں (لیکن ان کے دلوں سے خیر کا چشمہ نہیں پھوتا)، ان میں سے بعض پھٹ پڑتے ہیں اور ان میں سے پانی نکل آتا ہے اور بعض خشیت الہی سے لرز کر گر پڑتے ہیں، (البقرہ: 74)۔“

۶۴: مشہور مقولہ ہے: ”النصاف کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ انصاف ہو رہا ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا محسوس ہو کہ انصاف ہو رہا ہے۔“ لہذا کسی مجرم کی قلبی ندامت و شرمساری یا احساس گناہ اس کے جرم کی سزا یا اس کا بدل نہیں قرار پاسکتا، جب تک کہ مظلوم یہ یکہنے لے، یقین نہ کر لے اور اسے محسوس نہ ہو کہ مجرم کو سزا دی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ انصاف برداگیا ہے، لہذا اس کے لیے خارجی، حصی اور عملی نظام انصاف کا وجود ضروری ہے (ان خود دنیا میں بھی نظام عدل کے قیام کی کیا ضرورت تھی۔ پس ضروری ہے کہ قدرت کی

طرف سے ایک دن ایسا مقرر ہو جب سراسر عدل و انصاف ہو اور یہی دن "یوم آخرت" اور "یوم الدین" ہے۔

۳۔ عقیدہ تناخ (آواگون):

ہندو مت کا نظریہ ہے کہ موت کا مطلب فنائے کلی نہیں ہے، موت سے جسم فنا ہو جاتا ہے مگر روح باتی رہتی ہے اور قلب بدلتا رہتا ہے، گویا یہ ایک تبدیلی جسم کا عمل ہے، پہلے جنم میں جس طرح کا عمل ہو گا، دوسرا جنم اُس کا مکافات عمل ہو گا، اگرچہ ذات کا ہے اور اعمال اچھے کیے ہیں تو اگلے جنم میں اس کی روح اعلیٰ ذات کے انسان میں حلول کر کے آئے گی اور اگر پہلے جنم میں اعمال بُرے کیے ہیں تو اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قائل کی روح شیر کے بدن میں اور چور کی روح چوہے کے بدن میں حلول کر کے آسکتی ہے، وغیرہ۔ یہ عقیدہ بھی عقل سليم کے لیے قابل قبول نہیں ہے اور فطرت سليم کے معیار پر پورا نہیں اُترتا، اس کی درج ذیل وجوہ ہیں:

(۱) جزا اوزرا کے لیے لازم ہے کہ جرم کو اس کے جرم و گناہ کا احساس اور محضن کو اس کی نیکی کا شعور ہو، اسے یہ چلتا یا گیا ہو کہ کس گناہ کی سرزش رہی ہے یا کس نیکی کی جز ایں رہی ہے، جبکہ تناخ یا آواگون کی رو سے انسان کو کچھ پستہ نہیں ہوتا کہ پچھلے جنم میں وہ کیا تھا اور موجودہ جنم میں اس کی روح کا ارتقاء ہے یا تنزل اور یہ کہ اس ارتقاء یا تنزل کا باعث اس کا کون سا عمل ہے۔

(۲) اور اک، تعلق اور نطق، نفس انسانی کی خصوصیات ہیں، تناخ یا آواگون کی رو سے انسان کی روح جانور میں حلول کر جائے یا جانور کی روح انسانی جسم میں حلول کر جائے تو وہ اس جسم کے مطابق خصوصیات بھی اختیار کر لیتا ہے۔ انسانی روح اگلے جنم میں جانور کے جسم میں حلول کر جائے تو وہ نفوس ناطقہ کے خواص سے محروم ہو جاتی ہے اور حیوان کی روح اگر انسان میں حلول کرے تو وہ نفوس ناطقہ کی خصوصیات اختیار کر لیتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان یا حیوان کی تمام تر خصوصیات اور امتیازات کا تعلق جسم سے ہے نہ کہ روح،

دماغ، عقل شعور اور نفس سے، حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ ایسا نہیں ہے، پس ثابت ہوا کہ عقیدہ تناخ عقلاءٰ ہی باطل اور حوال ہے۔

(۳) اگر بفرض حوال تناخ یعنی سلسلہ منتقلی ارواح اور تبدیلی اجسام کو تھوڑی دیر کے لیے درست بھی تسلیم کر لیا جائے، تو ظاہر ہے نہ اس کے نقطہ آغاز کا تعین کیا جاسکتا ہے اور نہ انہام کا، اسے ایک لامتناہی سلسلہ infinite تسلیم کرنا پڑے گا اور عقلاءٰ سلسلہ لامتناہی کا قائم رہنا حوال ہے۔

(۴) ہندو مت اور بدھ مت کے نظریہ کے مطابق تطہیر عمل اور عرفان کی ایک ایسی منزل بھی ہے جہاں پہنچ کر "مکتی" سے سلسلہ تبدیلی اجسام ختم ہو جاتا ہے اور یہ منزل ریاض یا گیان دھیان سے حاصل ہوتی ہے، لیکن سوال پھر بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ اس "مکتی" یا نجات کے بعد روح کی منزل اور مقام کہاں ہے، کیا ہے، اس کی کیفیات کیا ہیں، اس سوال پر "آوا گون" وائل بھی خاموش ہیں۔ جس عقیدے کی انتہا تشکیل و تردد، طلن و تھیمن اور غیر تلقینی انہام پر ہو، وہ ایمان کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

۵۔ یہود و نصاریٰ کا عقیدہ آخرت اور اس کا تجزیہ:

یہودیت اور نصرانیت دونوں الہامی مذاہب ہیں اور دونوں کو اللہ کی کتب اور انبیاء سے نسبت ہے، اس لیے انہیں اہل کتاب (People of the Book) کہا جاتا ہے، یہ دونوں مذاہب عقیدہ آخرت کو تسلیم کرتے ہیں، قیامت، جنت و جہنم اور جزا کے اصولی طور پر قائل تو ہیں، مگر تحریف اور اللہ کی کتابوں اور احکام میں من مانی تبدیلیوں کے نتیجے میں انہوں نے آخرت کے حقیقی تصور کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ ذیل میں ہم آیات قرآنی کی روشنی میں آخرت کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے عقائد کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) یہود و نصاریٰ دونوں اپنی اپنی جگہ پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ جنت کے اصل حق دار اور ٹھیکیدار صرف وہی ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَقَالُوا إِنَّمَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْأَمَانُ كَانَ هُؤُلَاءِ أَوْ نَصَارَىٰ"

ترجمہ: ”انہوں نے کہا: جنت میں ہرگز داخل نہیں ہو گا مگر صرف وہ جو یہودی ہو یا نصرانی،
(البقرہ: 111)۔“

(۲) یہودیوں کا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے کہ وہ ایک برتر قوم ہیں، اللہ کی محبوب قوم ہیں اور اللہ کی تمام نعمتوں، خواہ وہ خلافتِ ارضی ہو یا جنتِ اخروی، کے حق دار صرف اور صرف وہی ہیں، چنانچہ قرآن نے ان کے اس عقیدے کو جو دراصل زعم باطل ہے، ان الفاظ میں بیان فرمایا:

”وَقَالُوا إِنَّنَا تَسْسَنَا الْتَّابُرَ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةٍ قُلْ أَتَتَخْذِلُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدَهُ أَفَلَنْ يُعْلَفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ“۔

ترجمہ: ”اور انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ سوائے گفتی کے چند دنوں کے، آپ کہہ دیجیے: کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے، جس کی اللہ ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ کے متعلق وہ بات کہتے ہو، جس کا تمہیں علم نہیں ہے، (البقرہ: 80)۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا یہ مسلکہ عقیدہ رہا ہے کہ جنت کے حقدار صرف وہی ہیں اور اگر وہ جہنم میں ڈالے بھی گئے تو معمولی سزا کے بعد انہیں رہائی مل جائے گی، یہودیوں کے ایک فرقے کے مطابق درزخ میں ان کا زیادہ سے زیادہ عرصہ قیام چالیس دن ہو گا اور یہ اس مدت کے مساوی ہے جس میں ان کے آبا و اجداد نے بچھڑے کی پوچھا کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لیے طور پر گئے تھے اور اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو قوم کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا تھا، مگر بنی اسرائیل نے ان کی ایک نہ مانی اور سامری کے فریب میں آکر شرک میں مبتلا ہو گئے۔

۳۔ اس کے علاوہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب پر چڑھ کر سب کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے، ان کے نزدیک انسان پیدائشی گناہ گار ہے، مگر جب وہ گرجے میں چلا جاتا ہے تو بپسٹس (Baptism) کرنے کے بعد پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

اسلام ان تمام نظریات کو باطل قرار دیتا ہے، کیونکہ یہ نظریات مختص خوش ہنسی اور خود فریبی پر مبنی ہیں اور عقل انسانی کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ اسکے برعکس اسلامی عقیدہ آخرت زیادہ سیدھا اور سادا ہے اور عقل انسانی کے قریب تر ہے، اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) اسلام میں اللہ کے نزدیک شرافت اور فضیلت کا معیار نسلی اور نسبی تفاخر نہیں ہے، بلکہ انسان کا تقویٰ اور کردار ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْنَمُ“

ترجمہ: ”اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت و فضیلت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقدی اور پرہیزگار ہے، (الحجرات: 13)۔“

(۲) جنت اور تمام اخروی نعمتیں کسی خاص قوم کے لیے نہیں ہیں، بلکہ صرف ان افراد کے لیے ہیں، جو ایمان و عمل کے معیار پر پورا اُتریں، ارشاد فرمایا: ”أُعَدَّتُ لِلْمُتَّقِينَ“، ترجمہ: ”وہ (جنت) پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، (آل عمران: 132)۔“

لہذا کوئی مسلمان اس خوش ہنسی اور فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ وہ استحقاق کے بغیری جنت میں چلا جائے گا، چنانچہ قرآن نے جا بہ جا یہودیوں کو چیلنج بھی کیا ہے کہ اگر وہ بزم خویش جنت کے مالک و وارث ہونے کے دعوے میں سچے ہیں تو موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے تاکہ مرتبے ہی سید ہے جنت میں پہنچ جائیں، ارشاد فرمایا:

(۱) ”Qُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَسْبِحُوا الْمَوْتَ إِنْ كُنُتمْ صَدِيقِينَ“۔

ترجمہ: ”ان سے کہہ دیجیے: اگر آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر اللہ کے نزدیک تمہارے لئے ہے، تو تمہیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو۔“

(البقرة: 94)

(۲) ”Qُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ رَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أُولَيَاءُ اللَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَسْبِحُوا“

الْمَوْتَ إِنْ كُلُّمْ صَدِيقِينَ ” -

ترجمہ: ”کہہ دیجیے: اے یہودیو! اگر تم سمجھتے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے دوست ہو تو موت کی تمنا کرو، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو، (الجمعة: 6) ” -

پھر قرآن نے خود ہی حقیقی فیصلہ صادر فرمایا:

”وَلَا يَسْمُونَهُ أَبَدًا إِنَّا قَدْ مَاتُ أَيُّدِيْهِمْ وَاللَّهُ عَلِيْمٌ بِالظَّالِمِينَ ” -

ترجمہ: ”اور یہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے، ان اعمال کی (سزا کے خوف کی) بنا پر جوان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے، (البقرہ: 95، الجمعة: 7) ” -

(۳) اسلام عیسائیوں کے اس عقیدے کو بھی باطل قرار دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سب کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، اسلام کی رو سے ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے اور اس کی نیکی کی جزا یابدی کی سزا اسی کو ملے گی، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

(۱) ”فَمَنْ يَعْمَلْ مُثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مُثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا ۝ ” -

ترجمہ: ”جو ذرہ بھر نیکی کرے گا، وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ بھر برائی کرے گا، وہ بھی اسے دیکھ لے گا، (الزلزال: 7-8) ” -

(۲) ”أَلَا تَرَوْا زَرَّةً وَزَرَّا خَرَى ۝ وَأَنْ لَيْسَ لِإِنْسَانٍ إِلَّا مَاسَعِيٌ ۝ وَأَنَّ سَعْيَهُ سُوقٌ يُؤْدِيٌ ۝ مُمْبَشَّرٌ بِهِ الْجَزَاءُ الْأَلَّا وُفِيٌ ۝ ” -

ترجمہ: ”یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان وہی صلحہ پائے گا جو اس نے عمل کیا اور یہ کہ وہ جلد ہی اپنے عمل کا انجام دیکھ لے گا، پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، (النجم: 38-41) ” -

(۳) ”مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَنَقِيسْهُ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ” -

ترجمہ: ”اور جس نے نیک کام کیا تو اپنے ہی لیے کیا اور جس نے برائی کی تو اس کا اقبال اسی پر آئے گا، (حمد السجدہ: 46) ” -

(۲) ”لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا لَكَثَرَتْ“

ترجمہ: ”ہر انسان کو اس کی نیکی کی جزا ملے گی اور ہر انسان کو اس کی بُرائی کی سزا ملے گی، (البقرۃ: 286)۔“

ان آیات کی روشنی میں اسلام کے رہے بالکل واضح ہے جو تعلق پر منی (Rationalistic) ہے اور عام انسانی ذہن اور شعور (Common Sense) کے عین مطابق ہے۔ اسلام عمل کا درس دیتا ہے اور عمل کی بنیاد پر فلاح اور کامیابی کا دعویٰ کرتا ہے، صرف کسی کا بیٹھنا یا کسی نسب سے تعلق ہونا کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔

اسلام میں ”شفاعت“ کا تصور ضرور موجود ہے، لیکن عیسائیوں کے نظریہ کفارہ کی طرح نہیں ہے، بلکہ یہ ایک صورتِ احسان ہے جو عقولاً، اخلاقاً اور قانوناً ہر طرح سے جائز بلکہ مستحسن ہے اور وہ بھی اذنِ الہی پر موقوف ہے۔

۶۔ اعمال انسانی کا ریکارڈ:

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان جب مر گیا تو اس کے عمل کا ریکارڈ کس کے پاس محفوظ رہے گا اور کسی کے پاس ہزاروں یا لاکھوں سال بعد اس کا کیا ثبوت ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کو بھی دور فرمادیا ہے، فرمایا:

”إِذْ يَتَّقَنُ الْمُتَّلَقِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشَّمَاءِ قَعِيدُّ^{۱۴} مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ
لَاقِيبٌ عَتِيدُّ^{۱۵}“۔

ترجمہ: ”جب اس کے اعمال کو لے لیتے ہیں دو لینے والے (فرشتے ان میں سے) ایک داکیں جانب اور دوسرا بائیں جانب بیٹھا ہوتا ہے، انسان اپنی زبان سے جو بھی بات نکالتا ہے اس کے پاس ایک (نگہبان فرشتہ) لکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے، (ق: 17-18)۔“

اسی طرح ایک اور آیت میں ہے کہ جب آخرت میں انسان کا نامہ اعمال اس کے انہیں تمہارا جائے گا تو وہ اسے پڑھ کر حیرت و استجواب کے عالم میں کہے گا:

”لَوْ يَلْتَهَنَ أَمَّا لَهُ الْكِتَابُ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَهَا“۔

ترجمہ: ”ہائے افسوس! اس نامہ اعمال کو کیا ہوا اس نے نہ کوئی صیرہ گناہ چھوڑا ہے اور نہ کبیرہ مگر سب کا احاطہ کر لیا ہے، (الکھف: 49)، نیز سورہ یس میں ارشاد فرمایا:

”إِنَّمَا نُخْلِقُ الْجِنَّاتِ وَالْأَنْوَارَ مَاقْدَمُوا وَإِنَّهُمْ مُّكْلَفُونَ وَكُلُّ شَيْءٍ هُوَ أَخْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ“۔

ترجمہ: ”بے شک ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم ان کے وہ عمل لکھ رہے ہیں جو انہوں نے پہلے بھیج دیے اور وہ عمل (بھی) جو انہوں نے پیچھے چھوڑ دیے اور ہم نے ہر چیز کا احاطہ کر کے لوہ محفوظ میں شمار کر دیا ہے، (یس: 12)، مزید فرمایا:

”الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَعْوَاهِهِمْ وَنُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَنَشَهِدُ أَمْرَاجُهُمْ مِّنْا كَانُوا يَكْسِبُونَ“۔

ترجمہ: ”ہم آج ان (کفار) کے منہوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں ان کا مول کی گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے، (یس: 65)۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کا ہر عمل اگرچہ اللہ کے علم میں ہے، مگر سنت الہیہ اور ضابطہ شرعیہ کی تکمیل کے لیے باقاعدہ فرشتے اس پر مامور ہیں کہ انھیں لکھیں اور ریکارڈ کریں۔ باقی رہایہ سوال کہ اس قدر تی ریکارڈ کی کیفیت و ماہیت کیا ہے، اس کا اس دُنیا میں سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، بس ہمارا اس پر ایمان لانا ہی کافی ہے اور اب تو جدید سائنسی ایجادات نے اسے بالکل ممکن اور قابل یقین ثابت کر دیا ہے، انسان کا ایجاد و کردار کپیوٹر اگر لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے بارے میں معلومات اپنے اندر محفوظ رکھ سکتا ہے اور بوقت ضرورت بتا سکتا ہے، تو اللہ کی قدرت تو بہت بڑی ہے، وہ تو اس انسانی ذہن کا بھی خالق ہے جس نے کپیوٹر ایجاد کیا ہے، اس کے لیے انسانی اعمال کا ریکارڈ رکھنا یقیناً ایک معمولی کی بات ہے۔ اب تو انسان اتنا آگے جا چکا ہے کہ سینکڑوں ہزاروں برس پہلے کی فضائی بسیط کے بھر عین میں تیرتی ہوئی صوتی لہروں کو جدا جدا کر کے انہیں اپنی گرفت میں لینے کی کوششوں میں سرگردان ہے، تاکہ ماضی کے عظیم انسانوں کا پیغام ان کی اپنی آواز میں سن جاسکے۔

عقیدہ آخرت کے انسانی زندگی پر اثرات

۱۔ احساس جواب دہی:

جب انسان آخرت پر ایمانِ کامل رکھتا ہے تو ہر کام کرنے سے پہلے اور ہر قدم اٹھانے سے پہلے وہ بار بار بیکھر سوچے گا کہ میرے اس عمل کا آخرت میں انجام کیا ہو گا، یہ میرے لیے باعثِ رسوائی ہو گا یا سرخوبی اور عزت افزاں کا باعث ہو گا، لہذا وہ ہر اس عمل سے اجتناب کرے گا جو دنیا یا آخرت میں خلق اور خالق کے سامنے اس کے لیے رسوائی کا باعث ہو اور ہر اس کام کو کرنے کی جدوجہد کرے گا جو آخرت میں اس کے لیے اجر و ثواب کا باعث ہو۔ گویا عقیدہ انسانی کردار و عمل میں بنیادی تبدیلی لاتا ہے اور جس شخص کے کردار میں ”ایمان بالآخرۃ“ کے دعوے کے باوجود تبدیلی نہ آئے تو قرآن کی رو سے اس کا ایمان سچا اور پکا نہیں ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) ”أَهَمُّتُ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْتَّيْنِ ۖ فَذِلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ ۖ وَلَا يَحْضُ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۗ“ -

ترجمہ: ”کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھلاتا ہے، یہ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا، (الماعون: ۱-۳)۔“

(۲) ”وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَشِعِينَ ۖ الَّذِينَ يَطْغَوْنَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا إِلَيْهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ لَا جِئْنُونَ ۗ“ -

ترجمہ: ”اور یہ نماز بلاشبہ بڑی بھاری اور مشکل معلوم ہوتی ہے، مگر ان لوگوں کو نہیں جن کے دل اللہ کے آگے عجز و انکسار سے جھکے ہوئے ہیں اور یہ (درحقیقت) وہ لوگ ہیں، جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، (البقرہ: 46)۔“

۲۔ نفس اور باطن کی اصلاح:

دنیا میں انسان کو حکم عدولی اور قانون شکنی سے روکنے کے لیے قوانین مرتب کیے

جاتے ہیں اور ان قوانین کو نافذ کرنے کے لیے ادارے قائم کیے جاتے ہیں، پھر بھی ہر معاشرے میں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو اپنی خفیہ تدابیر، مگر اور چالوں کے ذریعے یا قانون نافذ کرنے والے افراد کو ڈر اور دھمکا کر یا انھیں حرص اور طمع میں جتلاؤ کر کے یا ان کے مقابل، غفلت اور نا اہلی سے فائدہ اٹھا کر ارتکاب جرم کے باوجود اپنے آپ کو قانون کی گرفت اور مکافات عمل سے بچا لیتے ہیں اور اس طرح پورا معاشرہ ان کی شرارتیں اور خباثتوں کا خمیازہ بھگتتا رہتا ہے۔ اس کے عکس جس انسان کا خدا پر ایمان ہو گا اور آخرت پر ایمان ہو گا، وہ کبھی ارتکاب جرم اور ارتکاب گناہ کی جسارت نہیں کرے گا، کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ ایسے وقت میں جب کوئی انسان اُسے نہیں دیکھ رہا، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اللہ کے مقررہ فرشتے اس کے اعمال کو لمحہ بے لمحہ لکھ رہے ہیں اور ہر عمل کا حساب اُسے دینا ہو گا۔ گویا اس طرح انسان کو اپنی ذات میں خارجی عوامل اور حرکات کے بغیر ہی جذبہ اصلاح پیدا ہو گا اور اس طرح وہ ایسے پاک و طیب قلب و دماغ کا حامل ہو گا، جسے برائی سے از خود ہی نفرت ہوتی ہے اور جو فطری طور پر نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے۔

۳۔ اللہ کی نیازمندی، غیر اللہ سے بے نیازی:

جس شخص کا آخرت پر ایمان ہوتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ موت و حیات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ عزم و ہمت اور جرات و شجاعت کا پیکر بن جاتا ہے، اسے اللہ، اس کے رسول اور اللہ والوں کے سوا کسی کی پرواہ نہیں ہوتی، اس کے ہر عمل کا مدعہ مقصد صرف رضاۓ الہی ہوتی ہے۔

۴۔ اخلاقِ عمل اور للہیت:

جو شخص آخرت کی فلاح کو پیش نظر کر نیک عمل کرتا ہے، اس کے عمل میں خلوص ہوتا ہے، نیک نیتی ہوتی ہے، اس کا ہر عمل ریا اور دکھاوے سے پاک ہوتا ہے۔



عبدات

عبدات، معنی و مفہوم:

”عبدات“ کے لفظی معنی ”بندگی“ کے ہیں۔ عبد کے معنی ”بندہ“ اور ”معبود“ وہ ذات جس کی بندگی کی جائے یا جو بندگی کے لائق اور عبادت کا سختی ہو۔ غربی زبان میں ”عبد“ زر خرید غلام کو بھی کہتے ہیں اور ”مربی“، ”محن“ بت یا معبودِ حقیقی کی طرف نسبت کر کے بھی کسی پر عبد کا اطلاق کیا جاتا ہے جیسے: عبد المطلب، عبد الحزیٰ یا عبد اللہ۔ اسی سے عبادت کے معنی ”پوجا اور پرستش Worship“ کے بھی سمجھے جاتے ہیں۔

در اصل بندگی کے معنی ہیں: ”اپنے آتا و مالک کے حضور انتہائی عجز و نیاز کا اظہار کرنا اور ہر کام میں اس کی خوشنودی کو مد نظر رکھنا“۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مطلوب کے حصول میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر بیٹھے، اس چیز کی محبت انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہو جائے، اسے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہے اور پرستش کی حد تک اس سے لگاؤ ہو تو اس چیز کے حوالے سے اس آدمی پر ”عبد“ کا اطلاق کیا جاتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے زر و مال کے پچاری کو ”عَبْدُ الدِّرْهَمِ وَعَبْدُ الدِّينَارِ“ یعنی درہم و دینار کا بندہ فرمایا۔

اصطلاح شریعت میں مخصوص کیفیت، ہیئت اور وضع کے ساتھ معبودِ حقیقی کے سامنے اپنے خلوص، عجز و نیاز اور تذلل واکسار کا اظہار کرنا عبادت کہلاتا ہے جیسے: نماز، روزہ اور حج وغیرہ، اسی طرح ہر مذہب و ملت میں عبادت کے مختلف طریقے اور صورتیں راجح ہیں۔

اسلام کا تصور عبادت:

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اسلام میں بھی دیگر مذاہب کی طرح عبادت کا ایک باقاعدہ ڈھانچہ اور نظام موجود ہے اور اسلام نے ان کی ادائیگی کو فرض عین، قطعی اور لازمی قرار دیا ہے، لیکن درحقیقت اسلام کا تصور عبادت Conception دوسرے مذاہب کی

طرحِ محدود نہیں ہے اور اسلام میں ایسی عبادت کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت نہیں ہے، جو انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز نہ ہو اور انسان کی عملی زندگی پر اس کی گرفتِ مسکم نہ ہو، بلکہ عام زندگی سے ہٹ کر محض ایک رسمی "پوجا پاٹ" کی شکل اختیار کر جائے، یعنی جب انسان نماز پڑھنے کھڑا ہو تو "عبداللہ" بن جائے اور کاروبار دنیا میں مشغول ہو تو "دہم و دینار" اور "زرومال" کا بندہ بن جائے یا کبھی مخلوق کی "بندگی" کو اپنا شعار بنالے اور کبھی خود ہی اپنی "ہواۓ نفس" اور "خواہشات" کا غلام بن جائے، بقول شیخ سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ:

"ہستم اسیر کمند ہوا" (میں خواہش نفس کا غلام ہوں) کی تصویر بن جائے۔ اسلام اس دو عملی کو یکسر رذ کرتا ہے، اسلام میں نہ تو اعقادی کفر و شرک اور نفاق کی گنجائش ہے اور نہ عملی کفر و نفاق کی۔

اسلام میں عبادت کا تصور نہایت جامع اور ہمہ گیر ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اسلام نے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی شکل میں عبادات کا ایک ڈھانچہ محض اس لیے دیا ہے کہ ان عبادات کے ذریعے بندے کا اپنے رب سے براہ راست تعلق استوار ہو جائے، اللہ کے حضور بندگی و انکسار اس کے جسم و روح اور رُگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس طرح رج بس جائے کہ وہ زندگی کا ہر کام محض اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے کرے۔

اس طرح ایک بندہ موسمن کی پوری زندگی عجمِ عبادت اور سرایا بندگی بن جائے گی۔ چنانچہ حدیث پاک میں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جائز اور حلال ذرائع سے کفالت کرنا، اپنے مسلمان بھائی کے کام آنایا کم از کم اس سے خندہ پیشانی سے مانا، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنا، خواہ وہ جانور ہی کیوں نہ ہو، راستے سے کسی تکلیف وہ چیز کو ہٹانا، دو افراد کے درمیان عدل و انصاف کرنا، حلال طریقے سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا وغیرہ ان تمام امور کو صدقہ اور عبادت قرار دیا گیا ہے۔

اور نظام عبادت کا ایک ظاہری مقصد "اطہار بندگی" تو ہے ہی، اس کے ساتھ

سماں ہر شریعت نے یہ بھی مقصود عبادت قرار دیا ہے کہ یہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہو، اس سے انسان کے اخلاق و کردار کی اصلاح ہو اور اس کی نورانیت سے بداعمالیوں کے اندر ہیروں سے نجات ملے، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: ”إِنَّ الصَّلَاةَ تَثْلِي عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ“۔
ترجمہ: ”پیشک نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے، (العنکبوت: 45)۔“

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(۱) ”مَنْ لَمْ يَذَعْ قَوْلَ الرُّؤْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَذَعَ طَعَامَةً وَسَرَابَةً“۔
ترجمہ: ”جو شخص روزہ رکھ کر بھی باطل کلام اور باطل کام نہ چھوڑے، تو اللہ کو اس کے ہاتھ سے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، (بخاری: 1903)۔“
(۲) ”كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ، وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهْرُ“۔

ترجمہ: ”بہت سے روزہ داروں کو بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے شب بیداروں کو رت جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، (مسند احمد: 9685)۔“
اب ہم اسلامی عبادات کا ایک مختصر خاکہ اور جائزہ پیش کر رہے ہیں۔



نماز

نماز کے معنی:

نماز قدیم فارسی زبان کا لفظ ہے، عربی زبان اور قرآن و حدیث میں اس کے لیے لفظ "الصلوٰۃ" آیا ہے، عربی زبان میں لفظ صلوٰۃ کے کئی معنی ہیں، مگر جو معانی نماز کے حقیقی تصور سے قریب تر ہیں، وہ یہ ہیں: دعا، رحمت، استغفار، اچھی تعریف کرنا، تنقیح وغیرہ۔ اصطلاح شریعت میں "نماز" مخصوص اركان پر مشتمل مقررہ اسلامی طریقہ محابات کا نام ہے، اور نماز کے جو لفظی معنی مذکور ہیں، نماز کی اہمیت اور طریقہ ادا ان تمام کو شامل ہے۔

نماز کی اہمیت:

ایمانیات اور عقائد کے بعد دینِ اسلام کا اولین اور اہم ستون نماز ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً سو مقامات پر مختلف انداز سے نماز کا حکم دیا گیا ہے، اصالتاً یا ضمناً ذکر کیا ہے، ترغیب دی گئی ہے یا ترہیب (عذاب الہی سے ڈرانے) سے کام لیا گیا ہے یا سابق انبیاء کرام کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے اور نماز کی اہمیت، ادائے صلوٰۃ پر ثواب، ترک صلوٰۃ پر عتاب اور مختلف پہلوؤں سے نماز کا ذکر احادیث مبارکہ میں اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ ان تمام احادیث کو مکجا کر کے مرتب کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔

نماز تقریباً تمام آسمانی شرائع اور تعلیمات انبیاء کا حصہ رہی ہے، مگر یہ کہ مختلف شرائع اور انبیاء کرام کے زمانے میں اس کی وضع، بہیت اور طریقہ ادا کیا رہا ہے، اسے قرآن و حدیث میں غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔

دیگر تمام عبادات بدینی و مالی ایسی ہیں جو بعض صورتوں اور احوال کے تحت عارضی طور پر بعض بندوں سے ساقط ہو جاتی ہیں مثلاً: روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد وغیرہ، لیکن نماز حالت سفر ہو یا اقامت، حالت صحّت ہو مرض، حالت جنگ ہو یا امن، اس وقت تک ساقط نہیں ہوتی جب تک ہوش و حواس قائم ہوں اور انسان اٹھنے بیٹھنے یا بیٹھ کر پڑھنے یا سواری پر پڑھنے یا

یہ کراشارہ کرنے کے قابل ہے، سوائے اس کے کہ ”ایام مخصوص“ میں عورتوں کے لیے نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور ان نمازوں کی قضا بھی نہیں ہے، نماز کا منکر کافر ہے اور بلاعذر شرعی نماز چھوڑنے والا گناہ کبیرہ کا مرتكب ہو گا اور اسے قضا کے ساتھ ساتھ اللہ سے توبہ بھی کرنی چاہیے۔ بعض صحابہ اور ائمہ کے نزدیک بلاعذر ترک نماز کفر ہے، ان کے موقف کی دلیل یہ حدیث ہے: ”بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشَّهِيدَيْكَ وَالْكُفَّارِ تَرْكُ الصَّلَاةِ“۔

ترجمہ: ”آدمی اور کفر و شرک کے درمیان فرق نماز کا ترک کرنا ہے، (صحیح مسلم: 82)۔“

اسلام میں نماز کی تاریخ:

نماز ہی وہ واحد عبادت ہے جو ابتداء اسلام میں مسلمانوں پر فرض ہو گئی تھی، لیکن مشکلات و موانع کی وجہ سے انفرادی طور پر پڑھنے کی اجازت تھی اور کفار کے مظالم کی وجہ سے بعض اوقات اگر علانية طور پر ممکن نہیں تھا تو خفیہ طور پر بھی پڑھنے کی اجازت تھی۔ سیرت رسول اکرم ﷺ میں ایسے واقعات کا ذکر آتا ہے کہ آپ پر بیت اللہ میں نماز پڑھتے ہوئے اونٹ کی اوچھڑی ڈال دی گئی یا چادر ڈال کر آپ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی۔

ابتداء میں صرف صحیح و شام کی دونمازیں دو دور کعت فرض تھیں، پھر بھرت سے ایک ڈیڑھ سال قبل معراج مصطفیٰ ﷺ کے موقع پر باقاعدہ پانچ وقت کی نمازیں فرض قرار دی گئیں اور اسی مناسبت سے نماز کو حدیث میں ”مَعْرَاجُ الْمُؤْمِنِينَ“ قرار دیا گیا ہے، لیکن مکی دور میں باجماعت نماز کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ مدینہ منورہ پہنچتے ہی رسول اللہ ﷺ نے ”بستی قبا“ اور پھر مدینہ منورہ میں مسجد کی بنیاد رکھی جو آج تک ”مسجد نبوی“ کے نام سے معروف ہے، اس کے بعد آپ نے باجماعت نماز کا اہتمام فرمایا۔

۲ ہجری میں اذان کا سلسلہ جاری کیا گیا اور فجر کے سواباتی نمازوں کی رکعتات کی تعداد پڑھا کر چار کرداری گئی، البتہ مغرب کی نماز تین رکعتات مقرر کی گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے سفر یا حضر، صحت یا مرض، امن یا جنگ کی بھی حالت میں نماز ترک کرنے کی اجازت نہیں دی، البتہ اگر مرض اور کمزوری اس حد تک پہنچ جائے کہ

انسان لیئے ہوئے اشارے سے بھی نماز ادا نہ کر سکے یعنی ہوش و حواس ہی قائم نہ رہیں، تو اس مرحلے پر نماز کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، شریعت نے نماز کے سلسلے میں جو رخصت یا تخفیف کا حکم دیا، وہ یہ ہے:

حالہ سفر (خواہ سفر مشکل حالات میں یا انتہائی آرام دہ حالات میں) ہو مگر مقدار شرعی یعنی ۲۳۲، ۹۸ کلومیٹر یا ۲۱ میل ۲ فرلانگ ۲۰ گز سے کم نہ ہو) میں قصر کا حکم دیا۔ یعنی ظہر، عصر اور عشاء کے فرائض چار کی بجائے صرف دور کعات پڑھنے کا حکم ہے۔ سفر میں وتر بھی پڑھنے جائیں گے، جبکہ سنتوں کی رخصت اختیاری ہے، بعض علماء نے کہا:-

(الف) سفر جاری ہوا اور دوران سفر نماز پڑھنے تو سنت موکدہ چھوڑ دے اور کسی منزل پر جا کر عارضی طور پر ٹھہرا ہوا ہے تو افضل یہ ہے کہ سنتوں پڑھ لے۔

(ب) وضو یا غسل کسی عذر کی بنا پر نہ کر سکے یا پانی میسر نہ ہو تو تمیم کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہے۔

(ج) کسی عذر شرعی کی بناء پر نماز چھوٹ جائے تو قضا کا حکم ہے۔

(د) بلا عذر بھی نماز چھوٹ جائے تو قضا لازم ہے، لیکن چونکہ عذر شرعی کے بغیر ترک نماز گناہ کبیرہ ہے، اس لیے توبہ بھی ضروری ہے۔

فرائض و سنن:

اوپر نماز کی تعداد رکعات کا جو ذکر ہوا، اس سے فرض نماز میں مراد ہیں جن کے لیے حدیث میں "صلوٰۃ مَكْتُوبَہ" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، مکتوبہ کے معنی ہیں: بلکہ ہوئی یعنی فرض قرار دی ہوئی نماز، کیونکہ کسی چیز کا جیسا تحریر میں آنا دیسے بھی اس کے یقینی ہونے اور تک و شبہ سے بالآخر ہونے کی علامت ہے اور اللہ کی طرف سے لکھا جانا یا اس کی فرضیت قطعیت اور لزوم سے استعارہ ہے اور اس کے لوح محفوظ پر لکھا جانا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ فرض نمازوں کے اوقات اور تعداد رکعات سے ہر مسلمان واقف ہے۔

لیکن رسول اکرم ﷺ عملًا صرف فرض نمازوں کی ادائیگی پر ہی اکتفا نہیں

فرماتے تھے، بلکہ عباداتِ نافلہ بکثرت کیا کرتے تھے، قرآن مجید میں آپ کو تہجد کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

آپ کے قیامِ سل (رات کا کچھ حصہ یا اکثر حصہ یا رات بھر عبادت و نماز میں صرف رہنے) کا بھی قرآن مجید میں تذکرہ ہے، اس سلسلے میں بطور خاص ”سورۃ المزمل“ ملاحظہ فرمائیں، اس کے علاوہ اللہ کے ”بندگانِ خاص“ کے جواب و صاف قرآن میں مذکور ہیں، ان میں رات بھر سجده و قیام میں گزار دینا، اٹھتے بیٹھتے اور کروٹوں کے بل اللہ کا ذکر کرنا، مشغولیت عبادت و نماز کی وجہ سے آرام دہ بستروں سے دور رہنا وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جن سے کثرتِ صلوٰۃ اور عباداتِ نافلہ کی مقبولیت اور اہمیت واضح ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی پیشتر عباداتِ نافلہ رات کی خلوتوں میں ہوتی تھیں۔ جب آپ ﷺ ربِ کریم سے تقریب خصوصی کے ساتھ راز و نیاز کی پراثر دعا میں کرتے تھے، لیکن نوافل کا ایک حصہ فرائض کے ساتھ علاوی طور پر اور دوام کے ساتھ ادا فرمایا تاکہ امت بھی اس کی تقلید کرے، چنانچہ بعد میں ائمہ مجتہدین نے ”سنن مؤکدة“ اور ”غیر مؤکدة“ کے عنوان کے تحت ان کا تفصیل فرمایا اور نہ صرف یہ کہ ان کی ادائیگی کو مستحسن اور باعث اجر و ثواب قرار دیا، بلکہ ”سنن مؤکدة“ کے ترک اور خاص طور پر عادۃ ترک کو باعث گناہ قرار دیا اور ان نوافل کو فرائض میں کسی قسم کی کمی، کوتاہی اور خامی کے لیے اللہ کے ہاں ذریعہ تلافی بتالیا۔ جہاں تک نماز کی شرائط، اركان، سنن، مستحبات کا تعلق ہے، تو ان کی تفصیل کی میہاں گنجائش نہیں، لیکن اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ نماز کا کامل اجر نورانیت اور خیر درکات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اسے اس کے اركان، سنن، مستحبات اور آداب کو ملاحظہ کر کر ادا نہ کیا جائے۔ ”ادائے محض“ اور ”حسن ادا“ میں بڑا فرق ہے۔

نماز کی دینی، اخلاقی اور روحانی حکمتیں اور فوائد

۱۔ اللہ کی بارگاہ میں عجز و نیاز اور خشوع و خضوع:

”بندگی“ کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اپنے رب کے حضور انتہائی تضرع، انکسار اور عاجزی کا اظہار کیا جائے اور ایسی کیفیت پیدا ہو کہ کم از کم تھوڑی دیر ہی کے لیے ہی انسان ساری دنیا سے کٹ کر اور سب سے ہٹ کر محض اللہ سے لوگا جائے اور یہ رابطہ اتنا راست اتنا لطیف اور اتنا کامل ہو کہ اللہ کی حضوری اور نورانیت کے سوا ذہن کہیں اور منتقل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں عبادت کی اصل روح اس بات کو قرار دیا گیا ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس انہاک و متغراً کے ساتھ کرو: ”گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔“

چنانچہ شاہ ولی اللہ نے نماز کی حقیقت کو اس طرح بیان کیا: ”نماز کی اصل تین چیزیں ہیں: (۱) دل و دماغ اور نظر اللہ کی عظمت و جلال کے سامنے سرا فلنڈہ ہوں، عجز و انکسار اور تواضع سے معمور ہوں، (۲) اپنی درماندگی و عاجزی اور اللہ کی عظمت و جلال کا اظہار بہترین الفاظ کے ساتھ اپنی زبان سے کرے، (۳) اپنے اعضاء و جوارح کے ذریعے ظاہراً بھی مجسم پیکر انکسار بن جائے (اور قیام و رکوع و سجود اسی کی تعبیر ہیں) یعنی سجود ایسے پر کیف ہوں کہ جبیں نیاز بھی اللہ کے سامنے جھکی ہو اور قلب و روح بھی اس کے سامنے سر بسجود ہوں۔

۲۔ مجرمات و ممنوعات سے اجتناب:

نماز اگرچہ اپنی جگہ خود ایک ”عماراتِ مقصودہ“ ہے، لیکن شارع کا مطلوب یہ بھی ہے کہ اسے دیگر حسنات کے حصول کا ذریعہ بھی ہونا چاہیے اور اس سے دل و دماغ اور ذہن میں ایسی پاکیزگی اور طہارت پیدا ہونی چاہیے، جس سے طبیعت خود بخود مجرمات و ممنوعات سے مُنفر و بیزار ہو جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”إِنَّ الصَّلَاةَ تَشْهِي عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ۔“

ترجمہ: ”بے شک نماز بے حیا یوں اور بُری باتوں سے روکتی ہے، (العکبوت: 46)“
 یعنی نماز کی برکت و فیضان سے نمازی کے اخلاق و کردار میں ایک انقلاب برپا ہونا چاہیے اور
 اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہمیں اپنا جائزہ لپتے رہنا چاہیے کہ ہماری نمازوں اور اعمال میں آخر
 کیا کوتا ہیاں اور خامیاں ہیں جن سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔

۳۔ نماز باجماعت اخوت و مساوات کا عظیم مظاہرہ:

اسلام میں نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم ہے اور بلا عذر شرعی ترکِ جماعت پر
 سخت و عید آئی ہے اور جب ایک ہی مسجد میں، ایک ہی امام کی قیدا میں سب مسلمان
 باجماعت نماز ادا کرتے ہیں تو بقول اقبال منظر کچھ یوں ہوتا ہے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
 نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
 بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
 تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اس کے ساتھ دن میں پانچ وقت باہم ملنے سے ایک دوسرے سے الفت و محبت
 پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت و شناسائی ہوتی ہے، مسلمان ایک
 دوسرے کے کام آسکتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی فلاح و بہود کے لیے راہ عمل متعین کر سکتے
 ہیں۔ اسی طرح نماز باجماعت سے اطاعتِ امیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پابندی وقت کی
 تربیت ہوتی ہے اور نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ بے نماز یوں کی منفی سوچ:

ایے حضرات جو اپنی بے عملی، کاہلی اور تسلیل کی وجہ سے نمازوں پڑھتے یا نماز کی
 اہمیت کو دل سے تسلیم نہیں کرتے، لیکن مسلمانوں کے اجتماعی دباؤ کی وجہ سے صراحتاً اپنے
 نظریات کا اظہار نہیں کر سکتے، بعض نمازوں کے کردار کی کمزوری کو نشانہ بنانے کی یہ کھجتی کرتے
 ہیں کہ ایسی نماز کا کیا فائدہ جس کے بعد انسان ناپ تول میں کمی کرے، اپنے ماتحتوں پر ظلم و

زیادتی کرے وغیرہ۔ لہذا یا تو انسان نماز پڑھ کر آئندیل مومن بنے یا سرے سے نماز ہی کو خیر باد کہہ دے۔

ایہ سوچ اور فکر منفی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے اور خدا نخواستہ غلط کام کرتا ہے تو اسے یا اس کے غلط فعل کو نشانہ ملامت بنانا چاہیے نہ کہ نماز کو۔ نمازو کسی کو بد دیانت، چور یا خائن نہیں بناتی اور ان بد اعمالیوں کو ترک نماز کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے بلکہ نماز کا اور زیادہ اہتمام کر کے ان بد اعمالیوں کو ترک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اس فلسفے کو زیادہ وسعت دی جائے تو پھر یہ کہا جانے لگے گا کہ جب ہم مسلمان ہو کر مسلمانوں والے کام نہیں کرتے تو مسلمان رہنے سے کیا فائدہ، اس طرح تو پھر اسلام سے بھی رخصت کا بہانہ نکل آئے گا۔



زکوٰۃ

زکوٰۃ کے لفظی معنی ہیں، نشوونما پانا، بڑھنا، پہلنا پہولنا اور پاک ہونا، کسی چیز کا حصہ وغیرہ، اصطلاح شریعت میں زکوٰۃ سے مراد مال میں سے وہ مقررہ حصہ ہے جو مالدار صاحبِ نصاب کو اپنے مال پر ایک سال کامل گزرنے کے بعد اللہ کے لیے بہ نیت عبادت و ثواب ادا کرنا لازمی ہوتا ہے۔

زکوٰۃ صرف مالی لیکن نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کا ایک اہم فریضہ، رکن اور عبادت ہے۔ زکوٰۃ کے شرعی مفہوم میں وہ تمام معانی موجود ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، کیونکہ ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ”زکوٰۃ“ ادا کرنے سے اگرچہ ظاہر مال میں کمی آتی ہے، لیکن حقیقت میں زکوٰۃ ادا کرنے سے مال میں برکت ہوتی ہے اور انسان کوشش کرے تو وہ بڑھتا اور پہلتا پھولتا رہتا ہے یا یہ کہ مال کا وہ حصہ جو زکوٰۃ کے طور پر دے دیا جاتا ہے، ظاہرًا وقتی طور پر مال میں اتنی کمی آجائی ہے، لیکن اجر آخرت کے اعتبار سے اس میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا ثواب کئی گناہ اور بے حد و حساب عطا فرماتا ہے یا یہ کہ زکوٰۃ بنیادی طور پر ایسے مال پر فرض ہوتی ہے کہ اگر انسان کوشش کرے تو اس میں مادی اعتبار سے بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے بقیہ مال جو حلال ذرائع سے کمایا ہوا ہے، انسان کے لیے با برکت، حلال اور طیب ہو جاتا ہے اور اس میں روحانی طور پر بھی برکت ہوتی ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت:

(۱) زکوٰۃ، نماز کی طرح اسلام کا ایک ہم رکن اور لازمی عبادت ہے، زکوٰۃ ادا نہ کرنے والا گناہ کبیرہ کا مرتكب ہوتا ہے اور اس کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے ہوئے فرمایا تھا: ”میں ان لوگوں کے خلاف جہاد کروں گا، جو نمازو زکوٰۃ میں تفریق کرتے ہیں۔“

(۲) قرآن مجید میں بیشتر مقامات پر نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے، کہیں صراحتاً لفظ "زکوٰۃ" آیا ہے، کہیں "انفاق فی سبیل اللہ" (اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور کہیں "صدقة" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

(۳) قرآن مجید میں انفاق فی سبیل اللہ کے اجر و ثواب کو ایک مثال کے ذریعے واضح فرماتے ہوئے ایک روپے کے عوض ۰۰۷ گناہ یا اس سے بھی دو چند کی پیش گوئی فرمائی گئی ہے، جبکہ سونا و چاندی ذخیرہ کرنے والے اور زکوٰۃ نہ دینے والوں کو دردناک عذاب کی بشارت دی گئی ہے اور فرمایا: اس مال کو زکوٰۃ اداہ کرنے والوں اور روک کر رکھنے والوں کو جہنم کی آگ میں گرم کر کے اُن کی پیشانیوں، پیٹھوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا۔

(۴) زکوٰۃ کسی شکل میں سابق شرائع اور تعلیمات انبیاء کرام کا بھی حصہ رہی ہے، بعض انبیاء کرام کے حوالے سے قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

(۵) اسلام میں زکوٰۃ اور صدقہ فطرہ باقاعدہ طور پر ۲ ہجری میں فرض ہوئے، جبکہ "انفاق فی سبیل اللہ" کا سلسلہ شروع اسلام سے جاری تھا، جس کے تحت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ان کے خالم آقاوں سے خرید کر آزاد کیا۔

احکام زکوٰۃ:

(۱) زکوٰۃ ہر عاقل و بالغ صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک نابالغ کے مال پر زکوٰۃ نہیں، جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک نابالغ کے مال پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

(۲) زکوٰۃ کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ کم از کم نصاب پر ایک سال گزر جائے، یعنی سال کے دوران ہر وقت کم از کم نصاب سونا یا چاندی یا نقد رقم یا متفرق اموال یا مالی تجارت کی شکل میں اس کی ملکیت میں رہنا ضروری ہے، لیکن مال کے ہر ہر حصے پر سال گزرنالازمی نہیں ہے۔

(۳) زکوٰۃ کا کم از کم نصاب ساڑھے سات تو لے سونا (۸۷، ۸۸ گرام، اگر مال صرف سونے کی شکل میں ہو) یا ۵۲ تو لے چاندی (۳۶-۶۱ گرام) یا ۵۲ تو لے چاندی کی مردّجہ قیمت (Current Value) کے برابر الیت۔

(۴) نقد یا متفرق اموال کی صورت میں جاں کا نصاب معتبر ہو گا۔

(۵) اگر کوئی شخص مقرض ہے تو بارِ قرض لومنہا کر کے زکوٰۃ کا تعین کیا جائے گا۔

(۶) سونا اور چاندی زیورات یا کسی بھی شکل میں ہوں، ان پر زکوٰۃ فرض ہے۔

(۷) اموالِ تجارت میں اختتامِ سال پر حاضر اسٹاک کی جتنی بھی مالیت ہے، ان پر زکوٰۃ فرض ہے۔

(۸) کارخانے کی مشینری یا کسی بھی طرح کی مشینری جسے کمانے کے آلات کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں بلکہ اس کی کمائی یا آمدنی پر زکوٰۃ ہو گی مثلاً: ایک ٹیکشائل مل کی جو مشینری ہے، اس پر زکوٰۃ نہیں، لیکن اس کارخانے سے جو سال بھر کی کمائی ہے یا روئی یادھا گے یا کپڑے کا جو بھی اسٹاک ہے، اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

(۹) جو رقم قرض دی ہوئی ہے، اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے خواہ اب ادا کرے یا جب قرض واپس ملے تو گزشتہ پوری مدت کی زکوٰۃ دینا ہو گی۔

مصارف زکوٰۃ یا مستحقین زکوٰۃ:

زکوٰۃ کے مصارف کا تعین قرآن نے کر دیا ہے، ان میں کی بیشی نہیں ہو سکتی،

مصلفوں کو ہم آٹھ ہیں:

(۱) نقراء: جن کے پاس وقتی گزر بسر کے لیے کچھ ہو، لیکن وہ ضرورت مند ہوں اور مالک نصاب نہ ہوں۔

(۲) مساکین: جن کے پاس وقتی گزر اوقات کے لیے بھی نہ ہو۔

(۳) عاملین زکوٰۃ: وہ افراد جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور ہیں، انھیں زکوٰۃ کی مدد سے تنخواہ یا

حق الخدمت دیا جاسکتا ہے۔

(۴) مولفۃ القلوب: وہ نو مسلم جن کی تالیف قلب اور حوصلہ افزائی مقصود ہو، جو اپنے سماج سے کٹ کر اور سب کچھ چھوڑ کر اسلام کی آغوش میں آنا چاہتے ہوں یا آپکے ہوں اور انہیں سابق کافر یا مشرک رشتہ داروں اور ہم مذہب لوگوں کے سماجی مقاطعے (Social Bycot) اور مذہبی عناد کی وجہ سے مالی مشکلات کا سامنا ہو۔

(۵) غلام آزاد کرنا: غلاموں کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے کے لیے زکوٰۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے، یہ طبقہ آج کل موجود نہیں ہے۔

(۶) غار میں: ایسے مقروض جو بار قرض میں جکڑے ہوئے ہوں اور اس سے نجات پانے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔

(۷) فی سبیل اللہ: ایسے افراد جو فکرِ معاش سے بے نیاز ہو کر اللہ کی راہ میں اللہ کے دین کی نصرت کے لیے نکل کھڑے ہوں، مثلاً: مجاہدین فی سبیل اللہ یا ایسے افراد جو کل وقتی طور پر حصول علم دین میں مصروف ہوں۔

(۸) ابن السبیل: (مسافر) ایسے افراد جو خواہ اپنے وطن میں مالدار اور صاحب نصاب ہوں، لیکن حالت سفر میں ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئے ہوں کہ وطن سے یا گھر سے رابط اور مدد کا حصول ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

شرح زکوٰۃ:

(۱) سونا، چاندی، نقدی، اموال تجارت، بینک اکاؤنٹس، بانڈز، شیرز اور اس طرح کے تمام مالی ترمکات پرسال کے اختتام پر ڈھائی فیصد زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

(۲) بارانی زمین کی پیداوار پر صدقہ واجبہ (جسے اصطلاح شریعت میں "عشر" کہتے ہیں) دس فیصد ہے، احناف کے نزدیک عشر کے واجب ہونے کے لیے کم از کم نصاب کی کوئی شرط نہیں ہے، بلکہ جتنی بھی زرعی پیداوار ہوگی، اس پر عشر واجب ہوگا۔

(۳) آبی (نہری) زمین کی پیداوار پر نصف عشر یعنی پانچ فیصد ہے۔

(۲) مویشیوں کی شرح زکوٰۃ کی تفصیل الگ ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد:

(۱) زکوٰۃ بجائے خود مقصود بھی ہے اور مقاصد حسنے کے حصول کا ایک ذریعہ بھی۔ فرمیت زکوٰۃ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں فرد کو حلال اور جائز ذراائع سے حاصل شدہ مال پر حق ملکیت حاصل ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے یہ تصور بھی دیا ہے کہ انسان کی اپنی ذات، اس کی صلاحیتیں اور مال و متاع اور اموال و اولاد انسان کے پاس اللہ کی عطا کردہ نعمتیں اور امانت ہیں، اس لیے ان میں اللہ کی مرنسی اور منشاء کے مطابق تصرف کرنا چاہیے۔

(۲) اسلام نے زکوٰۃ و فطرہ اور عشر کی شکل میں صدقات کو اس لیے واجب قرار دیا ہے کہ مال کی محبت جو انسان کی فطرت میں داخل ہے، اپنی حدود کے اندر رہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول نبی ﷺ کی محبت پر غالب نہ آئے۔ اس طرح سے اپنی محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو اللہ کی راہ میں دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ جو شخص اللہ کی راہ میں مال کی قربانی نہیں دیتا، وہ وقت پڑنے پر جان کی قربانی کیا دے گا۔

۳۔ زکوٰۃ اسلام کا کم از کم لازمی اور قطعی مالی مطالبہ ہے، لیکن زکوٰۃ کی ادائیگی پر اکتفا کر لیما یہ اسلام کا مطلوب حقیقی اور آئینہ میں نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعے جذبہ ایثار پیدا کرنا مقصود ہے۔ مطالبے پر دینے میں وہ کمال نہیں جو بغیر مطالبے کے دینے میں ہے، اس لیے اسلام زکوٰۃ کے ذریعے اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ مسلمان اللہ کی راہ میں اپنا زیادہ سے زیادہ مال خرچ کریں، چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنِفِقُونَ قُلِ الْعَفْوُ“۔

ترجمہ: ”(اے رسول!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجیے جو تمہاری ضروریات سے زائد ہے، (البقرة: 219)۔“

یہ تو ”انفاق“ اور صدقاتِ نافلہ“ کا ابتدائی درجہ ہے، اعلیٰ درجہ اور جذبہ جو شریعت کا مقصود

ہے، وہ ”درجہ احسان“ ہے یعنی دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: ”لَنْ تَأْتُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ شَنِقُوا مِمَّا تُجْبُونَ“ -

ترجمہ: ”تم ہرگز بھلانی کو نہیں پاسکتے جب تک کہ (اللہ کی راہ میں) وہ خرچ نہ کرو جسے تم خود پسند کرتے ہو، (آل عمران: 92)“ -

اور اللہ تعالیٰ اپنے ایشارکیش بندوں کا حال یوں بیان فرماتا ہے:

”وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُصِّهِ مُسْكِينًا وَيَتِيمًا وَآسِيرًا“ -

ترجمہ: ”وہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے ہیں، (الدھر: 8)“

ایک اور مقام پر فرمایا:

”وَيُؤْثِرُونَ عَلٰى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاَةٌ“ -

ترجمہ: ”وہ خود شدید حاجت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں“ -

(الحضر: 9)

(۴) ”انفاق فی سبیل اللہ“ کے اس قدر واضح احکام دے کر اسلام یہ چاہتا ہے کہ مال کی محبت انسان کے ضمیر اور ذہن پر اس قدر غالب نہ آجائے کہ وہ ”ورہم و دینار کا بندہ“ بن کر رہ جائے، بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ وہ مال پر حاکم و متصرف بن کر رہے، مال کو نہ پوچھے، بلکہ مال کو اللہ کی بندگی کا ذریعہ بنائے۔

(۵) اسلام ”انفاق“ کا حکم ضرور دیتا ہے، مگر ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ مشکلات و مصائب میں لے لیتا بجا ہے، لیکن انسانیت کی تکریم دینے میں ہے نہ کہ لینے میں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”الْيَدُ الْعُلْيَا لِخَيْرٍ وَمِنَ الْيَدِ السُّفْلَى“ -

ترجمہ: ”اوپر والا ہاتھ ٹیکھے واپسے ہاتھ سے بہتر ہے، (بخاری: 1429)“ -

لہذا مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے کہ محنت و مشقت سے کمانے والا بنے، نہ کہ معاشرے پر بار بنا جائے۔

(۶) اسلام مال کی محبت کا علاج فطری اور نفیاتی طریقوں سے بھی کرتا ہے، چنانچہ

ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ صاحبہ کرام سے پوچھا: ”تم اپنے مال کی حفاظت زیادہ کرنا چاہو گے یا دوسروں کے مال کی، لوگوں نے عرض کیا: اپنے مال کی، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”فَإِنَّ لَكَ مِنْ مَا أَكَلَتْ فَأَنْتَيْتَ أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ أَوْ أَعْطَيْتَ نَأْمَقْيَتَ، إِلَّا فِيمَوَالِيكَ“۔

ترجمہ: ”تمہارا مال تودہ ہے جو تو نے کھالیا اور ختم کر دیا یا پہن کر بوسیدہ کر دیا یا اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا، باقی توسب و ارثوں کا مال ہے، (المستدرک للحاکم: 6566)“

ایک اور حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت بلاں کے پاس تشریف لائے اور انکے پاس کھجور کا ایک ڈھیر تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: اے بلاں! یہ کیا ہے، انہوں نے عرض کیا: یہ چیز میں نے کل کے لیے جمع کر کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”أَنْفَقُ بِلَالٍ وَلَا تَخْشُ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا“

ترجمہ: ”بلاں! خرچ کرو اور عرش کے مالک سے کمی کا خوف نہ رکھو، (شعب الایمان: 3067)“

اور قرآن میں ہے:

”مَا عِنْدَكُمْ يَنْقُدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ“۔

ترجمہ: ”جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا۔“

(آلہ: 96)

(۷) اسلام انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کر کے معاشرے کو الافت و محبت کی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہے، الہذا دینے والے سے اسلام یہ کہتا ہے کہ دے کر احسان نہ جتلاؤ، اللہ تعالیٰ کا رشارد ہے: ”لَا يُبْطِلُونَ أَصْدَقَتِنَا بِالْمِنْ وَالْأَذْي“۔

ترجمہ: ”احسان جتلاؤ اور ذہنی اذیت دے کر اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو،“

”(البقرہ: 264)“

بلکہ دیتے وقت یہ سمجھ کر دو کہ یہ مال تمہارے پاس مستحقین کی امانت ہے اور تم ان کا حق انہیں

لوٹا رہے ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”تُؤْخِذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتَرَدُّ عَلَى فُقَرَاءِ إِيمَانِهِ“ -

ترجمہ: ”صدقة ان کے اغنياء سے لے کر فقراء کو لوٹایا جائے گا، (صحیح مسلم: 19)۔“ -

اس سے اسلام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دولت کو جمع کر کے نہ رکھا جائے، بلکہ دولت کی گردش (Circulation) ہوتی رہے، چنانچہ اسلام نے زکوٰۃ فطرہ، عشر اور صدقاتِ نافلہ، مالی کفارات اور وراشت کا نظام اسی لیے قائم کیا ہے۔

روزہ

روزے کو عربی میں "صوم" یا "صیام" کہتے ہیں، اس کا اطلاق مفرد اور جمع پر یکساں ہوتا ہے۔ صوم کے لفظی معنی ہیں: "رکنا" اور اصطلاح شریعت میں: "صح صادق" ہے لے کر غربہ آنتاب تک عبادت کی نیت سے کھانے پینے اور مباشرت سے رکنا ہے۔

روزے کی اہمیت:

قرآن مجید میں جن روزوں کی فرضیت کا ذکر ہے، اس سے رمضان کے روزے مراد ہیں۔ سورۃ البقرۃ روایت ۲۳ آیات ۱۸۵ تا ۱۸۲ میں صراحت کے ساتھ ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت اور اس سے متعلق چند ضروری مسائل بیان کیے گئے ہیں، ارشاد فرمایا:

(۱) "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَتَبْعَدُ عَلَيْكُمُ الْقِيَامُ كَمَا لَتَبْعَدُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَكَبَّرُونَ"۔

ترجمہ: "اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم متقبی بن جاؤ، (البقرۃ: 183)"۔

(۲) "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبُشِّرَتِ قَوْمٌ الْهُدَى
وَالنُّورُ قَالَ رَبُّكَ لِلْمُنْذِرِ إِنَّمَا يُنذِرُ الْمُنْذَرَ وَمَنْ يُنذَرَ فَإِنَّمَا يُنذَرُ
عَلَيْهِ مَا كَانَ فِي أَهْلِهِ وَمَا يَعْلَمُ بِهِ إِنَّمَا يُنذَرُ عَلَيْكُمُ الْأَخْرَى"۔

ترجمہ: "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (یقین و باطل کے درمیان) فرق کر دینے والی (کتاب ہے)، پس تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے لارے رکھے اور جو بیمار ہو یا مسافر تو وہ گنتی کے دوسرے دنوں میں (تعداد) پوری کر لیں،" (البقرۃ: 185)

رمضان المبارک کے روزے اول ۲۷ ہجری میں فرض کیے گئے اور اس وقت سے اب تک امت مسلمہ اس پر عمل کرتی ہے۔ قرآن کریم میں بتایا گیا کہ ”روزہ“ ایک ایسی عبادت ہے جو سابقہ شرائع اور تعلیمات انبیاء میں کسی نہ کسی طریقے سے راجح رہی ہے اور آج بھی آسمانی اور غیر آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کے ہاں روزے کا تصور پایا جاتا ہے۔

قرآن نے یہ بھی واضح فرمادیا ہے کہ رمضان المبارک کو ”عبادتِ صائم“ کے لیے منحصر کرنے میں اللہ کی حکمت یہ ہے کہ اس مہینے میں قرآن نازل ہوا، اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتوں اور انوار و تجلیات کے نزول کا مہینہ ہے۔ حدیث پاک کی رو سے اس میں نیکیوں کا اجر و ثواب عام دنوں کے مقابلے میں ستر گناہ اندھ عطا کیا جاتا ہے، گویا یہ مہینہ نیکیوں کے لیے ”موسم بہار“ ہے، اس میں شر کے حرکات یعنی شیاطین کو مقید کر دیا جاتا ہے اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، ایک روایت میں ہے کہ رحمت کے تمام دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

اس مبارک مہینے میں چونکہ نیک اور صالح طبیعتیں ریاضت، عبادت اور اطاعت پر آمادہ ہوتی ہیں، اس لیے اس میں رات کو نمازِ تراویح اور اس میں ختم قرآن کو سنت موکدہ قرار دیا گیا ہے، آخری عشرے میں اعتکاف کا حکم دیا گیا ہے جو ”سنۃ موکدہ علی الکفاریہ“ ہے، یعنی اگر کسی محلے یا بستی میں کوئی بھی اسے ادا کرے تو اس محلے کے سب افراد کے لیے کافی ہے اور اگر کوئی نہیں کرے گا تو سب گنہگار ہوں گے۔ اعتکاف ایک ایسی عبادت ہے جس میں انسان سب سے کٹ کر اور یہکہ سوہو کر دس دنوں کے لیے اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے۔

اس ماہِ مبارک کے اختتام پر صدقہ فطر کا مالی صدقہ ہر مسلمان پر واجب قرار دیا گیا ہے، جو ہر شخص پر اس کی اپنی اور زیر کفالت افراد کی جانب سے ادا کرنا لازم ہے اور اس کے اختتام پر عید الفطر کا متبرک دن ”اجماعی عبادت“ کے روح پر و منظر کے ساتھ عطا کیا گیا ہے۔

روزے کے مسائل:

رمضان کے روزے ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہیں، اس کی بڑی فضیلت یہ بھی ہے کہ ایام مخصوص میں عورت کے لیے نماز اور روزہ دونوں کی ممانعت ہے، لیکن روزے کی قضا ہے، جبکہ نماز کی قضا عورت پر لازم نہیں ہے۔

بلاعذرِ شرعی رمضان کا روزہ ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس کا منکر کافر ہے اور بلاعذرِ شرعی ترک کرنے والا گناہ بکیرہ کا مرتكب ہے اور اس پر قضا ہے، اگر روزہ رکھ کر بغیر عذر کے توڑ دیا تو سائٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا سائٹھ دن مسلسل روزے رکھنے کی صورت میں کفارہ ادا کرنا ہوتا ہے۔

حالٰتِ مرض یا حالٰتِ سفر میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، جس کی بعد میں قضا لازم ہوگی۔ جو شخص بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکتا اور اس کی صحت کی بحالی کی امید نہیں ہے تو اسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور روزوں کا "福德یہ" دینا ہوگا۔ ایک روزے کا فدیہ ایک صدقۃِ فطر کے مساوی ہے۔

اس کے باوجود اگر وہ صحت مند ہو کر روزہ رکھنے کے قابل ہو جائے تو اسے قضا کرنی چاہیے، بھول کر کھانے، پینے اور مبارشت سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

دوسرے ہمینوں کی طرح رمضان المبارک کے آغاز اور ختم کا دار و مدار رویت ہلال (چاند دیکھنے) پر ہے، رمضان شروع ہونے کے لیے ایک معتبر دیندار آدمی کی گواہی کافی ہے، جبکہ رویتِ عید کے لیے کم از کم دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے اور اب کی صورت میں کثر جماعت کی شہادت معتبر ہوگی، اگر ۲۹ رمضان کا چاند نظر نہ آئے تو ۳۰ روزے پورے کیے جائیں۔

روزے کے مقاصد

ا۔ تقویٰ:

روزے کا اہم ترین مقصد تقویٰ ہے جو قرآن نے متعین کیا ہے اور درحقیقت ہر عبادت سے شریعت کا مدعہ و مقصود اور تمام احکام کی غایت یہی ہے۔ روزے میں ایک محدود وقت کے لیے کھانا پینا وغیرہ منوع قرار پاتے ہیں، حالانکہ عام حالات میں یا روزے سے قبل اور بعد یہ امور شرعاً حلال اور جائز ہیں، نیز وہ امور جو عام حالات میں بھی شرعاً ہمیشہ منوع ہیں، ان سے بچنا اور اجتناب کرنا روزے کی حالت میں اور بھی ضروری قرار پاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”مَنْ لَمْ يَذَعْ قَتْلَ الرُّؤْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ بِلَهُ حَاجَةٌ أَنْ يَذَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ“۔
ترجمہ: ”جس شخص نے جھوٹی بات اور باطل پر عمل نہ چھوڑ تو اللہ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے سے کوئی غرض نہیں، (صحیح البخاری: 1903)“۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ کہ روزہ دار سے کہا جائے کہ اگر تم جھوٹی باتوں کو نہیں چھوڑتے تو تم روزہ رکھنا چھوڑ دو، بلکہ اس حدیث میں روزے کی حالت میں جھوٹ بولنے اور دیگر باطل امور سے منع فرمایا گیا ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقوے سے خالی روزے کے بارے میں فرمایا:

”كُمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُمُوعُ“۔

ترجمہ: ”کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں جنھیں ان کے روزوں سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، (مسند احمد: 9685)“۔

لہذا شریعت کا نشانی یہ ہے کہ روزے دار کو چاہیے کہ روزے کے ذریعے ضبط نفس کی ایسی تہبیت حاصل کرے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے نفس کو تمام منوعات سے روک سکے اور تمام اچھے اعمال کا خواگر بن سکے اور اسی کا نام تقویٰ ہے۔

۲۔ اخلاص اور للہیت:

روزے کا دوسرا اہم مقصد اخلاص نیت، للہیت اور بے ریائی ہے، کیونکہ روزے کے علاوہ جتنی بھی عبادات ہیں، ان میں ریا اور دکھاوے کا شایبہ اور امکان پایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ ایسا ہو، مثلاً: نماز، زکوٰۃ، حج اور جہاد وغیرہ۔ لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں ”ریا کاری“ کا ادنیٰ شایبہ بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص لوگوں کے سامنے خود کو روزے دار ظاہر کرے، لیکن تہائی میں جب مخلوق میں سے اسے کوئی بھی نہ دیکھ رہا ہو، ایک قطرہ یا ایک گھونٹ پانی پی لے تو اس کا روزہ باقی نہیں رہے گا، مگر روزے دار ایسا ہرگز نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ وہ خلق کی نظر سے لاکھ چھپ جائے، خالق کی نظر سے نہیں چھپ سکتا۔ روزہ صرف وہی مسلمان رکھتا ہے جس کا ایمان اس بات پر توی اور غیر متزلزل ہو کہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے، سمع و بصیر ہے اور ظاہر و باطن کا کوئی بھی حال اس مخفی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”الْحَسَنَةُ بَعْشِرَ أَمْثَالِهَا“

ترجمہ: ”انسان کے ہر عملِ خیر کا اجر دس گناہک ملے گا، (مند احمد: 9322)۔“

لیکن روزہ اس عام قانون سے مستثنی اور بالاتر ہے، حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”الصَّوْمُ لِنِ وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، يَدْعُ شَهْوَتَهُ وَأَكْلَهُ وَشَرَبَهُ مِنْ أَجْلِي“۔

ترجمہ: ”روزہ صرف میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جز ادول گا، وہ اپنا کھانا پینا اور شہوت میرے لیے ہی تو چھوڑ دیتا ہے، (صحیح البخاری: 7492)۔“

۳۔ روحانی ارتقاء اور ضبط نفس کی تربیت:

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے سال میں ایک مہینہ ایسا مقرر فرمایا، جس میں ایک طرف تو روزے کے ذریعے ضبطِ نفس کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ مادیت کا انسان پر غلبہ نہ ہو اور انسان مخفی خواہشات و شہوات کا بندہ بن کر نہ رہ جائے، کھانے پینے اور جنسی عمل پر

محروم وقت کے لیے پابندی اس بات کی تمہید ہے کہ انسان ہمیشہ اور ہر قت اپنے آپ کو ممنوعات و سرمات شرعیہ سے اجتناب کا پختہ عادی بنالے، یہ اس کا سلسلی (Negative) پہلو ہے، مثبت (Positive) پہلو یہ ہے کہ فرائض کے علاوہ روزانہ ۲۰ رکعات تراویح پڑھنے کی ترغیب دے کر اور تراویح میں اور بیرون نماز تلاوت قرآن کے انوار و برکات سے تکوب واذہان کو منور فرما کر روحانی ارتقاء کا موقع فراہم کیا۔ صدقہ فطر اور دیگر مالی صدقات کی ترغیب دے کر انسان میں یہ وصف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اپنا تن من دھن سب کچھ اللہ کی رضا کے لیے قربان کرنے کے لیے تیار ہے اور ظاہر ہے کہ اس روحانی فضایا ایمان افروز اعمال کے اثرات رمضان کے بعد بھی دیر تک قائم رہتے ہیں۔

انسانی ہمدردی کی ترغیب و تحریض:

روزے کے ذریعے بھوک و پیاس کی مشقتوں سے ان لوگوں کو بھی آشنا کیا گیا ہے، جو عام دنوں میں آسودہ حالی اور فارغ البالی کی وجہ سے ان سے بہت کم دور چار ہوتے ہیں، انھیں اس کا عملی تجربہ کرایا گیا ہے کہ جب وہ روزہ رکھ کر بھوک پیاس کو برداشت کریں گے تو انہیں معاشرے کے ان محروم افراد اور طبقات کی مشکلات و مصائب کا اندازہ ہو گا جو سال بھر غیر اختیاری اور اخطرابی طور پر بھوک و پیاس کی مشقتوں سے دو چار رہتے ہیں۔ گویا اسلام نے یہ چاہا ہے کہ انسان اس اختیاری تجربے سے گزر کر دوسرے محروم افراد کی تکالیف کا احساس کر کے اس کے ازالے کی سعی کرے، اگر اللہ نے اسے مالی توفیق دی ہے تو ان کے درد و کرب اور آلام و مصائب کا ادراک کر کے ان سے عملی ہمدردی و غمگشایی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں ماہ رمضان کو ”شہرُ المُؤْسَاتَة“، ہمدردی و غمگشایی کا مہینہ فرمایا گیا ہے، (منخارث: 321، شعب الایمان: 3336)۔

حج

حج کا معنی و مفہوم:

حج کے لفظی معنی ہیں: ”قصد وارادہ“، ”الْحِجَّةُ“، حج کا اسم بھی ہے اور اس کے معنی ”سال“ کے بھی ہیں، اسی مناسبت سے حج والے میں کو ”ذِئْنُ الْحِجَّةِ“ کہتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں حج سے مراد: ”عبادت کی نیت سے حج کے دنوں میں بیت اللہ کی زیارت کو جانا اور مناسک حج ادا کرنا ہے۔“

حج ۹۰ ہجری میں فرض ہوا، اس سال حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق حج کرایا اور ۱۰۱ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے حج کیا اور اس کا نام حجۃ الوداع رکھا گیا۔ سب مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ حج ہر عاقل و بالغ اور صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے، اگرچہ ایک سے زائد مرتبہ حج کرنا اجر و ثواب اور سعادت کا باعث ہے۔

استطاعت سے مراد:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَإِلَهُ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا“۔ ترجمہ: ”بیت اللہ کا حج کرنا ان لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس کے راستے کی استطاعت رکھتے ہوں، (آل عمران: 97)۔“

استطاعت سے مراد:

(الف) آدمی کا جسمانی طور پر سفر حج کے قابل ہونا، لہذا ایسا مخذول یا اپینا جو خود سفر کے قابل نہ ہو اور اسے معاون بھی میسر نہ ہو، اس پر مالی استطاعت کے باوجود حج فرض نہیں ہے۔

(ب) سفر حج کے اخراجات اور اپنے زیر کفالت افراد کا حج کے دوران نان نفقہ میسر ہونا۔

(ج) راستے کا مامون و محفوظ ہونا۔

(د) عورت کے لیے شوہر یا محرم کی رفاقت بھی فرضیت حج کے لیے لازمی شرط ہے، محرم کے

بغیر اس کا سفر حج اور کسی بھی سفر پر جانا شرعاً جائز نہیں ہے۔

ایام حج سے مراد ۸ تا ۱۳ ذوالحجہ کے وہ ایام ہیں جن میں مناسک حج کو ادا کیا جاتا ہے، حج کا اصل دن ۹ ذوالحجہ ہے، قرآن میں "الْحَجَّ أَشْهُرٌ مَعْلُومٌ" کے الفاظ بھی آئے ہیں جس سے زمانہ حج کے تین ماہ شوال، ذی القعڈہ اور ذی الحجه مراود ہیں۔

حج کی اقسام:

حج تین طرح کا ہوتا ہے: (۱) یہ کہ صرف حج کی نیت کرے، اس کو "حج افراد" کہتے ہیں، (۲) یہاں سے عمرے کی نیت کرے اور مکہ معظمہ میں حج کا احرام باندھے، اسے "حج تمثیل" کہتے ہیں، (۳) حج اور عمرہ دونوں کی ایک احرام میں نیت کرے، اس کو "حج قرآن" کہتے ہیں اور یہ سب سے افضل حج ہے۔

اصطلاحات کی تشریح

احرام:

اس سے مراد درحقیقت حج کی باقاعدہ نیت ہے، جس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ غسل کر کے سلا ہوا بس اتارے اور دو چادریں، ایک تہبند اور ایک اوڑھنے کی چادر پہن کر احرام کے دو نفل پڑھے اور پھر "تلبیہ" پڑھے جو کہ حسب ذیل ہے:

"لَبَيِّكَ اللَّهُمَّ لَبَيِّكَ، لَبَيِّكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَيِّكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ، لَا شَرِيكَ لَكَ"

ترجمہ میں حاضر ہوں، اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بلاشبہ حمد کا سزاوار تو ہی ہے، سب نعمتیں تیری ہیں اور حقیقی بادشاہت تیری ہے، تیرا کوئی شریک نہیں،"

میقات:

میقات سے مراد وہ مقام ہے جہاں سے حاجی کے لیے بغیر احرام گزنا جائز نہیں ہے، اس مقام سے پہلے بھی احرام باندھا جا سکتا ہے۔

طواف:

بیت اللہ کا طواف (سات چکر لگانا) حج کا ایک اہم مقصد ہے، ”طواف زیارت“ یعنی، اذوالحجہ کو قربانی کے بعد احرام کھول کر بیت اللہ کا طواف کرنا حج کا ایک اہم رکن ہے، اس کے علاوہ سب سے پہلے حدود حرم میں داخل ہونے پر جو طواف کیا جاتا ہے، اسے طواف قدوم” اور بیت اللہ سے رخصت ہوتے وقت جو طواف کیا جاتا ہے، اسے ”طواف وداع“ کہتے ہیں۔

سمی:

صفا اور مروہ کے درمیان سمی (سات چکر لگانا) لگانا عمرہ اور طواف زیارت کا ایک اہم رکن ہے۔

وقوف عرفہ:

یعنی ۹ ذوالحجہ کو میدان عرفات میں اجتماع اور حاضری خواہ تھوڑی ہی دیر کے لیے ہو، یہی حج کا ”رکن اعظم“ ہے، خدا نخواستہ یہ فوت ہو جائے تو اس کا کوئی تدارک نہیں۔

رمی جمرات:

۱۰ تا ۱۲ یا ۱۳ ذوالحجہ علامتی شیاطین کو کنکریاں مارنا۔

نحر اور حلق:

اذوالحجہ کو منی کے مقام پر ”رمی جمرات“ کے بعد قربانی کرنے کو نحر کہتے ہیں اور مر کے بال منڈانے یا کترانے کو حلق کہتے ہیں، اس سے احرام کھل جاتا ہے، جسے فقہی اصطلاح میں حلال ہونا (یعنی احرام کی پابندیوں سے نکل آنا) کہتے ہیں۔

زیارت روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

روضہ رسول کی زیارت اگرچہ حج کا باقاعدہ رکن نہیں ہے، لیکن حج کے موقع پر بارگاہ نبوت میں حاضری ہمیشہ سے مسلمانوں کا معمول رہا ہے اور کوئی صاحب عقیدت و محبت

مسلمان اس سے بھروسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور احادیث میں بھی اس کی فضیلت آئی ہے، چند احادیث مبارکہ درج ذیل ہیں:

(۱) "مَنْ زَارَ قَبْرِيَ بَعْدَ مَوْتِ كَانَ كَمْ زَارَنِيَ حَيَاً"۔

ترجمہ: "جس نے میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی، تو اسے وہی سعادت نصیب ہو گی جیسے اس نے میری حیات میں زیارت کی ہو، (ابن القبیر: 13496)"۔

(۲) "مَنْ زَارَ قَبْرِيَ وَجَبَثَ لَهُ شَفَاعَةً"۔

ترجمہ: "جس نے میری قبر کی زیارت کی اُس کی شفاعت مجھ پر لازم ہے، (دارالطنی: 2695)"۔

(۳) "مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزْرِنِ قَقَدَ جَفَانِ"۔

ترجمہ: "جس نے حج کی اور میری زیارت نہ کی تو اس نے مجھ سے جفا کی"۔

حج کی اہمیت:

حج اسلام کا ایک اہم رکن ہے، حج کی فرضیت کا اعلان قرآن پاک میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"وَإِلَهٌ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ عَنِ الْعَلَمِينَ"۔

ترجمہ: "اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ ہر وہ شخص بیت اللہ کا حج کرے جو زادراہ کی طاقت رکھتا ہو اور جس نے (اللہ کی دی ہوئی استطاعت کے باوجود حج نہ کیا اور) کفر کیا تو یقیناً اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے، (آل عمران: 97)"۔

رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ مَلَكَ زَادَا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلَى بَيْتِ اللَّهِ وَلَمْ يَحْجُّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصَارَائِيًّا"۔

ترجمہ: "جو زادراہ پر قدرت رکھتا ہو، بیت اللہ تک پہنچنے کی سواری بھی اسے میسر ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو

کرمے، (سنن ترمذی: 812)۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے:

”جو لوگ استطاعت کے باوجود حج نہ کریں، میرا جی چاہتا ہے کہ ان پر جزیہ (غیر مسلموں پر جو نیکس لگایا جاتا ہے) لاگادوں“۔

مذکورہ آیت اور احادیث سے معلوم ہوا کہ حج اسلام کا اتنا ہم رکن ہے کہ جو مسلمان استطاعت رکھتے ہوئے بلا عذر اسے چھوڑ دیتا ہے، اس کا دین و ایمان مشتبہ ہے، کیونکہ عملاً اس میں اور ایک کافر، یہودی یا عیسائی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص اللہ کی نظر رحمت اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شفقت سے محروم رہتا ہے جو مسلمانوں اور مونموں کے لیے خاص ہے۔

شریعت میں اس امر کو مستحسن قرار دیا گیا ہے کہ مسلمان پر جیسے ہی حج فرض ہو اُسے ادا کرنے میں تاخیر نہ کرے، کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور اگر بد قسمتی سے ادا نہ کر سکے اور موت آجائے تو اپنے ورثا کو وصیت کر جائے کہ اس کی جگہ کوئی شخص یہ فریضہ ادا کر دے، اسے ”حج بدل“ کہتے ہیں، ویگر عبادات میں ایسی نیابت کا صریح حکم نہیں ہے۔

حج ۹۶ کو فرض ہوا، اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود حج پر تشریف نہیں لے گئے، بلکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حج کا امیر مقرر فرمایا۔ ۱۰۰ کو آپ نے اپنی حیات مبارکہ کا پہلا اور آخری حج ادا فرمایا جسے ”حجۃ الوداع“ کہتے ہیں اور اس موقع پر آپ نے تاریخی خطبہ حج ارشاد فرمایا جو ہتھی دنیا تک تمام بی نوع انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

حج کے مقاصد اور حکمتیں

”حج“، ویگر ارکانِ اسلام کی طرح مختلفے خوف مقصود بالغذات امر ہے اور ان ارکانِ اسلام اور عبادات کی ادائیگی کا مقصد ان فوائد اور منافع کا حصول نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی برکت اور فیض سے یہ مقاصد اور روزخانی فوائد اللہ رب العرث خود رحمت فرماتا

ہے، حج کی حکمتیں عقل میں آتی ہیں، مختصر اور حذیل ہیں:

۱۔ ذریعہ مغفرت و نجات:

حج کا اہم ترین فائدہ اور برکت گناہوں کی آلوگی سے نجات ہے، بشرطیہ کی کوئی حج کامل نصیب ہو جائے، جسے اصطلاح حدیث میں "حج مبرور" کہتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشاد ہے:

"مَنْ حَجَّ إِلَيْهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيْوَمِ وَلَدَتَةً أُمَّةٍ"۔

ترجمہ: "جس نے حج کی اور اس میں شہوت رانی اور نافرمانی۔ مکمل طور پر بچارہ اتوہ گناہوں سے ایسا پاک و صاف ہو کر لوٹے گا جیسا اپنی پیدائش کے روز اول گناہوں سے پاک تھا، (صحیح البخاری: 1521)"۔

اس سے بڑے فائدے کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ چند ایام کی عبادت ریاضت سے زندگی بھر کے گناہوں کی آلاشیں اور میل کچیل دھل جائے اور وہ طیب و طاہر ہو جائے، ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا:

"الْحَجُّ الْمُبُدُّوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ"۔

ترجمہ: "حج مبرور (قبول شدہ حج) کی جزا صرف جنت ہے، (سنن نسائی: 2622)"۔

۲۔ اسلامی وحدت میں کاظم مظاہرہ:

حج حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدا مجدد حضرت ابراہم علیہ السلام کی عظیم یادگار ہے۔

حضرت ابراہم علیہ السلام کی شخصیت "مرکَّنُ الْمُنَلَّ" ہے، آج بھی مسلمانوں کے علاوہ یہود و نصاریٰ اپنے آپ کو ان سے منسوب کرتے ہیں اور ان کو ملت کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

حج کے موقع پر مسلمانانِ عالم ملک ملک، قریے قریے اور بستی بستی سے وارثتگی کے عالم میں کشاں کشاں بیت اللہ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں، ان کا ملکی و قومی تشخص الگ الگ ہوتا ہے، ان کا لباس الگ الگ، رنگ جدا جدا، زبان اپنی اپنی، لیکن یہاں آکر سب

اپنے اپنے امتیازات کو چھوڑ کر ایک ہی لباس فقیرانہ اختیار کر لیتے ہیں۔ امیر و غریب اور شاہ

وگدا میں کوئی تمیز نہیں رہتی، عربی و فارسی، ایشیائی و افریقی، کالے اور گورے ایک ہی صفت میں
کھڑے نظر آتے ہیں، ایک ہی زبان میں، ہمارے نبی کی پیاری زبان میں، اللہ کے حضور
اپنی حاضری اور عاجزی و انکسار کا اظہار کرتے ہیں، بتان رنگ و خون کو توڑ کر ایک ہی "ملتِ
ابراہیم" میں جذب ہو جاتے ہیں۔ وحدتِ انسانی اور وحدتِ ملی کا یہ عظیم منظر صرف اور
صرف اسلام کا خاصہ اور امتیاز ہے، دنیا کے کسی اور مذہب میں اس کی نظریہ صونڈنے سے نہیں
ملے گی اور جو جذبہ انھیں سمجھا کرتا ہے وہ دنیوی، مادی سیاسی اور معاشی نہیں ہے، بلکہ دینی
جذبہ ہے، ذوقِ عبادت اور شوقِ نیازمندی ہے۔

۳۔ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا بے ساختہ اظہار:

حجِ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا بے ساختہ اظہار ہے، جس میں والہانہ پن،
دیوانگی، عشق کی وارثتگی، فریفگی اور شیفتگی ہے۔ ایک حاجی اپنا گھر بار، کاروبار، اہل و عیال،
قبيلہ و خاندان سب کچھ چھوڑ کر اللہ پر توکل کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔
وقتی طور پر تمام رشتؤں، نسبتوں، انسانی و مادی تعلقات اور روابط کو ترک کر کے اللہ اور اس
کے رسول مکرم ﷺ کی نسبت کو مسحکم کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ شیطانوں کو
کنکریاں مارنا، ایک لق و دق میدان میں مقررہ تاریخ پر جمع ہو جانا، بیت اللہ کا دیونہ وار
طواف کرنا، صفا و مرودہ کے درمیان سعی کرنا اور ایک فقیرانہ و درویشانہ لباس میں ملبوس ہو جانا
اظہران سب امور کی کوئی عقلی توجیہہ و تاویل ممکن نہیں ہے، سوائے اس جذبہ محبت کے جو
اپنے اظہار کے لیے کسی ضابطے، کسی لگے بندھے قاعدے، کلیے اور رسم کا پابند نہیں ہے،
عشق و محبت تو بس مرضی محبوب پر سب کچھ لٹادیئے کا نام ہے، محبوب کا حکم بجالانے کا نام
ہے، عقل نہ تو عشق کے پاؤں کی زنجیر بن سکتی ہے اور نہ عشق کی منزلوں میں ساتھ دے سکتی
ہے، بقول علامہ اقبال:

بے خطر کو دپڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے جو تماثلے لب بام ابھی!

نوت:- حج عربی زبان کا لفظ ہے اور عربی میں حج کرنے والے مرد کو " حاج" اور عورت کو حاجہ کہتے ہیں، ہمارے ہاں اردو میں حاجی اور حاجیانی و حاجن کے کلمات غلط عام کے طور پر مستعمل ہیں۔

۲- حج کی شان جامعیت:

حج ایک ایسی عبادت ہے، جس میں تمام عبادات کی حقیقی اور بھر پور جھلک نظر آتی ہے، ہر عبادت کا جو ہر اور روح اس میں زندہ و تابندہ نظر آتی ہے، اس میں نماز بھی ہے، روزے کا مجاہدہ اور مشقت بھی ہے، زکوٰۃ سے بدر جہاز انہ مالی ایشار بھی ہے، جہاد کی طرح ایک سپاہیانہ زندگی کی جھلک بھی ہے۔

جہاد

جہاد کا معنی و مفہوم

جہاد کا لفظ "جُہد" سے بنा ہے، اس کے معنی ہیں: محنت، سعی اور مشقت۔ جہاد کے معنی "انہائی کوشش" کسی کام یا مقصد کے لیے اپنی پوری توانائی اور صلاحیت کو صرف کرنا بھی ہیں۔

اسلامی اصطلاح میں جہاد کے معنی ہیں: "اللہ کے دین کی سر بلندی، حمایت اور مدافعت کے لیے تن من وہن کی بازی لگادینا، بشرطیکہ ان مساعی سے صرف اور صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہو۔ یعنی جہاد سے صرف دشمن سے مسلح جنگ ہی مراد نہیں ہے، بلکہ یہ ایک جامع، ہمسہ گیر اور ہمہ وقتی جہد و عمل، مساعی اور کاوشوں کا نام ہے اور "مسلح" جہاد اس کا صرف ایک شعبہ ہے۔

اسلام کے معنی ہیں: "امن، آشتی اور سلامتی" یعنی اصولی طور پر اسلام ایک ایسا دین ہے جو امن و آشتی اور سلامتی کا علمبردار ہے، لیکن تاریخ انسانی، اقوام عالم کے عروج و زوال اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اس نتیجے تک پہنچنے میں کوئی وقت پیش نہیں آتی کہ امن و آشتی اور سلامتی کے حصول کیلئے امن پسند اقوام کا اتنا طاقتور ہونا ضروری ہے کہ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے اور اس کے سکون کو درہم برہم نہ کر سکے۔ دور حاضر کی متعدد، جدید ترین اور طاقتور ترین اقوام بھی اس فلسفے کی قائل ہیں اور اسی پر

کاربند ہیں، مشہور مقولہ ہے:

"ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَأَعْدُوا لَهُم مَا أَسْتَكْعِنُمْ قِنْقُوَةً"۔

ترجمہ: "ان کے لیے مقدور بھر قوت و طاقت جمع کرو، (الانفال: 60)"۔

اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ مسلمان کو طاقت کی پوزیشن میں رہ کر امن و سلامتی کو پورے تحریک، تیقین اور صداقت کے ساتھ نافذ کرنا چاہیے نہ کہ کمزور پوزیشن میں رہ کر امن کی بھیک مانگنی چاہیے، قرآن و حدیث میں سیف و سنان اور گھوڑوں وغیرہ کا تذکرہ ہر دور کے جدید ترین اور موثر ترین آلات حرب سے استعارہ ہے۔

لیکن مسلمان اور کافر کے نظریے اور سوچ میں بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ کافر ظاہری اسباب و وسائل پر کلی اعتبار کرتا ہے اور مسلمان تمام تر ممکنہ مادی اسباب و وسائل کو اختیار کرنے کے باوجود اپنی قوت بازو پر نہیں، بلکہ اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرتا ہے، بقول اقبال:

کافر ہے تو شمشیر پر کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تنقی بھی لڑتا ہے سپاہی

اس لیے قرآن نے فرمایا:

”إِنْفِرُوا إِخْفَافًا وَثِقَالًا“

ترجمہ: ”مکے ہو یا بوجھل (اللہ کی راہ میں) نکل کھڑے ہو، (التوبہ: 41)“

ہلکا ہونا وسائل کے نہ ہونے یا وسائل کی کمی کی طرف اشارہ ہے اور بھاری ہونا، آلات حرب سے لیس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہ حقیقت مسلم ہے کہ آلات حرب کی اہمیت اپنی جگہ، مگر جذبہ جہاد، شوق شہادت اور اپنے مشن کی صداقت پر ایمان کا کوئی بدل نہیں، معرکہ بدر اس کا واضح ثبوت ہے۔

اسلام میں ”جہاد“ کے احکام مدینۃ منورہ میں ۲ ہجری میں نازل ہونا شروع ہوئے جب کہ مسلمان اس قابل ہوئے کہ اللہ کے دین کا دفاع کر سکیں اور پھر سلسلہ غزوات و سرایا شروع ہوا اور جلد ہی وہ وقت آگیا کہ سرز میں عرب سے کفار و مشرکین کا نام و نشان مت گیا اور مختاچلا گیا۔

جہاد کی مختلف صورتیں یا قسمیں

۱۔ جہاد بالنفس:

اس سے مراد اپنے نفس کی خواہشات باطلہ کے خلاف جہاد کرنا ہے، یہ ایک طرح کا داخلی جہاد ہے، گویا نفس کی باطل خواہشات کو قابو میں رکھنے اور نفس امارہ کے منہ زور گھوڑے کو شریعت کی لگام دینے کا نام ہے، یہ ایک مشکل اور ہمہ وقتی جہاد ہے، اسی لیے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسے ”جہادِ اکبر“ فرمایا ہے، نبی کریم ﷺ جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو فرمایا:

”رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ“

ترجمہ: ”ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوئے ہیں۔“

چھوٹے جہاد سے مراد کفار سے جہاد کرنا ہے اور بڑے جہاد سے مراد نفس اور اس کی خواہشات کے خلاف جہاد کرنا ہے، (تفہیر بغوی: ج: 3، ص: 354)۔

کیونکہ باہر کے شیطان کو سنگار کرنا نسبتاً آسان ہے اور اندر کے شیطان کی طرف کنکر پھینکنا ذرا مشکل ہے، قرآن میں اس مفہوم کی جانب اشارات موجود ہیں، ارشادِ بانی ہے:

”وَجَاهُدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ“ -

ترجمہ: ”اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ اس کا حق ہے، (الجع: 78)۔“

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

”وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِي نَحْنُ نَهْدِيَنَّهُمْ سُبْلًا“ -

ترجمہ: ”جو ہماری محبت میں سرشار ہو کر بھرپور جہاد کرتے ہیں، انھیں ہم اپنی (معرفت کی) راہ میں دکھادیتے ہیں، (العنکبوت: 69)۔“

ایک حدیث میں غیظ و غصب کے عالم میں نفس پر قابو پانے والے کو آپ نے حقیقی پہلوان قرار دیا ہے۔

۲۔ جہاد باللسان والقلم یا جہاد بالعلم:

اس سے مراد فواحش و منکرات کے خلاف زبان اور قلم سے جہاد کرنا ہے، اس کی

متعدد صورتیں ہیں، مثلاً:

(۱) دلائل حقہ سے باطل پر اسلام کی حقانیت اور برتری کو ثابت کرنا، باطل عقائد و نظریات کے بودے پن کو دلائل سے ثابت کر کے اس کا رد کرنا جس کے لیے قرآن میں اللہ کا فرمان ہے:

”وَجَادَهُمْ بِالْقِيَّٰ هٰىءَ أَحَسَنُ“۔

ترجمہ: ”اور احسن طریقے کے ساتھ ان پر حجت قائم کیجیے، (النحل: 125)۔“

اور ارشاد فرمایا:

”فَلَا تُطِعِ الْكُفَّارِينَ وَجَاهُهُمْ بِهِ جَهَادًا كَيْرًا“۔

ترجمہ: ”اور کافروں کی نہ مانیے اور اس کی (قرآن کی حقانیت و صداقت) کے ذریعے ان سے بڑا جہاد کیجیے، (الفرقان: 52)۔“

یہ جہاد زبان سے بھی ہو سکتا ہے اور تحریر کے ذریعے بھی۔

(۲) معاشرے میں منکرات اور برائیوں کے فروغ کو روکنے اور اس کے سد باب کے لیے وعظ و نصیحت اور تبلیغ کے ذریعے فضا کو سازگار بنانا حسنات کو فروغ دینا اور اس مقصد کے لیے زبان و بیان اور تحریر کی صلاحیتوں کو کام میں لانا، اس سلسلے میں حدیث ہے:

”مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُعْزِّزْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يُسْتَطِعْ فَلِلِسَانِهِ“۔

ترجمہ: ”تم میں سے جو شخص برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہیں تو زبان سے روکے، (صحیح مسلم: 49)۔“

اگر اس برائی کا تعلق اہل اقتدار سے ہے، تو اس صورت میں حق بات کرنا بہترین جہاد قرار دیا گیا ہے، اسی کے متعلق حدیث میں آیا ہے:

”أَقْسَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ“۔

ترجمہ: ”بہترین جہاد جابر یا ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے، (ابوداؤد: 4344)۔“

۳۔ جہاد بالمال:

اس سے مراد اللہ کے دین کی سر بلندی، اشاعت اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے مالی وسائل کو بروئے کار لانا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”جَاهِدُوا إِيمَانَكُمْ وَأَنفُسَكُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ“۔

ترجمہ: ”اور اپنی جان و مال سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو، (التوبہ: 41)۔“

سورۃ الحجرات میں ارشادر بانی ہے:

”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ لَمْ يَرْتَبُوا وَجَهَدُوا إِيمَانَهُمْ وَأَنفُسَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ أَوْ لِئِكَ هُمُ الصَّابِرُونَ“۔

ترجمہ: ”مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر کسی قسم کے بھگ و شہبے میں بتلانہ ہوئے اور اللہ کی راہ میں اپنی جاتوں اور مالوں سے (قربانی دے کر) جہاد کیا یہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں، (الحجرات: 15)۔“

۴۔ جہاد بالسیف:

اس مراد اللہ کے دین کی حمایت و نصرت اور اسلام و مسلمانوں کی مدافعت اور باطل و اہل باطل کے استیصال و سرکشی کے لیے تمام مادی وسائل، آلات حرب اور اساباب جنگ کے ساتھ میدان میں آنا اور اپنی جان کی بازی لگادینا، اس جہاد میں چونکہ مومن مجاهد اپنی قیمتی متعاقع یعنی جان کا نذر رانہ لے کر اپنے رب کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے، اس لیے اس کی فضیلت بھی بہت ہے اور صلہ بھی سب سے بڑا اور عالیٰ ہے۔

قرآن و حدیث میں عام طور پر جہاد کی جو آیات و احکام ہیں، وہ اسی نوع جہاد سے متعلق ہیں، قرآن میں اس کے لیے عام طور پر ”قاتل فی سبیل اللہ“ (بصورت شہادت) اور ”قاتل“ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، بعض مقامات پر لفظ جہاد بھی استعمال ہوا ہے،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”يَا إِيَّاهَا النَّبِيُّ حَرِّضْ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ“ -

ترجمہ: ”اے رسول! مونوں کو جنگ پر ابھاریے، (الانفال: 65)“ -

ایک اور مقام پر فرمایا:

”أَلَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الظَّاغُوتِ“ -

ترجمہ: ”مؤمن اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں، (النام: 76)۔“

اور اس جہاد کو اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم ہے، جب تک اس فتنے کا استیصال اور مکمل خاتمه نہ ہو جائے، جو اس کا باعث بنا اور اللہ کا دین غالب آجائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَقِتِلُوكُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيُكُونَ الَّذِينُ يُلْهُ“ -

ترجمہ: ”اور ان (کفار و مشرکین) سے اس وقت تک جنگ کرو کہ فتنے کا نام و نشان نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے، (البقرہ: 193)“ -

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات گرامی یہ ہیں:

(۱) ”مَنِ اغْبَرَتْ قَدَمَاهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَرَّمَهُ اللَّهُ عَلَى النَّئَارِ“ -

ترجمہ: ”جس شخص کے قدم را خدا میں جہاد کرتے ہوئے غبار آلود ہو جائیں، اُسے جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی، (صحیح البخاری: 907)“ -

(۲) حضرت عبد اللہ بن ابی اوفر روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّبُوفِ“ -

ترجمہ: ”جنت تکواروں کے سائزے تلے ہے، (صحیح البخاری: 2818)“ -

(۳) اللہ کی راہ میں جہاد اور پھرے داری کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

”رِبَاطٌ يَوْمَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ يَوْمٍ فِيمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَنَازِلِ“ -

ترجمہ: "اللہ کی راہ میں ایک دن مصروف جہاد رہنا دوسرے مقامات پر گزارے ہوئے ہزار دنوں سے بہتر ہے، (سنن ترمذی: 1667)۔"

اگر اس جہاد میں انسان اپنی جان "جان آفرین" کے سپرد کر دے، اللہ کی راہ میں "نذرانہ جان" پیش کر دے، تو اُسے شہید کہتے ہیں۔ قرآن نے فرمایا کہ شہید مرنا نہیں، بلکہ حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ شہادت اللہ کے بندے کی اعلیٰ ترین قربانی ہے، جس سے بڑھ کر کسی ایثار و قربانی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اس لیے حدیث میں آیا ہے کہ جنت میں جانے کے بعد کوئی بھی شخص دنیا میں لوٹ کر جانا پسند نہیں کرے گا سوائے شہید کے، جسے یہ تمنا ہوگی کہ وہ بار بار دنیا میں جائے اور اللہ کی راہ میں نذرانہ جان پیش کرے، یعنی "لذتِ شہادت" جنت کی تمام لذتوں سے اعلیٰ ہے۔



اہم سوالات

عقائد

توحید:

- ۱۔ وجود باری تعالیٰ کو عقلی دلائل سے ثابت کیجئے۔
- ۲۔ "عقیدہ توحید" سے کیا مراد ہے، قرآن کی روشنی میں تفصیل سے تحریر کیجئے۔
- ۳۔ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر عقیدہ توحید کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ بیان کیجئے۔

نبوت و رسالت

- ۱۔ ضرورتِ نبوت پر ایک نوٹ لکھیے۔
- ۲۔ منصبِ نبوت کی خصوصیات تحریر کیجئے۔

۳۔ ایمان بالرسول ”کے تفاصیل کیا ہیں، بیان کیجیے۔

۴۔ ختم نبوت پر ایک نوٹ لکھیے۔

آخرت

۱۔ ”اسلامی عقیدہ آخرت“ سے کیا مراد ہے، قرآن کے حوالے سے وضاحت کیجیے۔

۲۔ ”نظریہ جزا و سزا“ کو دلائل سے ثابت کیجیے۔

۳۔ آخرت کے بارے میں مندرجہ ذیل کا نقطہ نظر بیان کیجیے اور اسلام سے موازنہ کیجیے۔

ا۔ مادہ پرستوں یاد ہریوں کا نظریہ۔

ب۔ ہندوؤں کا نظریہ یا فلسفہ تناخ۔

ج۔ یہود و نصاریٰ کا تصور آخرت۔

۴۔ عقیدہ آخرت کے انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ بیان کیجیے۔

عبادات

نماز

۱۔ عبادات کے معنی و مفہوم بیان کیجیے اور اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت بیان کیجیے۔

۲۔ اسلام میں نماز کی اہمیت بیان کیجیے اور نماز کے روحانی اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی فوائد بتائیے۔

زکوٰۃ

۱۔ زکوٰۃ کے معنی و مفہوم بیان کیجیے اور اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت بیان کیجیے۔

۲۔ زکوٰۃ پر ایک جامع نوٹ لکھیے اور اس میں مندرجہ ذیل امور کی تشریح کیجیے۔

(ا) شرائط وجوب زکوٰۃ، (ب) نصاب زکوٰۃ، (ج) مستحقین زکوٰۃ

۳۔ زکوٰۃ کے اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی اثرات بیان کیجیے۔

روزہ

- ۱۔ روزے کے معنی و مفہوم اور اسلام میں روزے کی اہمیت بیان کیجیے۔
- ۲۔ روزے کے شرعی مقاصد بیان کیجیے۔
- ۳۔ روزے کے روحانی، اخلاقی اور معاشرتی فوائد بیان کیجیے۔

حج:

- ۱۔ حج کے معنی و مفہوم بیان کیجیے اور اسلام میں حج کی اہمیت بیان کیجیے۔
- ۲۔ ”حج جامع العبادات ہے“، اس پر نوٹ لکھیے۔
- ۳۔ حج کے دینی، روحانی، معاشرتی اور سیاسی فوائد اور حکمتیں بیان کیجیے۔

جہاد:

- ۱۔ جہاد کے معنی و مفہوم بیان کیجیے اور اسلام میں اس کی اہمیت بیان کیجیے۔
- ۲۔ جہاد کی مختلف صورتیں یا اقسام بیان کیجیے۔
- ۳۔ حالتِ جنگ میں، ”جہاد بالسیف“ اور حالتِ امن میں ”جہاد بالنفس“، افضل عبادات ہیں۔ بحث کیجیے، نیز بتائیے کہ حضور ﷺ نے کس چیز کو ”جہادا کبر“ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اُسوہ حسنہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی زندگی

ولادت سے پہلے دنیا کی حالت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے دنیا مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے تاریکی اور جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہود و نصاریٰ نے انبیاءؐ کرام علیہم السلام کی تعلیمات کو نہ صرف یہ کہ فراموش کر دیا تھا، بلکہ ان میں اس قدر رو و بدل اور تحریف کی جا چکی تھی کہ حقیقت تک رسائی ناممکن ہو چکی تھی۔ نصاریٰ تو حیدر کی بجائے تثلیث (Trinity) کے قائل ہو گئے اور مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، یہود کا ایک گروہ بھی غیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے کر ان کی عبادت کرتا تھا۔

ہندوستان میں شرک کا دور دوزہ تھا۔ دیوی، دیوتاؤں اور مظاہر کائنات کی پرستش ہوتی تھی، لوگ اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے بتوں کو پوچھتے تھے، انسانیت طبقات میں بھی ہوتی تھی، ذات پات اور اونچ نیچ کی تفریق کی وجہ سے انسانیت کی تزلیل ہو رہی تھی۔ بھی حال قرب و جوار کے دوسرے ممالک کا تھا۔ ایران میں بظاہر متمدن اور منظم حکومت قائم تھی مگر اخلاقی اور ذہنی پیشی کا عالم یہ تھا کہ وہ لوگ آگ کو پوچھتے تھے۔

عرب کا حال تمام دنیا سے بدتر تھا، یہ لوگ نسل ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نسبت رکھتے تھے اور مذہبی بھی اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا پیروکار سمجھتے تھے اور ملت ابراہیمی کی بعض رسوم مسخر شدہ شکل میں ان کے ہاں راجح تھی، قربانی، مہمان نوازی اور ایفا۔ عہد جیبی بعض خوبیاں عربوں میں رچی بھی تھیں، مگر جس اخلاقی تنزل، پیشی اور بر بادی کے دور سے وہ گزر رہے تھے، ان کے پیش نظر یہ خوبیاں بے اثر تھیں۔

مثلاً: بعض لوگ نگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے تھے اور تاویل یہ پیش کرتے تھے کہ جس لباس میں ہم گناہ کرتے ہیں، اس میں اللہ کے گھر کا طواف کیسے کر سکتے ہیں، خود بیت اللہ کو بت پرستی کا مرکز بنارکھا تھا اور اس میں ۳۶۰ بُت رکھے ہوئے تھے۔ بعض لوگ حالت سفر میں بھی آئے کے بت بنا کر اپنے ساتھ رکھ لیتے تھے۔ خاندانی اور نسلی تفاخر ان کے رُگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ سالانہ میلے منعقد ہوتے تھے اور ہر قوم اور قبیلے کے شعراً اپنی قوم کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے بلاستے، بدفالی لیتے تھے، جو اکھیتے تھے اور شراب پینا پلانا فیاضی میں شامل تھا۔ چوری چکاری عام تھی، لوث مار اور ڈیکھتی کو مردائی اور شجاعت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر جنگیں ہوتیں اور ان کا سلسلہ رسول جاری رہتا، بعض عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ قبر میں دفن کر دیتے تھے، اس کی چند وجہ تھیں:

- ۱۔ یہ کہ جنگ میں قید ہو کر ہمارے دشمنوں کے ہاتھ نہ آ سکیں۔
- ۲۔ اولاد کو نگی روزق کے خوف سے قتل کر ڈالتے تھے۔
- ۳۔ وہ اپنی بیٹی کا کسی کے عقد و نکاح میں آنا اپنے جا بلانہ تصور کے مطابق اپنے لیے باعث نگ دعا سمجھتے تھے۔

مدینے کے قریب خیر میں یہود و نصاریٰ آباد تھے۔ اہل کتاب ہونے کے باوجود ان کی حالت مشرکین عرب سے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ تورات و انجیل میں تحریف کرتے تھے، غریبوں پر شرعی احکام اور حدود نافذ کی جاتی تھیں اور امراء کے لیے قانون الہی میں روبدل کر دیا جاتا تھا۔

الغرض ایسے لوگوں کی تعداد آئے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی جو دین فطرت یا توحید کے قائل تھے۔ وہ بھی بالکل بے اثر اور گوشہ نگنامی میں تھے۔

ولادت سے بعثت تک کے واقعات:

نسب شریف: سیدنا محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب

بن مرہ بن کعب بن لوی بن فہر بن مالک بن نظر بن کناہ۔

آپ کا خاندان عرب کا مشہور اور معزز خاندان ہے۔ آپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں عدنان کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے سلسلہ نسب میں فہری نظر کا لقب قریش تھا اور ان کی اولاد قریشی کہلاتی اوان سے اور پر کے لوگ کنانی کہلاتے۔ آپ کے پانچویں دادا قصیٰ کعبہ کے متولی تھے۔ انہوں نے عربوں کو لا کر شہر مکہ میں آباد کیا اور قومی توعیت کے امور پر غور کرنے کے لیے مجلس مشاورت یا پارلیمنٹ ”دارالنحوہ“ قائم کیا۔ آپ کے بعد آپ کی اولاد کے پاس خانہ کعبہ کی تولیت (Trusteeship) اور خدمات کا اعزاز باقی رہا۔ قصیٰ نے کارہائے نمایاں انجام دیے مثلاً حاجج بیت اللہ کی خدمت، میزبانی کی خدمات وغیرہ، اسی لیے بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اولاً انہی کو ملا۔ بعد ازاں خدمت حرم کا یہ منصب جلیلہ نوبت بہ نوبت ہاشم کو منتقل ہوا۔ انہی کے زمانے میں قریش کو قیصر روم اور شاہ جہش (نجاشی) سے سفری تحفظ حاصل ہوا۔ انہوں نے ایک مرتبہ زمانہ قحط میں روٹیاں سالن میں چورا کر کے اور شرید بنا کر لوگوں کو کھلائیں جسے عربی زبان میں ”ہشم“ کہتے ہیں، اسی فیاضی کی نسبت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہو گیا۔

ہاشم کے انتقال کے بعد ان کی بیوی ”سلمیٰ“ کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ”شیبہ“ رکھا گیا اور ایک روایت کے بوجب آپ کا اصل نام ”شیبۃ الحمد“ تھا۔ چونکہ ان کے بھائی ”مطلوب“ نے ان کی پرورش و کفالت کی تھی، اس لیے ”عبدالمطلب“ کے نام سے معروف ہوئے۔ آپ کا ایک نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے چاہ زم زم کے آثار گم گشته کو دوبارہ دریافت کر کے کھد والیا اور اس کو مرمت کروایا۔ آپ ہو خد تھے، شراب وزنا کو حرام سمجھتے تھے، چور کا ہاتھ کاٹتے، لڑکیوں کے قتل سے منع فرماتے اور ننگے ہو کر طواف کرنے سے روکتے تھے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ:

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ طبعاً نہایت شریف اور صورتاً نہایت حسین تھے۔ اچھے

والر کی سب سے محبوب اولاد تھے، آپ کے والد حضرت عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ اگر وہ اپنے دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ان میں سے ایک کو راہ خدا میں قربان کر دیں گے، اللہ نے ان کی یہ آرزو پوری کی اور پھر وہ نذر پوری کرنے کے لیے سب بیٹوں کو لیکر بیت اللہ گئے اور پچھاری سے کہا: قر عمد الٰو۔ اللہ کی قدرت کے قر عمد حضرت عبداللہ کے نام نکلا، عبدالمطلب انہیں قربان کرنے کے ارادے سے آگے بڑھے مگر خاندان والوں نے منع کیا اور آخر کار ان کے بد لے سوانح قربان کیے، اس لیے رسول اللہ ﷺ اپنے آپ کو "ابنُ الذَّيْنَ حَيْنُ" (دو ذیحون یعنی اسماعیل علیہ السلام و عبداللہ رضی اللہ عنہ کافر زند) فرمایا کرتے تھے۔

بعد ازاں عبدالمطلب نے حضرت عبداللہ کا نکاح بوزہرہ کے سردار وہب بن عبد مناف کی پاک طینت صاحبزادی حضرت آمنہ سے کر دیا، وہ عفت و پاک دامنی، حسن و جمال اور صفاتِ حمیدہ میں یگانہ روزگار تھیں۔

ابھی سیدنا محمد ﷺ کے نور پاک کو اپنی والدہ ماجد حضرت آمنہ کے بطن پاک میں منتقل ہوئے دو ماہ ہوئے تھے کہ آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ اپنے والد کے نھیاں خاندان بنو عدی بن نجبار کے ہاں دوران سفر میں میں بیمار ہوئے اور وہیں وفات پا گئے اور دارِ نابغہ میں دفن ہوئے۔

ولادت باسعادت:

مشہور روایت کے مطابق واقعہ اصحاب فیل کے ۵۵ روز بعد ۱۲ ربیع الاول پیر کے روز صحیح صادق کے وقت آپ اس دارفانی میں جلوہ افروز ہوئے۔ ایسے عالم میں کہ رات کی سیاہی اپنا دامن سمیٹ رہی تھی اور پسیدی صح ضوء افشاری کے لیے اپنا نور پھیلارہی تھی، ایسا نور ہدایت اور آفتاب نبوت طلوع ہوا جو کبھی غروب نہ ہوگا۔ بعض محققین اور مؤرخین نے آپ کی تاریخ ولادت پیر ۹ ربیع الاول مطابق ۱۲۰ پر میل لے کر تحریر کی ہے۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ نے زمین پر آتے ہوئے دونوں ہاتھ میک

دیے، سر آسمان کی طرف اٹھایا، بدن سے تیز کستوری کی خوشبو آرہی تھی، ختنہ کیے ہوئے تاف بریدہ اور چہرہ مبارک چودھویں کے چاند کی طرح نورانی، آنکھیں قدرتی طور پر سرگمیں، دونوں شانوں کے درمیان مہربنوت تھی۔

آپ کی ولادت باسعادت کے وقت عجائبات و خوارق کا ظہور ہوا، ستارے تعظیم کے لیے جھک گئے، حرم پاک منور ہو گیا۔ سرز میں مکہ جگہاً اُٹھی، آپ کی آمد سے ایسا نور ظاہر ہوا کہ ملک شام کے محلات نظر آئے۔

بُت پرستی کا مرکز بھیرہ سادہ خشک ہو گیا۔ غرض کہ سارے عالم میں ہادی مطلق کے آنے سے جوانقلاب برپا ہونے والا تھا، اس کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ علامہ شبیلی نے خوب لکھا ہے: ”ایوان کسری نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم اور اوچ چین کے قصور ہافلک بوس ہو کر گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدہ کفر، آزر کدہ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ صنم خانے دیران ہو گئے، شیرازہ مجوسیت بکھر گیا تو حید کا غلغله اُٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی اور آفتاب ہدایت کی شعائیں ہر سو پھیل گئیں، آپ کا نام مباک حضرت عبد المطلب نے ”محمد“ صلی اللہ علیہ وسلم رکھا۔

رضاعت:

سب سے پہلے آپ کو آپ کی والدہ ماجدہ نے دودھ پلایا۔ پھر چند روز ابو لہب کی آزاد کردہ لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا اور پھر یہ اعزاز کا تب تقدیر نے حضرت حیمہ سعدیہ کے حصے میں لکھ دیا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق شرفاء کی اولاد کی طرح آپ کی تربیت بھی حیمہ سعدیہ کے ہاں خالص ”دیہاتی“ ماحول میں ہوئی تاکہ خالص عربی ماحول میں آئے اور فصاحت و بلاعثت کا فطری ملکہ پیدا ہو۔ ایک روایت کے مطابق آپ چھ برس تک حیمہ سعدیہ کے ہاں رہے اور وہاں آپ کے قیام کے دوران بہت سی برکات اور انوار و تجلیات کا ظہور ہوا۔ آپ کے رضاعی والد حارث بن عبد العزیز بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے، آپ اپنی رضاعی والدہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔

حضرت آمنہ کی وفات:

جب آپ کی عمر چھ برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ ماجدہ آپ کو لے کر آپ کے دادا کے تھیالی خاندان بنونجار میں گئیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کے اس سفر کا مقصد اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کرنا تھی۔ ہر کیف اس سفرے والپی پر مقام ”ابواء“ میں حضرت آمنہ کا انتقال ہو گیا اور وہیں مدفون ہو گئیں۔ آپ کی والدہ ام ایک آپ کو واپس مکہ مکرمہ لے کر آئیں۔

عبدالمطلب اور ابوطالب کی کفالت:

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کو اپنی آغوش تربیت میں لیا، مگر جب آپ کی عمر آٹھ برس ہوئی تو آپ کے دادا عبدالمطلب کا بیانی برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد آپ کے چچا ابوطالب آپ کی کفالت فرماتے رہے۔ انہوں نے کفالت و سرپرستی کا حق ادا کر دیا، ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور اپنی اولاد پر ترجیح دیتے۔

شام کا پہلا سفر:

جب آپ کی عمر بارہ سال ہوئی تو آپ اپنے چچا ابوطالب کے ہمراہ تجارتی سفر پر شام روانہ ہوئے۔ دوران سفر بصری کے موقع پر عیسائی راہب بھیڑانے آپ کو علامات سے پہچان لیا اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: یہ ”سید المرسلین“ ہیں، سارے جہاں کے سردار ہیں۔ چھرا ابوطالب سے کہا کہ تم انھیں واپس مکہ لے جاؤ درنہ یہودی انھیں قتل کر دیں گے۔ چنانچہ ابوطالب آپ کو شہر بصری سے واپس لے آئے۔ راہب کی بیان کردہ علامت میں مہربوت، درختوں اور پتھروں کے سجدہ ریز ہونے اور بادلوں کے سایہ کرنے کا ذکر ہے۔

حرب فیفار میں شرکت:

وہ جنگیں جو حرمت والے مہینوں (رجب، شوال، ذوالقعدہ اور ذی الحجه) میں لڑی جاتی تھیں، حروب فیفار کہلاتی تھیں۔ اس سلسلہ کی آخری جنگ حضور ﷺ کے زمانے میں لڑی گئی جو قریش و کنانہ اور ہوازن کے درمیان ہوئی۔ اس میں قریش کا سالار اعظم حرب بن

امیہ (حضرت امیر معاویہ کا دادا) تھا، تمام قبائل قریش اس میں شامل تھے اور بنو ہاشم کی قیادت آپ کے چچا زبیر کر رہے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر چودہ برس تھی، آپ اس میں شریک ہوئے مگر آپ نے خود کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور ایک روایت کی رو سے آپ اپنے چچاؤں کو تیراٹھا اٹھا کر دیتے تھے، اس جنگ میں قریش حق پر تھے، اس کا اختتام صلح پر ہوا۔

حلف الفضول:

حرب فبار سے واپسی پر آپ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے بنو ہاشم، بنو زہرہ اور بنو اسد کو اٹھا کیا اور عہد کیا کہ ہم ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کبا کریں گے اور مظلوم کا حق اُسے واپس دلائیں گے اور پھر ان لوگوں نے عاص بن واللہ بیدی کا غصب کردہ مال واپس دلا یا۔ اس معاهدے میں حضور ﷺ بھی شریک تھے اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے: ”اس معاهدے کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اوٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا اور اگر آج بھی کوئی مظلوم یا آل حلف الفضول کہہ کر پکارے تو میں اس کی مدد کو پہنچوں گا“۔ اس معاهدے کو حلف الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ اولاً اس معاهدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا ”فضل“، اُن کے نام کا حصہ تھا، مثلاً: فضل بن حارث، فضل بن وداعہ اور فضل بن فضالہ وغیرہ۔

شام کا درہ سرا سفر:

جب آپ کی عمر مبارک پچیس (۲۵) برس ہوئی تو آپ کی صداقت و امانت کی شهرت دور دور تک پھیل گئی اور اہل مکہ نے آپ کو ”صادق و امین“ کا لقب دے دیا تھا۔ اس نیک نامی سے متاثر ہو کر مکہ کی ایک پاک باز اور مالدار بیوہ خاتون حضرت خدیجہ نے آپ کو پیش کش کی کہ آپ ان کا مال تجارت لے کر شام جائیں، وہ آپ کو دوسروں کی نسبت دو گناہ معاوضہ دیں گی، آپ ﷺ نے یہ پیشکش قبول فرمائی۔ حضرت خدیجہ نے اپنا غلام میسرہ بھی آپ کے ہمراہ کر دیا، شام کے بازار بصری میں ایک راہب نسطور اکی خانقاہ کے قریب ایک درخت کے نیچے آپ آرام فرمائے۔

نطورا نے میرہ سے دریافت کیا کہ یہ درخت کے نیچے آرام کرنے والا کون ہے، اس نے جواب دیا یہ شخص حرم (مک) کا رہنے والا قریشی ہے۔ راہب نے کہا: اس درخت کے نیچے نبی کے سوا آج تک کوئی نہیں اترा، اس نے پوچھا: اس شخص کی دونوں آنکھوں میں سرخی ہے، میرہ نے ہاں میں جواب دیا، یہ سن کر راہب بولا یہ نبی ہیں اور خاتم الانبیاء ہیں، کاش میں ان کو پاؤں جب یہ معموث ہوں گے اور میرہ کو اُس نے حسن سلوک کی تاکید کی۔

جب آپ مکہ والیں پہنچے تو حضرت خدیجہ نے بالاخانے سے دیکھا کہ بادل آپ پرسایا کیے ہوئے ہیں، میرہ نے انھیں بتایا کہ میں نے سارے سفر کے دوران یہی حال دیکھا ہے اور راہب کا واقعہ بیان کیا، اس کے ساتھ ساتھ اس تجارت میں انھیں کئی گنازیادہ نفع ہوا۔

خدیجہ سے نکاح:

حضرت خدیجہ حضور ﷺ کی امانت و دیانت سے متاثر ہو چکی تھیں، وہ ایک بیوہ خاتون تھیں اور اپنے پا کیزہ کردار کی بناء پر ”طاهرہ“ کے لقب سے معروف تھیں۔ ان کی پہلی دو شادیاں بالترتیب ابوالله اور عتیق سے ہوئیں۔ ابوالله سے ان کے دوڑ کے ہند اور ہال ہوئے جو ظہور اسلام کے بعد شرف صحابت سے مشرف ہوئے اور عتیق سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ہند تھا، دونوں شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا، حضرت خدیجہ کا نسب پانچویں پشت میں جا کر حضور ﷺ سے ملتا ہے۔

خدیجہ نے آپ کو نکاح کا پیغام بھیجا جسے آپ نے قبول فرمایا، اس وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال اور آپ کی عمر مبارک پچیس ۲۵ سال تھی۔ خطبہ نکاح جناب ابو طالب نے پڑھا، پانچ سورہم مہر مقرر ہوا۔ حضرت خدیجہ کی زندگی میں حضور ﷺ نے اور کوئی شادی نہیں کی، آپ کی تمام اولاد انہی کے بطن سے تھی سوائے حضرت ابراہیم کے جو حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ۸ ہی میں پیدا ہوئے اور اہم میں انتقال فرمائے گئے۔

اولاد امداد:

نام زوجہ	نام اولاد	کیفیت
خدیجۃ الکبریٰ	قَاتِم	بچپن میں انتقال کر گئے
زینب		بعثت سے قبل پیدائش، ۸ھ میں انتقال
رقیہ		۲ھجری میں انتقال ہوا
زوجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما		
عبداللہ		بچپن ہی میں انتقال کر گئے
ام کلثوم زوجہ عثمان رضی اللہ عنہما		۹ھجری میں انتقال کر گئیں
فاطمہ زوجہ علی رضی اللہ عنہما		۱۱ھجری میں نبی ﷺ کے وصال کے ۶ ماہ بعد انتقال کر گئیں
ماریم قبطیہ (مقدس باندی)	ابراهیم	بچپن میں انتقال کر گئے

تعمیر کعبہ:

جب حضور ﷺ کی عمر ۳۵ برس ہوئی تو آپ نے کعبۃ اللہ کی تعمیر میں حصہ لیا۔ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کو تعمیر کیا تھا، عمارت پر چھت نہیں تھی۔ بعد میں مختلف ادوار میں تعمیر نو ہوتی رہی۔ حضور ﷺ کے جدا مجددی نے بھی عمارت کی تجدید کی، مگر نشیب میں واقع ہونے کی بناء پر اکثر عمارت سیلاں کی زد میں آیا کرتی تھی، چنانچہ اس زمانے میں بھی عمارت میں شگاف پڑ گیا تو قریش نے تعمیر نو کا فیصلہ کیا۔

تمام قبائل قریش اس میں شریک ہوئے۔ تعمیر کے لیے کعبہ کے مختلف اطراف قبائل میں تقسیم کر دی گئیں، حضور ﷺ نے بھی اس میں شرکت فرمائی۔ آپ اپنے چچا عباس کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے اور اجیاد کی جانب سے پتھر اٹھا کر لاتے تھے، مگر جر اسود کی

تھیب کا مرحلہ آیا تو قبائل قریش میں اختلاف اٹھ کھڑا ہوا اور ہر قبیلہ نے چاہا کہ وہ اسے نب کرے گا، چنانچہ خون خرابے تک نوبت آگئی۔ بنو عدی اور بنو عبد الدار نے پیالے میں خون بھر کر اس میں انگلی ڈبو کر چاٹ لی جسے "لعقة الدم" کہتے ہیں۔ یہ زمانہ جاہلیت میں مرنے والے اور جان کی بازی لگادیئے کا عہد اور قسم ہوتی تھی۔ آخر کار ابو میری بن مغیرہ نے، جو بڑا تجربہ کا رہا اور نہایت سمجھدار شخص تھا، تجویز پیش کی کہ کل صحیح شخص بنو شیبہ کے دروازے سے پہلے داخل ہوا سے اس قصیے کا فیصلہ کرالیا جائے اور سب اسے تسليم کریں۔

اگلی صحیح لوگوں نے دیکھا کہ سب سے پہلے داخل ہونے والے ہمارے آقا و مولیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، آپ کو دیکھ کر سب چلا اٹھے کہ یہ ایک ہیں، ان کا فیصلہ ہمیں منظور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کو اس طرح حل کیا کہ ایک چادر بچھا کر اس پر جبرا سود کو رکھ دیا اور تمام قبائل کے سرداروں نے چادر کا ایک ایک کونہ پکڑ کر اسے اٹھا لیا اور جب وہ اپنے مقام تک پہنچ گیا تو آپ نے اپنے وست مبارک سے اٹھا کر اسے اپنی جگہ پر نصب فرمادیا اور اس طرح ایک عظیم جنگ اور خون خرابے کا خطرہ مل گیا۔

طوع آفتاب رسالت یعنی بعثت نبی صلی اللہ علیہ وسلم:

جبیسا کہ تمہیدی کلمات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اعلان نبوت سے پہلے سر زمین عرب میں کفر و شرک کا دور دورہ تھا، لوگوں نے مرکز تو حیدر کعبہ کو صنم خانہ بنارکھا تھا اور اس میں تین سو ساٹھ بہت سجا رکھتے تھے۔ حج اور طواف کی عبادات بھی مشرکانہ رسم سے پاک نہ تھیں مگر اس ناساز گارفدا کے باوجود محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ ازل سے نبوت کے لیے منتخب کیا جا چکا تھا، اس لیے آپ کا اس پورے ماحول کا فرانہ عقائد اور مشرکانہ ماحول سے قلبی تنفس اور بے زاری یقینی تھی۔ چالیس سالہ زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ طبیعت باطل کی طرف مائل ہوئی ہو، آپ دین فطرت اور توحید پر کار بند رہے، یہاں تک کہ جب عمر شریف چالیس برس ہوئی تو آپ نے مکہ سے تین میل فاصلے پر جبل حرہ پر واقع غار حرام میں جانا اور کئی کئی دن تک مختلف رہنا اپنا معمول بنالیا تھا، کبھی آپ کچھ ستوا اور پانی ساتھ لے جاتے اور

مہینوں مراقبہ فرماتے اور بروایت بخاری عبادت فرماتے۔ علماء و محدثین نے کہا ہے کہ یہ مراقبہ یا تخت یا عبادت اقرار توحید کے لیے تھی۔

اس عرصے میں آپ کو ”رویائے صادقة“ (چے خواب) دکھائی دیتے اور ان کی تعبیر ہو بہو ہی ہوتی جو آپ خواب میں دیکھتے، یہ کیفیت چھ ماہ تک جاری رہی، آخر کار ایک دن آپ محروم را بھی تھے کہ جبراً مل امین آئے اور پہلی وجی آپ پر نازل کی پہلی وجی کے الفاظ یہ تھے:

”إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ^۱ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلْقٍ^۲ إِقْرَأْ وَرَبُّكَ
الَّذِي أَنْزَلَ عَلَمَ بِالْقَلْمَنْ^۳ عَلَمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ^۴“۔

ترجمہ: ”اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے آپ کو پیدا کیا، اس نے انسان کو گوشہ کے لوگوں سے پیدا کیا، پڑھیے اور آپ کا رب نہایت کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا، (اعلچ: 1-5)۔“

آپ ﷺ نے یہ آیات پڑھیں، وہاں سے گھر تشریف لے گئے، بتقاضاۓ بشریت آپ پر باروجی کا اثر ہوا اور اس کی کیفیت اور سارا واقعہ آپ نے اپنی منس و ہدم اور رفیقة حیات حضرت خدیجہ کو سنایا، انہوں نے اور ورقہ بن نوفل نے آپ کو تسلی دی۔

آپ پر جو کچی طاری ہوئی اور فطری طور پر آپ نے گھبراہٹ محسوس کی، اس کا مطلب معاذ اللہ یہ نہیں کہ آپ پر نبوت کا اکشاف یا کیا یک ہو گیا، آپ حیران و ششد رہ گئے یا آپ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ”بعثت“ سے مراد اعلان نبوت ہے، اعطائے نبوت نہیں ہے۔ اعلان نبوت اب ہوا، جب کہ آپ ﷺ کو اپنی نبوت کا علم اور یقین پہلے سے تھا، یہ کیفیات اس لیے ظاہر ہو گیں کہ اکتاب وحی اور وحی الہی اپنے اندر جذب کرنا کوئی معمولی کام اور معمولی عمل نہیں ہے، یہ تو اسی قلب منور و اطہر کا کام ہے، جسے اس کام کے لیے منتخب فرمایا گیا تھا اور یہ ملکہ خصوصی اس میں ودیعت کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ سلسلہ وحی موقوف رہا جسے ”زمانہ فترت وحی“ کہا جاتا ہے، اس عرصے میں آپ

وہی کے انتظار میں بے چین و بے قرار و مضربر رہنے لگے۔ اضطراب "محبوب حقیقی" سے سلسلہ راز و نیاز (وہی) کے انقطاع کی بناء پر تھا۔ ان کیفیات کا اندازہ وہ ہی کر سکتا ہے جس نے عشق حقیقی اور محبوب حقیقی کے وصال کی لذتوں سے اپنے قلب و روح کو آشنا کیا ہو۔ ظاہر میں لوگوں نے طنز کیا کہ محمد ﷺ کے صاحب نے (معاذ اللہ) انہیں چھوڑ دیا ہے، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا، فرمایا:

"مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلِيلٌ ۖ وَلَلَّا يَخْدُدُ حَيْثُ لَكَ مِنَ الْأُوْلَىٰ ۖ وَلَسَوْفَ يُعْطِيُكَ رَبُّكَ فَتَرَفَّهِ ۝" -

ترجمہ: "آپ کے رب نے آپ کو نہیں چھوڑا اور نہ وہ بے زار ہوا اور بے شک بعد والی ساعت آپ کے لیے پہلی ساعت سے بہتر ہے اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے، (لفظی: 3-5)" -

تلیغ کی ابتداء:

ابتداء میں رسول اکرم ﷺ فرداً فرداً اپنے خصوصی احباب کو عوتِ اسلام دیتے رہے اور پھر یہ "السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ" بھی تلیغ اسلام کے مشن کے سپاہی بن گئے، مگر چونکہ اہل حق کی طاقت بظاہر کم تھی اور اہل باطل کی بہت زیادہ، اس لیے شروع میں نہ علانیہ تلیغ کا حکم ہوا اور نہ کھلے بندوں عبادت کا حکم صادر ہوا۔ شروع شروع میں جونفس قدیمہ مشرف براسلام ہوئے ان کے نام یہ ہیں:

حضرت ابو بکر صدیق، حضرت علی، حضرت زید بن حارثہ، حضرت بلاں جبشی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت عبد الرحمن، حضرت زبیر بن عوام، حضرت سعید بن زید، حضرت ابوذر غفاری، حضرت ارقم بن ابی ارقم، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، حضرت عبیدہ بن حارث، حضرت عمار بن یاسر، حضرت خباب بن ارت، حضرت خالد بن سعید اور سہیب رومی رضی اللہ عنہم اور صحابیات میں ام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ، فاطمہ بنت خطاب، اسماء بنت ابو بکر، اسماء بنت سلامہ تمہیہ، اسماء بنت

عیسیٰ، فاطمہ عامریہ، تکیہہ بنت الیسا رضی اللہ عنہم۔

اعلامیہ تبلیغ کا حکم:

سورۃ المدثر کی ان آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ عام کا حکم ہوا:
 ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لَّهُمْ قَمْ فَأَنذِرْنِي ۖ وَرَبِّكَ فَكَتِرْنِي ۖ وَثَيَابَكَ فَطَهِرْنِي ۖ وَالرُّجُزْ فَاهْجُرْنِي ۖ“ -

ترجمہ: ”اے چادر اوڑھنے والے! اٹھیے اور (اللہ کے عذاب سے) ڈرائیے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑے پاک رکھیے اور ناپاکی کو ترک کر دیجیے، (المدثر: 1-5)۔
 اس کے بعد آپ نے علامیہ سلسلہ تبلیغ جاری رکھا، پھر امر تبلیغ میں اور شدت فرمائی گئی اور سورۃ الحجر میں ارشاد ہوا:

”فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمِنُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ“ -

ترجمہ: ”آپ کھول کر بیان کیجیے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور مشرکوں سے کنارہ کشی کیجیے، (الحجر: 94)، پھر سورۃ الشراء میں ارشاد ہوا:
 ”وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ إِلَّا قُرَيْبَيْنَ“ -

ترجمہ: ”اور اپنے قرابت داروں کو (اللہ کے عذاب سے) ڈرائیے، (الشراء: 214)۔
 چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم کی تقلیل میں بنو ہاشم کو بالخصوص اور تمام قبائل قریش کو بالعموم دعوتِ اسلام دی، یوں توسب نے آپ کی صداقت اور دیانت کی شہادت دی لیکن آپ کے پیغام بدایت کو قبول کرنے اور آبا و اجداد کے دینِ باطل کو چھوڑ دینے پر کوئی بھی آمادہ نہ ہوا۔

آپ کے سر کردہ مخالفین میں تمام سرداران قریش شامل تھے، مثلاً: آپ کے چچا ابو لہب، عتبہ و شیبہ، ابوسفیان، ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن واکل وغیرہ، ان میں سے ابو لہب، زوج ابی لہب، ولید بن مغیرہ اور بعض دیگر مشرکین کی نذمت میں قرآن پاک میں واضح طور پر آیات نازل ہوئیں۔ ان کفار و مشرکین نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں

پر ظلم دستم کی انتہا کر دی۔ ایک مرتبہ یہ سب مل کر ابوطالب کے پاس آئے کہ اپنے بھتیجے کو منع کر دو، وہ ہمارے معبدوں کو جھٹلاتا ہے اور ہمارے آبا اجداد کو گراہ بتاتا ہے۔ اسے سمجھادو ورنہ درمیان سے ہٹ جاؤ، اس دھمکی کا بھی کوئی اثر نہ ہو ا تو پھر آئے اور کہا کہ محمد مسیح علیہ السلام کو روک دو ورنہ میدان میں فیصلہ ہو گا، ابوطالب نے اس پر حضور مسیح علیہ السلام سے کہا کہ تیری قوم نے یہ چیز دیا ہے، اپنے اوپر اور مجھ پر حرم کرو اور مجھے ”تکلیف مالا یطاق“ نہ دے (یعنی ایسی ذمہ داری کسی پرڈالنا جو ناقابل برداشت ہو)، اس پر نبی مسیح علیہ السلام نے فرمایا:

”اللہ کی قسم اگر وہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ پر لا کر رکھ دیں تاکہ میں اس کام کو چھوڑ دوں تو توب بھی میں اس کام کو نہ چھوڑوں گا، یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کر دے یا میں خود اس کوشش میں شہید ہو جاؤں“۔

اس پر ابوطالب نے آپ کو تسلی دی اور حمایت کا یقین دلا یا۔

صحابہ کرام پر کفار مکہ کا ظلم و ستم:

ابتدائے اسلام میں جو مسلمان حلقة بگوش اسلام ہوئے، انھیں اپنی دولت ایمان کے لیے ہر قربانی دینا پڑی، کسی نے کہا خوب کہا ہے:

یہ شہادت گرفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

واقعی آج ہم ایمان کی حقیقی قدر و قیمت سے نا آشنا ہیں، کیونکہ ہمیں یہ انمول دولت بن مانگے مل گئی ہے، ہمیں اس کی قیمت نہیں ادا کرنی پڑی، ورنہ بقول شاعر:

چوں می گویم مسلمانم بل زم
کہ دائم مشکلاتِ لا الہ را

اور قرآن مجید میں ہے:

”أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ“۔

ترجمہ: ”کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض ”آمَنَّا“ کہنے پر وہ یوں ہی چھور دیے جائیں گے

اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا، (العنکبوت: 2)۔

- صحابہ کرام کو ایمان کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی، اس کے بارے میں خلاصہ یہ ہے:
- ۱۔ حضرت بلاں رضی اللہ عنہ کی گردن میں رسی باندھ کر لڑکوں کے ہاتھ میں دی جاتی اور وہ مکہ کی پہاڑیوں میں انہیں سُکھیتے پھرتے۔
 - ۲۔ واں مکہ کی گرم ریت پر انہیں لٹاؤ یا جاتا اور گرم چھانل کی چھاتی پر رکھ دیا جاتا۔
 - ۳۔ مشکلیں باندھ کر لڑکوں سے پیٹا جاتا، دھوپ میں بٹھایا جاتا، بھوکار کھا جاتا اور وہ ان سب حالات میں احداحد کا نزہہ متانہ لگاتے رہتے، آخر کار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔
 - ۴۔ حضرت عمار، ان کے والد حضرت یاسر اور ان کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم مسلمان ہو گئے تھے، انھیں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے ابو جہل کے تم کا تختہ مشق بنا دیکھا تو فرمایا ”اے یاسر اور ان کی آل، صبر کرو تمہارا مقام جنت ہے۔“
 - ابو جہل بد بخت نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو نیزہ مار کر شہید کر دیا، کہا جاتا ہے کہ یہ اسلام کی راہ میں پہلی شہید ہیں۔
 - ۵۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کے سر کے بال کھینچے جاتے، گردن موڑ دی جاتی اور آگ کے انگاروں پر لٹاؤ یا جاتا۔
 - ۶۔ ابو قیمہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں رسی باندھ کر انہیں پتھر ریلی زمیں میں گھسیتا جاتا۔
 - ۷۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو ان کا چچا کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر نیچے سے دھواں دیتا۔
 - ۸۔ حضرت مصعب بن عمير رضی اللہ عنہ کو ان کی ماں نے اسلام لانے کے جرم میں گھر سے نکال دیا تھا۔

اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرام کو طرح طرح کی اذیت ناک اور المناک تکلیفیں دی جاتیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، انھیں کا صدقہ اور کرم ہے کہ اسلام ہم تک پہنچا اور آج ہم مسلمان ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی ذہنی و جسمانی اذیتیں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”وَلَقَدْ أُوذِيَتِ فِي اللَّهِ وَمَا يُؤْذَى أَحَدٌ“ مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جتنی اذیتیں دی گئیں اتنی کسی کو نہیں دی گئیں، چند مثالیں بے طور نمونہ پیش کی جا رہی ہیں:

- ۱۔ آپ کی چچی زوجہ ابو لهب آپ کی راہ میں کانے بچھاتی تھی۔
- ۲۔ عقبہ بن ابی معیط نے ایک مرتبہ آپ کی گردن میں چادر ڈال کرتے بل دیئے اور کسا کہ آپ کا دم گھٹنے لگا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آکر آپ کو چھڑایا۔
- ۳۔ اسی شخص نے حالت سجدہ میں آپ کی پشت پر نجاست سے بھری ہوئی او جھڑی ڈال دی۔
- ۴۔ ابو لهب کی قیادت میں ۲۵ سردار ان قریش پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جس کا مقصد ہی آپ کو جسمانی اور روحانی ایذا رسانی کے نت نئے طریقے تلاش کرنا تھا۔
- ۵۔ تمام سردار ان قبائل اور ان کے سوچ بوجھ والے لوگ آپس میں مشورہ کرتے رہتے کہ قبائل عرب کو تنفر کرنے کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کون سا لیبل لگایا جائے۔ لیکن خود ہی سوچ بچار کر کے عاجز و درماندہ رہ جاتے کہ نہ تو انھیں ”کاہن“ قرار دیا جاسکتا ہے، نہ ”شاعر“ اور نہ جادو گرا اور انھیں دیوانہ اور جنونی بھی معاذ اللہ قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ان کی شخصیت انہیلی دلکش، صورت انہیلی پر کشش، کلام بے انہیلیں اور اثر آفرین اور سیرت و کردار ایسا طیب و طاہر تھا کہ ہر نیک طینت انسان ان کی جانب کھنپا چلا آتا تھا اور ہر صاحب فکر و نظر کو روز روشن کی طرح عیاں نظر آتا تھا کہ ان میں سے کوئی تہمت، کوئی الزام اور کوئی بھی لیبل ان کی ذات پر چپاں نہیں کیا جاسکتا اور ہزار دشمنی اور عداوت کے باوجود اس حقیقت کو کفار مکہ خوب بھی تسلیم کرتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ گھری سوچ بچار کے بعد ولید بن مغیرہ کی سربراہی میں ان کی مجلس مشاورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈے کے لیے یہ قرارداد پاس کی کہ مشہور کر دیا جائے کہ ان کے کلام میں اتنا اثر و شیرینی ہے کہ اس کے اثر سے باپ بیٹے، بھائی

بھائی اور شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ہو جاتی ہے، اس لیے اس سے بچے رہنا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ دشمنوں کی جانب سے آپ کے فضل و کمال اور بے داغ سیرت و کردار کا کھلے بندوں اعتراف ہے اور کسی نے کیا خوب کہا ہے:

”وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَثٌ بِهِ الْأَعْدَاءُ“

”کمال درحقیقت وہی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں۔“

۶۔ مجزات کامطالیبہ:

جب کفار کا اور کوئی داؤ نہ چلتا تو ذہنی ایذا رسانی کے لیے آپ سے طرح طرح کے مجزات کامطالیبہ کرتے، اس میں شک نہیں کہ انبیاء کرام نے اپنی نبوت کی صداقت کی دلیل کے طور پر مجزات پیش کیے ہیں، مگر اس کا منشاء یہ ہرگز نہیں کہ نبوت کا مشن، ہی یہ سمجھ لیا جائے کہ معاذ اللہ وہ ایک ”شعبده باز“ کی طرح لوگوں کے حسب مشا مجزے اور کرام تین دکھاتے پھریں یا کرتب دکھانا شروع کریں اور لوگ اس سے سبق حاصل کرنے کی بجائے اسے تمخر و استہزاء یا ذہنی تفریح کا ذریعہ بنالیں۔ آپ تو سراپا مجزہ تھے اور آپ سے خارجی مجزات کا بھی صدور ہوا، لیکن اس کے باوجود کفار مکہ آپ سے طرح طرح کے مجزات کا مطالیبہ کرتے جو آپ کی شان رحمت اور اللہ کی حکمت کا تقاضا نہ تھا، مثلاً:

۱۔ خدا سے کہو کہ وہ ایک فرشتہ تمہارے ساتھ مقرر کر دے جو یہ گواہی دیتا پھرے کہ یہ شخص سچا ہے۔

۲۔ خدا سے سوال کرو کہ تمہارے لیے باغات لگ جائیں، سونے کا محل بن جائے، سونا چاندی کے انبار لگ جائیں۔

۳۔ آسمان کے کچھ مکڑے ہم پر گراؤ۔

۴۔ اپنے خدا سے دعا کرو کہ ہم پر آسمان سے پتھر بر سائے یا ہم پر دردناک عذاب نازل کر کے دکھاؤ۔

۵۔ آسمان پر چڑھ جاؤ اور لکھی ہوئی کتاب لے کر آؤ۔

۴۔ خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لاکھڑا کرو وغیرہ۔

ہجرت جبشہ:

جب کفار نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تو آپ نے محدود پیانے پر مسلمانوں کو جبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ پہلے قافلے کے سربراہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے، ان کے ہمراہ ان کی زوجہ محترمہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھیں۔ دوسرا قافلے کے ساتھ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب (جعفر طیار) بھی تھے جو فتح خیر کے موقع پر مدینہ طیبہ واپس آئے۔ جبشہ میں مسلمان مہاجرین کی مجموعی تعداد ۸۳ تھی۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نجاشی شاہ جبشہ کے دربار میں مسلمانوں کی نمائندگی کی تھی اور تاریخی خطاب کیا تھا جس سے کفار مکہ کی سازشوں کے باوجود شاہ جبشہ متاثر ہوا اور اس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے زخم گوشہ پیدا ہوا۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام:

نبوت کے چھٹے سال حضور ﷺ کے عم کرم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے اور اس کے تین روز بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف بے اسلام ہوئے۔ ان دونوں حضرات کے اسلام لانے کے واقعات مشہور و معروف ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشرف بے اسلام ہونا مسلمانوں کے ابتدائی عہدِ مجبوری و مظلومی کے خاتمے کا نقطہ آغاز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ”فاروق رضی اللہ عنہ“ کا لقب بارگاہ نبوی ﷺ سے عطا ہوا اور ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے خود اللہ سے ان کے اسلام قبول کرنے کے لیے دعا فرمائی۔

۷۔ تاؤ انبوی:

۱۔ جب کفار مکہ نے دیکھا کہ ان کی تمام ترمذیافت کے باوجود اسلام آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے اور اس کی جڑیں مخلص ہو رہی ہیں اور ان کی تمام تدبیر ناکام ہو رہی ہیں تو تمام قبائل عرب نے متفقہ طور پر سن 7 نبوی میں بنو هاشم کے سماجی مقاطعے کا فیصلہ کیا جس کی رو سے بنو هاشم کے ساتھ میل جوں، لین دین اور ہر طرح کی قربت پر پابندی لگادی گئی اور ایک

معاہدہ لکھ کر خانہ کعبہ میں آؤیزاں کر دیا گیا۔

شعب ابی طالب میں محصوری:

تین سال تک بنو ہاشم "شعب ابی طالب" میں محصور رہے۔ اس عرصے کی فاقہ کشی، نگ دتی اور مصائب کا ذکر صحابہ کرام نے کیا ہے جن کو پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ حضور ﷺ تبلیغ کے لیے صرف ایام حج میں نکل سکتے تھے، کیونکہ ان ایام میں قریشی بھی جنگ کو حرام سمجھتے تھے، اس عرصے میں ابو طالب حضور ﷺ کی خصوصی حفاظت فرماتے رہے۔ بالآخر حضور ﷺ نے قریش کو مطلع فرمایا کہ تمہارے معاہدے کی دستاویز کو دیک چاٹ گئی ہے اور صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ انہوں نے دیکھا تو ایسا ہی تھا مسلمان تو "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں" کا مصدقہ بن گئے، لیکن ظلم ڈھانے والے عاجز آگئے تھے، چنانچہ بعض نیک دل لوگوں کی مداخلت سے یہ بائیکاٹ بالآخر ختم ہو گیا۔

سفر طائف:

۲۔ 10 نبوی میں حضور ﷺ کے شفیق پچا جناب ابو طالب کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد ۲۵ سالہ ایثار و رفاقت کی امین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی انتقال فرمائیں ان دونوں ہمدردوں اور ظاہری سہاروں کے اٹھ جانے سے آپ کو از جدر نخ و ملال ہوا، اسی لیے اس سال کو عام المجزن (غم کا سال) کہا جاتا ہے۔

۳۔ آپ جب اہل مکہ سے مایوس ہو گئے تو تبلیغ اسلام کے لیے حدود مکہ سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے طائف میں گئے۔ وہاں کے سرداروں عبد یا لیل مسعود اور حبیب سے مل کر انھیں دعوت اسلام دی، مگر انہوں نے آپ کا تمثیر اڑایا، لڑکوں اور لفگنوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا کہ سنگاری کریں، تمثیر اڑائیں، ان کی ایذار سانی سے آپ کا جسم مبارک لہولہاں ہو گیا، مگر "رحمۃ للعالمین" ﷺ پھر بھی ان کے لیے ہدایت کی دعا فرماتے رہے اور ان لوگوں کے لیے عذاب کی دعا نہیں کی۔

واقعہ معراج:

۲۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے اپنے ”بندہ خاص کو اپنے قرب خاص میں بلا�ا۔ عالم ارضی، عالم سماوات، جنت و جہنم، بیت المعمور، عرش و سدرہ، لوح و قلم کی سیر کرائی۔ عالم غیب کے مشاہدات کرائے، اپنے انوار و تجلیات او،“ اُت و صفات کے مشاہدے سے سرفراز فرمایا، اسے ”واقعہ معراج“ کے نام سے موسم کیا گیا ہے۔ اس سے آپ کی تسکین بھی مقصود تھی، علم و معرفت کے خزانے بھی آپ کو عطا کیے گئے اور نماز کی فرضیت کا حکم بھی عطا کیا گیا اور جن و انس اور ملائک سب کو یہ بتانا مقصود تھا کہ وہ جان لیں اور پہچان لیں کہ ”محبوب خدا“ کون ہے اور مقامِ مصطفیٰ کی رفتت کیا ہے اور یہ کہ مخلوقِ الہی میں سب سے برتر، سب سے ارفع، اور سب سے اعلیٰ آپ ہی ہیں، بقول غالب:

ہر کس بقدر خویش بجائے رسیدہ است

آنجا کہ جائے نیست تو آنجا رسیدہ ای

۵۔ طفیل بن عمرو دوی اور ابوذر غفاری کا قبولِ اسلام:

ای عرصے میں یمن کے قبیلہ دوس کے سردار طفیل بن عمرو دوی مشرف بے اسلام ہوئے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بھی تلاشِ حقیقت میں نکلے اور بالآخر حلقة بگوشِ اسلام ہو گئے۔ آپ کی حمیتِ اسلامی نے اپنے ایمان کو چھپانا گوارانہ کیا اور خانہ کعبہ میں آکر اپنے ایمان کا اعلان فرمایا، جس کی پاداش میں آپ پر ظلم کے پھاڑتوڑے گئے، آپ کے زہد و تقویٰ اور استغنا کی وجہ سے بارگاہِ رسالت سے آپ کو ”مسیح الاسلام“ کا لقب عطا ہوا۔

طریقہ تبلیغ:

”تبلیغ“ کے لغوی معنی ہیں: پہنچادینا، اصطلاح شریعت میں تبلیغ سے مراد اللہ کے دین اور اعلیٰ کے احکام کو اس سکے بندوں تک پہنچا دینا۔ تبلیغ دینِ نبوت و رسالت کا اولین اور اہم ترین فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم کو ارشاد فرماتا ہے:

”يَا إِيَّاهَا الرَّسُولُ بِلِّهٖ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ“ -

ترجمہ: ”اے رسول! (مکرم!) جو پیغام ہدایت آپ پر نازل کیا گیا ہے، اسے اللہ کے بندوں تک پہنچادو (المائدہ: 67)“ -

قرآن کی رو سے اسلامی مبلغ کو مندرجہ ذیل اوصاف کا حامل ہونا چاہیے:

۱۔ قول و عمل میں مطابقت:

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”يَا إِيَّاهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ“ -

ترجمہ: ”اے اہل ایمان! تم جو کرتے نہیں، وہ کہتے کیوں ہو، (الصف: 2)“ -

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کے مبلغ کے ظاہر و باطن اور قول و عمل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ ایک طرح کی منافقت ہے اور اس سے تبلیغ برکت و تاثیر سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کے بر عکس اگر مبلغ کا اپنا کردار اور عمل اس کے قول کے مطابق ہو اور وہ دوسروں کو جس عمل خیر کی دعوت دے رہا ہو خود بھی اس پر صدق دل اور اخلاص نیت کے ساتھ عمل کر کے دکھائے تو اس تبلیغ میں اللہ تعالیٰ تاثیر پیدا فرماتا ہے، وہ نور ہدایت سے معمور ہوتی ہے، مخاطب کے دل پر اثر کرتی ہے، بقول علامہ اقبال:

دل سے جوبات نکلتی ہے اثر کھلتی ہے

۲۔ حکمت اور موعظۃ حسنۃ:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”أَدْعُ إِلَى سَبِيلِي سَبِيلَكُ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادَ لَهُمْ بِالْئِيمَانِ هُنَّ أَخْسَنُ“ -

ترجمہ: ”(اے رسول! لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت کے ذریعے دعوت دیجیے اور ان سے (بصورت اختلاف) نہایت پسندیدہ اور شاستر و شستہ انداز سے مجادلہ کیجیے، (انخل: 125)“ -

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ”دعوت الی اللہ“، اور تبلیغ دین میں تین امور کو لازمی طور

پر نظر کھا جائے:

(الف) - حکمت:

یعنی ایسے حکیمانہ، پراثر اور محکم دلائل جو شکوک و شبہات کی تاریکوں کو نور یقین سے بدل دیں اور جن سے حق روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے۔

(ب) - موعظہ حسنہ:

ایسے مخلصانہ، ناصحانہ اور مشفقاتانہ انداز سے بندوں کو اللہ کی طرف بلانا کہ پتھر دل بھی موم ہو جائیں، جس میں مخاطب کے جہل اور علمی کا تمسخر اڑانا اور اپنی علمی برتری کا سکھ جانا بھی مقصود نہ ہو، بلکہ صرف اور صرف اللہ کے بندوں کی ہدایت مطلوب ہو، انداز ایسا ہیں ہو، لب و ہجہ شفقت و پیار سے اس قدر معمور ہو کہ دوسرا خود آپ کی طرف کھا چلا آئے کیونکہ کسی کو اس کے دین اور مذہب ترک کرنے پر آمادہ کرنا خواہ وہ مذہب باطل ہی کیوں نہ ہو، سب سے دشوار کام ہے۔

۳۔ حکیمانہ بحث و مناظرہ:

بعض اوقات مخاطب آسانی سے آپ کا موقف سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا خواہ وہ سراسر باطل پر ہوا اور آپ سو فیصد حق پر ہوں، اس کی وجہ حسب ذہل ہیں۔

الف: اپنے سابقہ دین کے ساتھ جذباتی و انسٹگی، جس کے خلاف آسانی سے کوئی دعویٰ یاد مل سلنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ب: بعض اوقات وہ دل سے توسلیم کرتا ہے کہ آپ حق پر ہیں، لیکن کچھ بحثی اور کٹختی پڑاتر آتا ہے اور علمی بحث و مباحثہ کو مجادلے اور جنگ وجدال کی سطح پر لے آنا چاہتا ہے۔

ج: آپ کے دلائل کتنے ہی محکم و مضبوط کیوں نہ ہوں، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں تسلیم کرنے کو اپنی شکست پر محمل کرتا ہے اور اس کی جھوٹی انا اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی اور کوئی بھی انسان آسانی سے عمل، ذہنی یا نظریاتی پسپائی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

وہ دین کی اخلاقی و شرعی حدود قید کو اپنی بے راہ روی بد کرداری، عیاشی و فحاشی اور تن آسانی و ہل نگاری کے لیے ایک زبردست رکاوٹ سمجھتا ہے، لہذا آسانی سے اس بندھن کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

بعض قلوب واذہان اپنی انتہائی شفاقت کی بناء پر محروم ہدایت ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دورانِ دعوت و تبلیغ، بحث و مباحثہ اور مناظرہ کرتے وقت مبلغ دین کو شائستگی کا روایہ اختیار کرنا چاہیے۔ فریقِ مخالف کی تندی ہی و ترشی کو برداشت کرتے ہوئے سلبجھ ہوئے اور مشفتانہ انداز میں دلائل و شواہد کے ذریعے اسے قائل کرنا چاہیے اور فریقِ مخالف کی برائی کا جواب برائی سے دینا تو دور کی بات ہے، قرآن کا حکم یہ ہے کہ نیکی سے دو یعنی جس درجے کی برائی ہے، اُس سے اعلیٰ درجے کی نیکی سے دینا چاہیے تاکہ مخالف کا سویا ہوا ضمیر جاگ آئی، اس کے اندر کا انسان بیدار ہوا اور اس کی سوچ، فکر اور رویے میں ایک انقلاب آجائے، پتھر کھا کر پتھر نہ مارنا کمال نہیں ہے، پتھر برسانے والے پر پھول برسانا شیوه نبوت و رسالت ہے: سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں ٹھنڈ کر دعا نہیں دیں۔

جنہوں نے پتھر برسائے، ہلوہاں کر دیا، سر بazar تمسخر اڑایا، بد سلوکی اور توہین کا کوئی ایسا حرث نہیں جوانہوں نے نہ آزمایا ہو مگر نبی رحمت کا رہ عمل کیا تھا، یہ کہ رات کی خلوتوں میں اپنے رب سے راز و نیاز کے لمحات میں التجائے سحرگاہی میں یہ دعا: ”اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما، کیونکہ وہ میرے مقام کو نہیں جانتے“، نتیجہ یہ نکلا کہ جو جان کے دشمن اور خون کے پیاسے بن گئے تھے، اب وہ سوچان سے اللہ کے محبوب پر تصدق اور شمار ہو رہے تھے، تفصیل جانی ہو تو عمر فاروق، خالد بن ولید، عکرمہ بن ابی جہل، عمرو بن العاص اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا مطالعہ کرو۔

ای حکیمانہ طرزِ تبلیغ اور دعوت و ارشاد کا عکس آپ کو صحابہ کرام کے طرزِ عمل میں نظر آئے گا، کسی شخص نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چند نیاز بیا جھے کہے تو اس پر کبیر صدقہ دے سفانے جواب دیا: ”اگر تو سچا ہے تو اللہ مجھے معاف فرمائے اور اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ مجھے بخشنے“۔

قبر جو کھادِ علی الرضی تھے کسی نے گالی دی، آپ نے اپنے خادم سے فرمایا:
 ”اے قبر! اپنے گالی دینے والے کو چھوڑ دو اور اسے بھلا دو، اس طرح تو حُمن کو راضی کرے
 گا اور شیطان کو غضبناک کرے گا اور اپنے گالی دینے والے کو سزادے گا، کیونکہ بے وقوف کی
 یہی سزا ہے کہ اس سے انجھنے کی بجائے خاموشی اختیار کی جائے۔“

۳۔ ظاہری ناکامی سے دل برداشتہ نہ ہونا:

انسان اپنے پورے اخلاص اور للہیت کے ساتھ جب لوگوں کو حق کی دعوت دیتا
 ہے اور اپنے اپنے کچھ اس راہ میں قربان کر دیتا ہے اور اس کے باوجود کامیابی کے آثارِ دورِ دور
 تک نظر نہیں آتے تو دل شکستہ اور دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ کبھی سوچتا ہے کہ اس سعی لاحصل
 سے دامن کھینچ لے، کبھی اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ کہیں سعی و عمل میں تو نقش اور کمزوری
 نہیں ہے، لیکن اسلام کہتا ہے کہ رہ نور و خیر اور جادہ مستقیم پر چلنے والے کا مقدر تو صرف اور
 صرف کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح ہے، ناکامی نامرادی اور خسaran کا اس طرف گز رجھی
 نہیں ہوتا۔ دعوتِ حق اور اشاعتِ حق کے لیے اپنے جان و مال اس صلاحیتوں کو وقف کر دینا
 بجائے خود ایک عظیم کامیابی ہے خواہ اس کا واقعی نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ کسی کا ہدایت قبول نہ کرنا، حق کو قبول کرنے کے
 لیے آمادہ نہ ہونا، ہادی کی ناکامی کی دلیل نہیں ہے، بلکہ ہدایت کو رد کرنے والے کی محرومی اور
 شقاوت کی دلیل ہے، اسی لیے بعض احادیث میں آیا ہے کہ قیامت میں ایسے بھی انبیاء ہوں
 گے جن کے پیچھے صرف ایک یادو یا چند امتی ہوں گے، تو کیا وہ انبیاء ناکام رہے، ہرگز نہیں،
 چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَسْقَىٰ ۖ إِلَّا تَذَكَّرَهُ لِئَنَّ يَخْلُقُ ۗ“ ①

ترجمہ: ”ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اٹارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں، بلکہ یہ
 نصیحت ہے ہر اس شخص کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے، (اط: 2-3)“

”لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَنَّبٍ طَرِيرٌ“

ترجمہ: ”آپ ان (کافروں کو) جبرا مسلمان کرنے والے نہیں ہیں، (الغاشیہ: 22)۔“

”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوْ أَعْلَمُهُمْ عَأَنْدَرُهُمْ أَمْ لَمْ تُشْرُكُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ۔“

ترجمہ: ”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، آپ انہیں (عذابِ الٰہی سے) ڈرا سکیں یا نہ ڈرا سکیں، وہ ایمان نہیں لاسکیں گے، (البقرہ: 6)۔“

۵۔ ابلاغ عامہ کے تمام ممکنہ ذرائع کو اختیار کرنا:

مکہ معظمه خود بھی ایک تجارتی شہر اور مذہبی مرکز تھا جہاں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ زمانہ حج میں رسول اکرم ﷺ مختلف اطراف سے آئے ہوئے قبائل کے پاس جاتے اور انہیں دعوتِ اسلام دیتے۔ عکاظ اور دیگر میلیوں کے موقع پر جہاں تمام قبائل عرب کا اجتماع ہوتا تھا۔ آپ تبلیغِ اسلام کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ خود چل کر بھی مختلف قبائل کو دعوتِ حق دینے جاتے تھے۔

مقامی اور بیرونی لوگوں کو خفیہ طور پر بھی دعوتِ اسلام دیتے تھے۔ بیعت عقبہ اولی اور بیعت عقبہ ثانیہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو آگے چل کر عظیم اسلامی انقلاب کا سانگ میل ثابت ہو سکیں۔

آپ مختلف سربراہانِ مملکت، سردارانِ قبائل اور روسا کے نام نامہ و پیام بھی سمجھتے اور مختلف قبائل کے پاس آپ نے اپنے سفراء اور مبلغین بھی سمجھے۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کی جا سکتا ہے کہ ہر جگہ ہر ملک ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے اس دور کے تقاضوں کے مطابق دعوتِ حق اور تبلیغ دین کی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ جہاں ابلاغ اور تبلیغ کی کھلے عام اجازت نہ ہو، وہاں دوسرے مناسب طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ جہاں اشاعتِ اسلام کی کھلے بندوں اجازت ہو وہاں دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق تبلیغ و اشاعت اور ترغیب کے تمام ممکنہ ذرائع اختیار کرنے چاہیں تاکہ دعوت ہر ایک کو اور ہر مقام پر پہنچ سکے اور اللہ کے بندوں پر اللہ کی جگت تمام ہو سکے۔

خود مبلغ دین کو اپنے دور کے تقاضوں، رجحانات، اسلام و شمن تحریکات اور نت نے

مسئل سے باخبر رہنا چاہیے تاکہ وہ دین کی ترجمانی صحیح طور پر کر سکے۔ اس کا مطالعہ ہوتا چاہیے تاکہ مختلفین اس پر ”امگلے وقت کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو“ کی پہمی نہ کس سکیں۔

۶۔ دین کو ہل انداز میں پیش کرنا:

دین کو ہل انداز میں پیش کرنا چاہیے تاکہ وہ انسان نہیں بلکہ حقیقت معلوم ہو، اسے قابل عمل اور قابل فہم سمجھا جائے، اسے مشکل ترین اور ناممکن العمل بنا کرنے پیش کیا جائے، قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ“۔

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ رے لیے آسانی چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا: (البقرہ: 185)۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”يَسِّرْ دَا وَلَا تُخْسِرْ دَا، وَبَيْسِرْ دَا، وَلَا تُنْفِرْ دَا“

ترجمہ: ”دین کو آسان بنا کر پیش کرو مشکل بنا کر پیش نہ کرو، خوش خبری دو اور لوگوں کو (دین سے) تنفر نہ کرو، (بخاری: 69)۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ دین کو ایک کھلونا اور ”بازیچہ اطفال“ بنا کر کھو دیا جائے کہ جو چاہے اور جب چاہے اس میں حسب منشاء قطع و برید کر لے کیونکہ دین اسلام کے اصول غیر متبدل ہیں اور ان پر کسی سمجھوتے یا مغافہ ہمت کی گنجائش نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسائل حاضرہ پر اس کا اطلاق و انطباق سائنسیک اور منطقی انداز میں کیا جائے۔

کے اسوہ حسنہ:

رسول اکرم ﷺ کی تبلیغ کی اثر آفرینی اور انقلابی روپ میں موثر ترین حصہ آپ کے اسوہ مبارکہ کا ہے۔ آپ کی سیرت مبارکہ اور کردار میں اس قدر نفاست، طہارت، پاکبازی، پاک دامنی اور شرافت و عظمت تھی کہ اپنوں کی توبات ہی کیا غیار حتیٰ کہ آپ کے بدترین دشمن بھی اس کے معرف تھے۔ تاریخی ریکارڈ اس پر شاہد ہے کہ کفار و مشرکین مکہ نے ہر چند کہ آپ کو ایذا کیں دیں، ستم ذھانے، ظلم کی انتہا کر دی حتیٰ کہ قتل کا منظم منصوبہ بنایا

لیکن آپ کے کردار پر وہ بھی انگشت نمائی نہ کر سکے۔ آپ نے تعلیمات اسلام کو محض ایک اصلاحی نظریے کے طور پر نہیں بلکہ ایک منظم عملی نظام حیات کی شکل میں پیش کیا اور امت سے جتنا عمل کا مطالبہ کیا اس سے زیادہ خود عمل کر کے دکھایا اور اپنے بے نظیر و بے مثال کردار کو ایک آئینہ میں اور مجزرے کے طور پر قوم کے سامنے پیش کیا اور فرمایا:

”فَقَدْ لِيَتُّ فِيْكُمْ عُمَّرًا قِنْ قَبْلِهِ“ -

ترجمہ: ”میں نے اس (اعلان نبوت) سے پہلے تمہارے درمیان عمر کا ایک بڑا حصہ گزارا ہے، کیا تم سمجھتے نہیں، (یونس: 16)“ -

11 نبوی تناہی و حرمت

بیعت عقبہ اولیٰ:

نبوت کے گیارہویں سال ماہ ربیع میں مکہ سے چند میل کے فاصلے پر حضور اکرم ﷺ کی ملاقات یثرب سے آئے ہوئے قبیلہ خزرج کے چھ اشخاص سے ہوئی۔ آپ نے ان پر اسلام پیش کیا۔ انہوں نے اہل کتاب سے آخری نبی کی جو علامات سن رکھی تھیں، وہ آپ میں پائیں اور مشرف بے اسلام ہو گئے۔ اگلے سال زمانہ حج میں ۱۲ افراد مکہ آئے اور انہوں نے اسی مقام پر آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ان امور پر کار بند رہنے کا عہد کیا اور بیعت کی، چونکہ یہ مقام منی کے قریب ایک گھاٹی ہے، اس لیے اسے بیعت عقبہ اولیٰ کہتے ہیں، انہوں نے اس بات پر بیعت کی:

۱۔ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ پھراییں گے۔

۲۔ چوری اور زنا نہیں کریں گے۔

۳۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔

۴۔ کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے۔

۵۔ کسی امر معروف میں حضور ﷺ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

پھر آپ نے حضرت مصعب بن عمير رضی اللہ عنہ کو داعی بن کران لوگوں کے ساتھ روانہ فرمایا، حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی تعلیم و تبلیغ رنگ لائی اور اگلے سال حج کے موقع پر ایام تشریق میں اہل بیشہبز میں سے ۷۲ مردوں اور ۲ عورتوں نے رات کے وقت "عقبہ منی" میں آپ سے ملاقات کی آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کو مدینہ آنے کی دعوت دی اور عہد کیا کہ وہ "اپنے اہل و عیال کی طرح حضور ﷺ کی حمایت کریں گے اور دین حق کی اشاعت میں مدد کریں گے"۔

حضور ﷺ نے بھی ان کی حمایت کا وعدہ فرمایا اور انھیں تسلی دی کہ آپ ایک بار مدینہ جانے کے بعد ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، آپ نے فرمایا:

"بِلِ الدَّمَ الدَّمَ وَالهَدَمَ الْهَدَمَ أَنَا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُقْرَبُونَ مِنْ حَارِبَتِي
وَأَسَلَّمْ مِنْ سَالِمْتِي" -

ترجمہ: "تمہارا خون میرا خون ہے، میرا جینا مرننا تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارا دشمن میرا دشمن، اور میرا دشمن تمہارا دشمن اور تمہارا دوست میرا دوست ہے، (بل الہدی والرشاد، ج: 3، ص: 204)۔"

اس موقع پر حضرت عباس بن عبدہ النصاری نے ان سے کہا:

"تم جانتے ہو کہ محمد ﷺ سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو، یہ عرب و عجم سے جنگ پر بیعت ہے۔ نیا خیال ہے جب تمہارا مال تاراج ہو، تمہارے اشراف قتل ہوں تو تم ان کا ساتھ چھوڑ دے گے، انہوں نے کہا: ہرگز نہیں، ہم اسی قیمت پر بیعت کر رہے ہیں، انہوں نے کہا: ہمارا صلہ کیا ہوگا، آپ نے فرمایا: "جنت"، انہوں نے کہا: اپنا ہاتھ بڑھا دیجئے، آپ ﷺ نے ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے بیعت کی، (بل الہدی والرشاد، ج: 3، ص: 204)۔"

آپ نے ان میں سے 12 اشخاص کو اپنی طرف سے نقیب مقرر فرمایا اور فرمایا کہ تم اپنے اپنے قبلے کے کفیل ہو۔

ہجرت:

اسلام میں ہجرت کی بڑی اہمیت ہے۔ شرعاً ہجرت سے مراد یہ ہے کہ وہ خطہ زمین یا

ملک جہاں دشمنان اسلام کا غلبہ اور تسلط ہوا اور مسلمانوں کو اللہ کے دین پر قائم رہنے اور اس پر آزادانہ عمل کی اجازت حاصل نہ ہو، ظلم و تم کا دور دورہ ہوا اور مسلمان اپنی کمزوری کے باعث ظلم کو رفع کرنے یا اس کا مقابلہ کرنے کی ہمیت نہ رکھتے ہوں تو ایسے حالات میں ان پر لازم ہے کہ اپنا وطن چھوڑ کر ایسی جگہ پناہ لیں جہاں انھیں اسلام پر عمل کرنے کی آزادی ہو۔ قرآن مجید بھی بیشتر انبیاء کرام کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے۔

جب مکہ مکرمہ میں بھی مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ اسلام پر قائم رہنا اور عمل کرنا ان کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا تو اللہ کی طرف سے انہیں مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی جہاں کے لوگ بیعت عقبہ کے نتیجے میں ان کے لیے دیدہ و دل فرش را ہے کیے ہوئے تھے۔ اکثر صحابہ کرام خاموشی سے ہجرت کر کے مدینے پہنچتے چلے گئے کفار مکہ نے دیکھا کہ وہ سب نجی کرنکل رہے ہیں تو وہ ان کے ارادہ ہجرت میں بھی سدرہا بننے لگے گویا وطن اعزہ و اقرباء، مال و دولت اور گھر بار چھوڑ کر جانا بھی ان کے نزد یہ کرم تھا۔

ہجرت کے موقع پر بھی بعض صحابہ کرام کی قربانیاں مصائب و آلام اور کفار کے ظلم و تم کا تختہ مشق بننے کے باوجود ان کا عزم و استقلال ایمان افروز ہے اور آج بھی دولوں کو گرما دیتا ہے اس سلسلہ میں حضرت صہیب رومی، ابو سلمہ، ام سلمہ رضی اللہ عنہم اور بعض دیگر صحابہ کرام کے اسماء گرامی آج بھی اسلام کی تاریخ ایثار و عزمیت کی زینت ہیں اور ان کا کردار آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شان یہاں بھی نزاں ہے۔ عمر فاروق کی غیرت ایمانی چھپ چھپا کر سفر ہجرت پر روانہ ہونا گوارانہیں کرتی۔ تلوار حمال کر کے آتے ہیں، کعبۃ اللہ کا طواف کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ جو چاہتا ہے کہ اس کی بیوی بیوہ ہو جائے، اس کی ناں اسے روئے، اس کے بچے یتیم ہو جائیں، وہ مکہ سے باہر آ کر میرا راستہ روک کر دیکھ لے لیکن کسی کی مجال کر اللہ کے اس شیر کی راہ روک سکتا۔

دریں اثناء کفار مکہ نے محسوس کیا کہ اگر سب مسلمان اور رسول اکرم ﷺ سے بخلافت مکہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں مدینے میں ایک مرکزل جائے گا اور

طاقت پکڑ کر ان کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ چنانچہ تمام سردار ”دارالنحوہ“ میں جمع ہوئے اور مشورہ کرنے لگے کہ کیوں نہ (معاذ اللہ) محمد ﷺ کا قصہ ہی تمام کر دیں، شیطان بھی ایک شیخ مجدد کی صورت میں ان کے درمیان موجود تھا، اللہ تعالیٰ قرآن میں ان کی تدابیر کا ذکر فرماتا ہے:

”وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُنَجِّيُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرُجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرُونَ“۔

ترجمہ: ”اور اس وقت کو یاد کرو) جب کفار آپ کے بارے میں سازشیں کر رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں یا جلاوطن کر دیں وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ خفیہ تدبیر فرم رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر فرمانے والا ہے، (الانفال: 30)۔“

آخر کار انہوں نے طے کیا کہ ہر قبیلے سے ایک ایک جوان مرد کا انتخاب کیا جائے اور یہ تمام سورا رات بھر کا شانہ نبوت کا محاصرہ کیے رکھیں اور صبح جو نبی آپ باہر نکلیں سب آپ پر پل پڑیں اور معاذ اللہ آپ کا چراغ حیات گل کر دیں۔

رسول اللہ ﷺ رات کو اٹھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹایا تاکہ لوگوں کی امانتیں واپس کر دیں اور آپ نے کافروں پر ایک مٹھی مٹھی چینکی جس سے وقتی طور پر سب اندھے ہو گئے اور سورۃ یس کی بتدائی آیات پڑھتے ہوئے آپ صحیح سلامت نکل گئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ ان کے اہل خانہ نے مختصر سے قائلہ نبوت کے لیے زادراہ تیار کیا اور ۲۷ صفر ۱۳ نبوی کورات کی تاریکی میں اسلام کے یہ شیعہ قمر عازم مدینہ ہو گئے اور چند میل کے فاصلے پر غار ثور میں پہلا پڑا اور کیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جاں نثاریاں اور جاں سپاریاں تو یونہی بے نظیر و بے مثال ہیں۔ ان کے اسلام پر ان گنت احسانات ہیں جن کا صلہ خود رب کریم آخرت میں مرحمت فرمائے گا مگر سفر ہجرت کی رفاقت اور غار ثور میں ایثار و معیت آپ کا ایسا شرف ہے جس میں کوئی آپ کا ہمسر نہیں۔

قبائل و رواد مسعود:

غارتہر میں تین راتیں گزارنے کے بعد یہ قافلہ روانہ ہوا اور ۸ ربیع الاول ۱۳ نبوی بروز پیر (۲۳ ستمبر ۶۲۷ء) مقام قبائل پہنچا جہاں اہل مدینہ نے والہانہ استقبال کیا۔ یہاں آپ نے امام بخاری کی روایت کے مطابق جو دہ روز قیام فرمایا، مسجد قباء تعمیر فرمائی، جس کے بارے میں قرآن نے شہادت دی کہ اس کی بنیاد "تقویٰ" پر رکھی گئی ہے۔ حضور ﷺ خود بھی اس کی تعمیر میں شریک رہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی یہیں آپ سے آملنے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی

مدینہ میں نزول رحمت:

قباسے جمعہ کے روز آپ داخل مدینہ ہوئے اور بنو سالم کی بستی میں آپ نے تاریخِ اسلام کا پہلا جمعہ ۱۰۰ آدمیوں کے ساتھ پڑھا اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ وہاں سے آپ آگے بڑھے، ہر شخص دل و جان کا نذر انہے لیے، دیدہ و دل فرش را کیے منتظر کھدا تھا کہ اللہ کے جیب ﷺ کی میزبانی کا شرف اسے حاصل ہو اور وہ اپنی قسمت پر نماز کرے۔ دریں اشتعاء بنو نجاشی کی لڑکیاں، جو دراصل آپ کا تھیاں خاندان تھا، خیر مقدمی گیت گاری تھیں جس کے الفاظ یہ تھے:

طلَّعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا، مِنْ ثَنَيَاتِ الْوَدَاعِ وَجَبَ السُّكُونُ عَلَيْنَا، مَا دَعَنِي اللَّهُ دَاعِ
ترجمہ: ”وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا، ہم پر شکر واجب ہے، جب تک اللہ کی طرف بلانے والا بلا تاری ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے اپنے جال شاروں اور پردانوں سے فرمادیا تھا: ”میری اونٹی کا راستہ چھوڑ دو، کیونکہ یہ اللہ کی جانب سے مامور ہے۔“

چنانچہ اس کا راستہ چھوڑ دیا گیا اور وہ باذن الہی حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دولت کدے پر جا کر رک گئی، آپ نے شروع میں وہیں قیام فرمایا اور حضرت ابوالیوب

رضی اللہ عنہ کو کائنات کے سب سے عظیم مہمان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا، ان کی میزبانی اور خدمت گزاری ایک مستقل عنوان ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

آپ کی تشریف آوری کے ساتھ "یثرب" کا نام " مدینہ" قرار پایا اور اس کی آب و ہوا میں خیر و برکت کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ آپ نے سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی جس کے لیے زمین دوستیم بچوں سے قیمتا خریدی گئی، پھر ازاد و ارج مطہرات کے لیے حجرہ لی کی تعمیر ہوئی اور آپ وہی منتقل ہو گئے۔

مواخات:

مہاجرین صحابہ کرام اگرچہ میں صاحب حیثیت تھے، ان کے مکانات کا روا بار اور اموال سب کچھ تھا، مگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں سب کچھ چھوڑ کر آگئے تھے گویا انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے ایمان بجا لیا تھا اور اب وہ بے سر و سامانی کے عالم میں تھے، انکی مجموعی تعداد تقریباً ۲۵ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیر مسجد نبوی کے بعد مہاجرین اور انصار کو انس بن مالک کے مکان پر جمع فرمایا اور ان میں رشتہ اخوت قائم فرمادیا، انصار سے فرمایا: "یہ تمہارے بھائی ہیں"۔

انصار نے اس دعوت پر دل وجہ سے لیکی کہا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہاجر اور ایک انصاری کو بلاستے اور فرماتے تھے وہوں بھائی ہو، اس اخوت کی چند نمایاں مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت ابو بکر اور حضرت خارجہ بن زید، حضرت عمر اور حضرت عتبان بن مالک، حضرت عثمان اور حضرت اوس بن هابت، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور حضرت سعد بن معاذ، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سلامہ، حرج مصعب بن غمیر اور حضرت ابوالیوب انصاری، حضرت عمر بن یاسر اور حضرت حدیفہ، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت منذر، حضرت سلمان قاری اور حضرت ابوالدرداء، حضرت عبد الرحمن بن عوف اور سعد بن ربع، حضرت سعید بن زید اور حضرت ابی بن کعب، حضرت بلاں اور حضرت ابو ویک رضی اللہ عنہم۔

یہ تاریخ انسانی کا یک ایسا بعديم المثال واقعہ ہے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انصار صحابہ کرام نے اپنے مکان، مال و متاع، نخلستان اور اراضی نصف نصف کیں، نصف حصہ اپنے پاس رکھا اور نصف حصہ اپنے مہاجر بھائی کو دے دیا۔ انصار زراعت پیشہ تھے اور مہاجر بالعموم تجارت پیشہ، اس لیے انصار نے یہ بھی پیشکش کی کہ وہ مہاجرین کے حصہ کے نخلستانوں اوزمینوں میں کاشت بھی خود کریں گے اور پیداوار اپنے مہاجر بھائی کو دے دیں گے۔

حضرت سعد بن زبیر نے اپنے مہاجر بھائی عبد الرحمن بن عوف سے کہا: میری دو بیویاں ہیں، ایک کو آپ پسند کر لیں، میں اسے طلاق دے دیتا ہوں اور آپ اس سے نکاح کر لینا، شاید تاریخ اس ایشارہ کی مثال قیامت تک نہ پیش کر سکے۔

مگر دوسری جانب مہاجرین صحابہ کرام نے بھی خودداری سے کام لیا، اس ایشارہ کی تدریض کی مگر اس سے نامناسب فائدہ نہیں اٹھایا، چنانچہ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے ان کی پیشکش پر ان کا شکریہ ادا کیا، مگر اسے قبول نہیں کیا، نہ مال میں سے حصہ لیا، بلکہ یہ کہا کہ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے۔ حضرت سعد نے انھیں ”بنو قیقاع“ نامی بازار کا راستہ بتا دیا، انھوں نے اللہ کا نام لے کر تجارت شروع کر دی، چند روز میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ شادی بھی کر لی اور فرماتے تھے کہ میرا حال یہ ہے کہ مئی کو ہاتھ لگا تاہوں تو سونا بن جاتی ہے، ان کا سامان تجارت لے اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور شہر میں وہوم مجھ جاتی تھی۔

مگر یہ ہر شترے اخوت اتنا مسکم اور حقیقی تھا کہ کسی انصاری صحابی کا انتقال ہوتا تو اس کی جائیداد اور مال بصورت ترکہ مہاجر بھائی کو ملتا اور اسکے نبی وارث محروم رہتے، یہ اللہ کے اس ارشاد کی تعییل تھی:

”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَهَدُوا إِلَيْا مُوَالِهِمْ وَأَنْفَسُهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ أَوْدَا
وَنَصَرُوا وَأُولَئِكَ بَعْضُهُمْ أَذْلِيَاءٌ بَعْضٌ“۔

ترجمہ: ”وہ لوگ جو ایمان لائے اور بحرثت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا

اور وہ لوگ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ سب ایک دوسرے کے
وارث ہیں، (الانفال: 72)۔

بعد میں جب البقرہ: 180 نازل ہوئی تو مہاجرین و انصار بھائیوں کی باہمی و راثت کا طریقہ
کا منسوب ہو گیا اور نبی و راثت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

۲۲ ہجری میں جب بن نفیر جلاوطن ہوئے اور ان کے اموال واراضی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا: ”اگر تم چاہو تو بن نفیر کے
اموال تم میں اور مہاجرین میں تقسیم کر دیتا ہوں اور مہاجرین تمہارے گھروں اور اموال پر
بستور قابض رہیں گے، اگر چاہو تو یہ اموال مہاجرین کو بائیٹ دیتا ہوں اور وہ تمہارے اموال
اور گھروں سے بے دخل ہو جائیں گے“، اس پر انصار نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!
”ہمارے اموال بھی ان کے پاس رہنے دیجیے اور یہ نئے اموال بھی ان میں تقسیم فرمادیجیے،
اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر دعا فرمائی: ”اے اللہ! تو انصار اور ابناۓ انصار پر رحم
فرما، (بل الہدیٰ والرشاد: ج 4 ص 325)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے انوارِ نبوت اور علومِ نبوت سے فیض یا ب فرمایا
تھا، اس لیے آپ پر نہ صرف یہ کہ لوگوں کے ظاہری احوال اور صلاحیتیں عیاں تھیں، بلکہ ان
کی باطنی اور مخفی صلاحیتیں بھی آپ پر مکشف تھیں، پھر مہاجرین صحابہ کرام بارگاہِ نبوت کے
فیض یافتہ اور تربیت یافتہ تھے۔ جب کہ انصار کو بھی تربیت اور تزکیہ کی منزل سے گزر کر
کندن بناتھا، چنانچہ یہ حکمتِ نبوت کا کارنامہ تھا کہ آپ نے جن دو مہاجر و انصار صحابہ میں
رشتہِ اخوت قائم کیا، ان میں افتادیع، ذوقِ نظر، فکر و عمل اور اہمیت اور صلاحیت میں یگانگت
موجود تھی، جس کی بدولت انصار نے کما حقہ، اکتاب فیض کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ
ساتھ دلوں کے رشتہ مسحکم ہوتے گئے اور بعد میں غزوہات بدر و احد و حدیبیہ و فتح کہ
کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اسلام میں حقیقی اخوت اور اصل رشتہ دین و ایمان اور اسلام
کا ہے، اس کے مقابلے میں باقی سب رشتے بیچ ہیں۔

بیثاق مدینہ:

مدینہ منورہ اور اس کے نواح میں اوس و خزرج کے مقابل کے قبائل کے خلاودہ یہود کے تین بڑے قبائل آباد تھے یعنی بنو قیفیق، بنو ضیرا اور بنو قریظہ۔ یہود نے اگرچہ مذہب کو اپنی رنگ دے دیا تھا، مگر ظن غالب یہ ہے کہ یہود مدینہ عربی انسل تھے، اس لیے ان کی عادات و اطوار اور خصوصیات بھی عربوں سے ملتی جلتی تھیں۔ انصار کے مقابل اوس اور خزرج جنگ بعاث کی وجہ سے آپس میں لڑ کر کمزور پڑ چکے تھے اور یہود کی کوشش ہمیشہ یہ رہتی تھی کہ وہ متحده ہونے پائیں۔

رسول اللہ ﷺ انسانیت کے لیے ہادی کامل تھے۔ آپ کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھیں اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح دینی بصیرت کاملہ مرحمت فرمائی تھی اسی طرح سیاسی بصیرت میں بھی آپ اسوہ حسنہ اور نمونہ کامل تھے، چنانچہ آپ نے اہلی ترین سیاسی و انتظامی بصیرت اور دفاعی حکمت عملی کا اظہار فرمایا اور جدید مہذب دنیا کے لیے تاریخ انسانیت کا پہلا بین الاقوامی ”بیثاق امن“ معاہدہ بقاۓ باہمی و امن و آشتی مرتب فرمایا اور انصار مدینہ اور یہود دونوں فریقوں نے اسے منظور کیا، اس معاہدے کی اہم دفعات مندرجہ ذیل ہیں:

- ۱۔ خوں بہا اور فدیہ کا سابقہ طریقہ قائم رہے گا۔
- ۲۔ ہر دو فریق کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی، ایک دوسرے کے دین سے تعریض نہیں کریں گے۔
- ۳۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے خیر خواہ رہیں گے۔
- ۴۔ یہود یا مسلمانوں کی کسی سے جنگ ہوئی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔
- ۵۔ کوئی فریق قریش اور ان کے معاونین کو امان نہیں دے گا۔
- ۶۔ مدینہ پر کسی نے حملہ کیا تو دونوں فریق مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔
- ۷۔ اگر ایک فریق کسی سے صلح کرے گا تو دوسرا فریق بھی اس معاہدت میں شامل ہو گا، لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنی ہو گی۔

۸۔ اگر فریضیں میں ایسا اختلاف پیدا ہو جائے کہ جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو اس کا فیصلہ اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا جائے گا۔
۹۔ مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

لئے مکہ:

سن ۶۵ میں معاهدہ حدیبیہ کے موقع پر طے پایا تھا کہ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی۔ نیز قبائل عرب مسلمانوں یا قریش مکہ جس کے حیف بنا چاہیں بن سکتے ہیں، چنانچہ بونخزادہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل گئے اور بونبکر قریش سے مل گئے اور عرب میں حیف کی حمایت لازم تھی۔

بونبکر نے قریش کے ساتھ مل کر بونخزادہ پر حملہ کر دیا اور انہیں بے دردی سے مارا، حرم کے قدس کو بھی پامال کیا۔ بونخزادہ نے حرم کے قدس کا خیال کیا اور کہتے رہے کہ اپنے خدا کے واسطے ہمیں چھوڑ دو، تو مشرک جواب میں کہتے：“آج کوئی خدا نہیں ہے”， اس طرح قریش نے یک طرفہ طور پر معاهدہ توڑ دیا، نیچ بچا کر کچھ لوگوں نے جا کر مدینہ منورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد مکہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو آپ دس ہزار کا لشکر لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اپنے تمام ملینوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ فرمادیا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ جوابنے اہل و عیال کے ہمراہ عازم مدینہ تھے، جنہے کے مقام پر حاضر خدمت ہوئے۔ اہل و عیال کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا اور خود لشکر اسلام میں شامل ہو گئے۔ آخری پڑاؤ مکہ سے کچھ دور ”مرالظہر ان“ کے مقام پر تھا، آپ نے لشکر اسلام کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مختلف دستوں کی شکل میں منتشر کر دیا اور حکم دیا کہ سب الگ الگ آگ جلائیں۔

رات کے وقت جب اہل مکہ نے وسیع علاقے میں اس قدر آگ کی روشنی دیکھی تو حیرت زده اور دہشت زده ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے ابوسفیان کو تحقیق احوال کے لیے بھیجا۔

خیمہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے اسے گرفتار کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔
حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ترغیب سے ابوسفیان مسلمان ہو گئے اور کلمہ اسلام پڑھ لیا۔
اس کے بعد مسلمان فاتحانہ اندار میں مکہ معظمه کی طرف بڑھے۔ مختلف قبائل کے
لشکر آگے بڑھتے رہے، پھر انصار کا دستہ آیا اور اس کے بعد مہاجرین کا انصار کے علمبردار

حضرت سعد صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور مہاجرین کے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو مندرجہ ذیل ہدایات دیں اور بالائی جانب سے
مکہ میں داخل ہوئے:

۱۔ جو ہتھیار ڈال دے اسے قتل نہ کیا جائے۔

۲۔ جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے، اسے قتل نہ کیا جائے۔

۳۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔

۴۔ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا، اسے امان دیا جائے گا۔

اس اعلان کے بعد لشکر اسلامی پر امن طریقے سے مکہ میں داخل ہوا، صرف عکرمہ
اور صفویان نے چند نوجوانوں کے ہمراہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا راستہ روکنا چاہا اور
دو مسلمان شہید ہو گئے، مگر مقابلے کے بعد وہ تیرہ مقتول چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو
جب معلوم ہوا کہ یہ جھڑپ قریش کی جانب سے پہل کرنے پر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا: ”قضاءِ الہی بہتر ہے“۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیمہ میں تھوڑی دیر آرام فرمایا اور پھر اپنی اونٹی قصوا پر حضرت
اسامہ بن زید کی معیت میں زرہ پوش صحابہ کرام کے لشکر کے جلو میں کعبۃ اللہ کی طرف روانہ
ہوئے، آپ نے پہلے حجر اسود کو بوسادیا، پھر بیت اللہ کا طواف فرمایا، بیت اللہ اور اس کے
اروگرد ۳۶۰ بُت رکھے ہوئے تھے، آپ نے کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک کیا، آپ ایک ایک

بت گراتے جاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے:

”جَاءَ الْحَقُّ وَرَأَهُ الْبَاطِلُ ۖ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا“۔

ترجمہ: "حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے ٹک باطل کو نہایت ہے، (بی اسرائیل: 81)۔"

پھر آپ نے عثمان بن طلحہ سے کنجی لے کر دروازہ کھولا اور جسموں کو ہٹایا اور تصویروں کو مٹایا۔ آپ نے اس پر نماز شکرانہ ادا کی اور بیت اللہ کی چوکھ پر کھڑے ہو کر

پڑھ دیا:

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں، اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور لشکر کفار کو تہہ شکست دی، جملہ مفاخر جاہلیت، خونی انتقام یا مال (خون بہا) میرے قدموں کے نیچے ہیں سوائے بیت اللہ کی تولیت اور حجاج کو پانی پلانے کی خدمات کے (جو برقرار رہیں گی)، قتل خطا جو قتل عمد کے مشابہ ہو (کوڑے یا لاثی سے) اس کی دیت ۱۰۰ اونٹ ہیں، جن میں سے چالیس حاملہ اونٹیاں ہوں گی، اے گروہ قریش! اللہ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور نسب کا افخار دور کر دیا، سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے ہیں، (منداحمد: 15388)۔

خطبے کے بعد آپ نے قریش کے مجمع کی طرف دیکھ جو شرمسار اور سرگاؤں تھے، انہی کے مظالم، تم رانیاں اور زیادتیاں ان کے ذہنوں میں تازہ تھیں۔ نبی ﷺ اگر ان کے مظالم کا حساب چکاتے تو عین النصف ہوتا، آپ کا ایک اشارہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے کافی تھا، مگر رحمۃ للعالیمین ﷺ کے سیل کرم کی ایک موج ان کی تمام خطا کاریوں کو پاک کر لے گئی، آپ نے دریافت فرمایا:

"اے قریش تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو، انہوں نے کہا: نیکی کی! آپ شریف بھائی اور شریف برادرزادے ہیں، یہ سن کر رحمۃ للعالیمین ﷺ نے فرمایا: آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں تم سب آزاد ہو، (بل الہدی والرشاد: ج 5 ص 242)۔"

چنانچہ آپ ﷺ نے عفو عام کا اعلان فرمادیا، اس عفو عام سے صرف نو دس افراد مٹتی تھے، ان کے جرم کی نوعیت مختلف تھی، اس میں حضور ﷺ کی ذاتیات کا دخل نہیں تھا۔ فتح مکہ کے بعد اور آپ ﷺ کے حسن اخلاق سے منتشر ہو کر لوگ جو ق در جو ق

اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ نہ صرف قریش مکہ بلکہ دیگر قبائل عرب بھی حلقہ بگوش اسلام ہوتے چلے گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں سارے جزیرہ نماۓ عرب میں صرف اسلام کا سکھ چلنے لگا، خانہ کعبہ اب اللہ کی توحید کے نعروں سے گونجنے لگا اور اس میں صرف اس ذات وحدۃ لا شریک کی عبادت ہونے لگی جس کے لیے اسے بنایا گیا تھا۔

حجۃ الوداع:

فتح مکہ کے بعد اسلام اطراف عرب میں پھیلتا چلا گیا، فتح کے موقع پر آپ نے عمرہ ادا کیا، ۹ھ کو حج فرض ہوا، اس سال آپ خود حج پر تشریف نہیں لے گئے بلکہ حضرت ابو بکر صدیق کو امیر الحج مقرر فرمایا، پھر جب "حرمت حرم" کے بارے میں آیات نازل ہو گیں تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تا کہ یہ احکام موسوم حج میں سنادیے جائیں کہ آئندہ حدود حرم میں کسی کافر اور مشرک کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اسی طرح تمام کافرانہ اور مشرکانہ رسوم جو حج کے نام پر راجح ہو چکی تھیں ان کی ممانعت کا بھی حکم نافذ کر دیا جائے۔

۱۰ھ کو رسول اکرم ﷺ میں مختار ہیں صحابہ کرام کی ایک کثیر جمعیت کے ساتھ سفر حج پر روانہ ہوئے، ۲۳ ذی القعده کو خطبہ جمعہ میں آپ نے احکام حج بتائے اور ۲۵ ذی القعده کو سفر پر روانہ ہو گئے، ذوالحجۃ کے مقام پر احرام حج باندھا۔ سفر کے اختتام پر بیت اللہ پہنچ کر آپ نے طواف کیا، سعی کی اور فرمایا: "جو قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے وہ اس طواف اور سعی کو عمرہ قرار دیں اور احرام کھول دیں (اے تمتع کہتے ہیں)، آپ ﷺ نے خود "قرآن" کی نیت فرمائی (یعنی حج اور عمرے کی ایک ساتھ نیت فرمائی)۔

۸ ذوالحجۃ کو منی روانہ ہوئے اور وہاں پانچ نمازیں ادا فرمائیں اور حکم دیا کہ آپ کے لیے نمرہ کے مقام پر ایک خیمه لگا دیا جائے۔ ۹ ذوالحجۃ کو سورج نکلنے کے بعد آپ عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی دن آفتاب ڈھل جانے کے بعد آپ اپنی ناقہ قصوا پر سوار ہوئے اور وادی عرفہ کے درمیان اوثنی کی پشت پر سے لوگوں کو مشہور "خطبہ حجۃ الوداع"

ارشاد فرمایا۔

اس موقع پر صحابہ کرام کی کثیر تعداد آپ کے سامنے تھی، مشہور روایات کے مطابق ان کی تعداد کم و بیش سو لاکھ تھی، فرضیت حج کے بعد یہ آپ کی زندگی کا پہلا اور آخری حج تھا۔ اسے جستہ الوداع اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں مختلف موقع پر آپ نے الوداعی کلمات ارشاد فرمائے جن سے اشارہ ملتا تھا کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔

خطبہ جستہ الوداع:

یہ آپ کی حیات مبارکہ کا مشہور ترین خطبہ ہے اور اس کے بعض کلمات حد تواتر کو پہنچ ہوئے ہیں، یہ خطبہ آپ کی ۲۳ سالہ نبوی تعلیمات کا جوہ اور نچوڑ ہے، یہ انسانی مساوات و حریت اور حقوق انسانی کا پہلا منشور ہے جو انسانیت کے سامنے پیش کیا۔ حقوق نسوں کی یہ پہلی تاریخی دستاویز ہے۔

تاریخ انسانی کی کوئی دستاویز، کوئی منشور اور کوئی آئینہ ایسا نہیں جوابی صداقت، ابدیت، آفاقیت اور ہمہ گیریت کی بنا پر چودہ سو سال بعد بھی روز اول کی طرح زندہ و تابندہ ہو۔ انسان نے کئی منشور دیکھے، کئی قانون اور کئی آئینے بنے، لیکن وہ مٹتے رہے، بدلتے رہے مگر یہ منشور انسانیت آج تک نہ مٹا ہے نہ مٹے گا، نہ بدلتا ہے نہ بدلتے گا۔ انسانی حقوق کے ہر چارٹر، ہر دستاویز اور ہر میثاق میں اس کا عکس نظر آئے گا، اس کے زریں الفاظ یہ ہیں:

”فَإِنْ دِمَاءُكُمْ وَأَمْوَالُكُمْ وَأَعْنَاسُكُمْ، بِيَنْتَهِ كُمْ حَرَافٍ، كَحُنْمَةٍ يَوْمَكُمْ هُذَا، فِي شَهْرِكُمْ هُذَا، فِي بَلَدِكُمْ هُذَا“۔

ترجمہ: ”لوگو! تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت و آبرو (قيامت) تک ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے، جس طرح آج کے دن، اس مہینے اور اس شہر میں حرام ہے۔“

(صحیح البخاری: 67)

سنو! جاہلیت کے تمام دساتیر اور رسوم و رواج کو میں اپنے قدموں سے پاماں کرتا

ہوں، زمانہ جاہلیت کے تمام خون اور انتقام باطل کر دیے گئے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے ایک فرد ربعیہ بن حارث بن عبد المطلب کے خون کو معاف کرنے کا اعلان کرتا ہوں، زمانہ جاہلیت کے تمام سود تقاضے اور واجبات ختم کر دیے گئے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کا سود معاف کرتا ہوں، (البتہ اصل زر کو آپ نے باقی رکھا) اور لوگو! عورتوں کے حقوق کے معاملے میں اللہ سے ڈرو، تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر (عقد نکاح میں) لیا ہے اور اسی کے قانون سے ان سے استفادہ تمہارے لیے حلال قرار پایا ہے۔ تمہارا ان پر حق یہ ہے کہ وہ تمہاری عزت و ناموس اور اپنی عصمت و عفت کا تحفظ کریں اور تمہارے ناپسندیدہ شخص کو آنے اور میل جوں کی اجازت نہ دیں، اگر وہ ایسی غلطی کریں تو تنہیہ کے طور پر ان کو مناسب سزا دے سکتے ہو جو خفیف ہو، عورت کے لیے بھی اپنے شوہر کے مال میں خیانت جائز نہیں اور ان کا نان نفقہ اور لباس وغیرہ ضروریات کی کفالت احسن طریقے سے کرنا تم پر لازم ہے۔ میں تم میں ایک چیز چھوڑ کر جارہا ہوں اور اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گراہ نہ ہو گے، وہ ہے: کتاب اللہ۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ کسی کا لے کو گورے پر نہ کسی گورے کو کا لے پر، تم سب آدمی کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے، جو خود کھاؤ وہی اپنے غلاموں کو کھلاو اور جو خود پہنہو، وہی انھیں پہناؤ، خدا نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا، اب کسی دارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، جو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور سے اپنے کو منسوب کرے اور جو غلام اپنے آقا کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنی نسبت کرے، اس پر خدا کی لعنت، ہر مجرم اپنے جرم کا ذمہ دار ہے، باپ کے جرم کا ذمہ دار بینا نہیں اور بیٹے کا جواب دہ باپ نہیں، اس کے بعد آپ نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا:

”تم سے قیامت میں میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟“
سب نے بے یک آواز عرض کیا: ”ہم گواہی دیتے ہیں اور قیامت میں بھی دیں گے کہ آپ

اللہ نے اللہ کا پیغام ہدایت ہم تک پہنچا دیا اور حق تبلیغ ادا کر دیا اور نصیحت و خیر خواہی میں کوئی کسر اٹھانیں رکھی۔ اس پر آپ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور مجمع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین دفعہ فرمایا: ”اے اللہ! تو گواہ رہنا کہ میں نے تیرا پیغام اور تیراد دین تیرے بندوں تک پہنچا دیا، پھر آپ نے فرمایا:

”سنو! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ امانت ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں (یعنی بعد میں قیامت تک آتے رہیں گے)، (بل الہدی والرشاد: ج 11 ص 94)۔“

مددینہ منورہ میں سیرۃ طیبہ کے اہم واقعات

۱) ہجری: مسجد نبوی کی تعمیر، مواخات انصار و مہاجرین، یثاق مدینہ۔

۲) ہجری: تحویل قبلہ، اذان کی ابتداء، رمضان کے روزوں کی فرضیت، زکوٰۃ کا حکم، صدقہ فطر کا وجوب، جہاد کا حکم۔

۳) ہجری حرمت شراب، پردے کا حکم۔

۴) ہجری فرضیت حج۔

غزوات:

* غزوہ احد ۳ ہجری

* غزوہ بنی نضیر ۴ ہجری

* غزوہ احزاب ۵ ہجری

* غزوہ حدیبیہ بیعت رضوان ۶ ہجری

* فتح ک مد ۸ ہجری

* غزوہ حنین ۸ ہجری

* غزوہ تبوك ۹ ہجری

* والیان ملک کو دعوت اسلام اور فود کی آمد ۹ ہجری

اہم سوالات

اسوہ حسنہ

- ۱۔ اعلان نبوت کے بعد رسول اللہ ﷺ کو کون صبر آزماء مراحل سے گزرتا پڑا، تفصیل سے بیان کیجیے۔
- ۲۔ رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی طریقہ تبلیغ اور آداب تبلیغ بیان کیجیے۔
- ۳۔ ”بیت المقدس“ اور اس کی شرائط بیان کیجیے۔
- ۴۔ فتح مکہ اور رسول اکرم ﷺ کی شان رحمت پر ایک نوٹ لکھیے۔
- ۵۔ ”خطبہ حجۃ الوداع انسانی وقار حریت، مساوات اور حقوق انسانی کا پہلا جامع منشور ہے“، ثابت کیجیے۔

اسلام کی اخلاقی اقدار اور

اسلامی معاشرے کے بنیادی اوصاف

ہر حیوان، ہر جاندار اور ذکری روح اپنی حیات و بقا اور نشوونما کی جدوجہد میں مصروف عمل ہے، انسان بھی ایک حیوان ہے۔ انسان کے علاوہ جتنے بھی حیوانات ہیں وہ بقائے نوع اور افزائش نسل کے لیے تو ضرور اپنی صنف مخالف کے محتاج ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملہ اور حکمت کے تحت دوسرے تمام جانوروں، چرند، پرند اور حشرات الارض کو ایسی جسمانی ساخت عطا فرمائی ہے کہ ان کا ہر ہر فرد انفرادی طور پر اپنی بقائے حیات کی تگ و دو میں خود کفیل ہے۔ کسی کوشکار کے لیے تیز دانت دیے ہیں، کسی کو تیز پنجے یا چونچ عطا کی ہے۔ موسم کی شدت وحدت سے تحفظ کے لیے مخصوص جسمانی ساخت اور داخلی و خارجی قوت مدافعت، ہر ایک کے لیے اپنی اپنی نوع اور احوال کے اعتبار سے چلنے، زینٹنے، تیرنے، اڑنے اور دیگر حسب حال صلاحیتوں کے علاوہ اپنی روزی کے حصول اور مناسب حال خواراک کے تعین کا شعور بھی جلی طور پر عطا کیا ہے۔ اگرچہ بعض جانوروں میں ماہر حیوانیات نے کسی حد تک اجتماعی شعور کا پتا بھی چلا�ا ہے، لیکن اسے بھی محدود ہی کہا جا سکتا ہے۔

اس کے عکس انسان مدنی الطبع، اجتماعیت پسند اور بقول کے معاشرتی حیوان ہے۔ ہندا وہ اپنی بقائے حیات، نشوونما، افزائش نسل اور حوانج و ضروریات کی تکمیل کے لیے ابناۓ جنس کا محتاج ہے، دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو اپنی حاجات و ضروریات مثلاً: مکان، خواراک، لباس، علاج معاجز، تعلیم و تعلم بقائے نوع، دشمن سے مدافعت اور جسمانی و روحانی تقاضوں کی تکمیل کے لیے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا محتاج نہ ہو۔

لہذا مل جل کر رہنا اس کی جسمانی، روحانی طبعی اور جلی ضرورت ہے، اسی باہم مل جل کر رہنے، دوسروں کی مدد کرنے اور دوسروں سے مدد حاصل کرنے کا نام معاشرت اور اجتماعیت پسندی ہے۔

جب چند افراد باہم مل جل کر رہیں گے تو ایک معاشرہ از خود وجود میں آجائے گا اور معاشرے کی اولین ضرورت توازن و اعتدال ہے اور اس کے مختلف افراد اور عناصر کے درمیان حقوق و فرائض کا ایک منظم اور مربوط ڈھانچہ ضروری ہے۔ پھر زیر دست کو زبردست، مظلوم کو ظالم، مجبور کو جابر اور بے بس و بے کس کو صاحب قوت و حیثیت کے جور، جبر ظلم اور زبرتی سے بچانے کے لیے ایک ہیئت حاکم (Governing Authority) اور نظم اجتماعی کا ہونا اشد ضروری ہے، ورنہ توازن و اعتدال کے بغیر معاشرہ درہم برہم ہو جائے گا اور فساد بر بادی اور ہلاکت اجتماعی کا شکار ہو جائے گا۔

اس طرح ہم خیال افراد کے معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک محدود اور معین خطہ میں کا ہونا بھی ضروری ہے جس کے نتیجے میں مملکت (State) تشکیل پاتی ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ افراد معاشرہ میں اشتراک فکر و عمل کی ٹھوس اور پاندار بنیاد بھی ہو۔

مملکت، حکومت اور سوسائٹی کے لیے ایک اساسی آئین، قانونی نظام کی بنیاد پر نظر ڈالیں تو ہمیں مختلف معاشروں، مملکتوں، حکومتوں اور اقوام کے افراد کے مابین اشتراک کی چند بنیادیں نظر آتی ہیں، مثلاً: رنگ و نسل کا رشتہ، سماںی رشتہ، جغرافیائی وحدت کا رشتہ یا نظریاتی رشتہ اور یہ نظریات یا تو انسان کے خود ساختہ ہیں یا مذاہب سے نفرت بغاوت کے رد عمل کا نتیجہ ہیں، مکمل لا دینیت یعنی سیکولر ازم یا مذاہب کے تحریف شدہ اور سخ شدہ تصورات پر مبنی ہیں، اس لیے ان میں جزوی طور پر تو خوبیاں ہو سکتی ہیں یا محض ایک آدھ پہلو تو دکش و دلاؤیز ہو سکتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان میں انسانیت کے لیے تعمیر کی بجائے تخریب اور آبادی کی بجائے ویرانی و بر بادی، صلاح و فلاح کی بجائے فساد، اتحاد کی بجائے انتشار و افتراق، حقیقی ترقی کی بجائے تنزل اور مادی و روحانی تقاضوں کی تکمیل اور توازن و

اعتدال کی بجائے افراط و تفریط نمایاں نظر آئے گی، گویا: ”میری تعمیر میں مضر ہے اک صورت خرابی کی“۔

لیکن اس کے برعکس اسلام امیں افراد کے درمیان اشتراک کی اساس، رنگ و نسل، زبان اور خود ساختہ نظریات کی بجائے اللہ کی عطا کردہ ایک ہمہ گیر، عالمگیر، ابدی و لا فانی عقیدے و نظریے پر قائم ہے، جو تو حیدور سالت اور آخرت کے غیر متزال اور مستحکم عقائد پر مبنی ہے۔

چونکہ یہ نظریہ اللہ کا عطا کردہ ہے، اس لیے اس میں تنگی کی بجائے وسعت، فساد کی بجائے صلاح، زمان و مکان کی قیود کی بجائے آفاقیت، رنگ و نسل اور زبان کی تقسیم کی بجائے وحدتِ فکر اور عقائد کی یگانگت، افراط و تفریط کی بجائے توازن و اعتدال اور دُنیا آخرت دونوں کی فلاج و کامرانی ہے۔

اخلاق

اسلام معاشرے کے بگاڑ کی اصلاح و طرح سے کرتا ہے: ایک خارجی اسباب و عوامل سے اور دوسرا داخلی محرکات و ترغیبات سے، خارجی ذرائع سے مراد اجتماعی عدل، قانون کا احترام و پابندی، اجتماعی معاملات میں شورائیت یعنی تمام افراد معاشرہ کی بالواسطہ یا بلا واسطہ شرکت، حسنات کا فروغ اور سینمات کا قلع قع، اللہ اور اس کے رسول کے احکام اور امر و نوای اور حدود کا نفاذ وغیرہ ہیں۔

داخلی محرکات سے مراد اسلام کا جامع اصلاحی اخلاقی نظام ہے، جس کے نفاذ کے لیے بیرونی محرکات سے زیادہ فرد کی داخلی اصلاح ہے۔ اس سے مراد اسلام کی اخلاقی اقدار کا تہہ دل سے قبول کرنا اور اپنے کردار کو ان کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ اخلاق ”خلق“ کی جمع ہے اور خلق سے مراد وہ طبی خصلت و عادت ہے جو انسان کے مزاج میں رچ بس جائے اور انسان اس پر عمل کرنے میں کوئی تکلیف و تکلف محسوس نہ کرے۔ مستقل عمل اور طبی متأبست سے یہی چیزیں انسان کی جبلت اور فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں اور انسان کے ذہن،

مزاج اور طبیعت میں ان کا تقاضا اور داعیہ (Demand) بالکل اسی طرح بے تکلف اور بے ساختہ پیدا ہے جیسے انسان کے دیگر طبعی تقاضے ہیں مثلاً بھوک اور پیاس وغیرہ۔ اخلاق کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو اخلاقی عالیہ، فاضلہ اور حسنہ کہلاتے ہیں، جو دراصل انسانیت کا دوسرا نام ہے، افتخار انسانیت ہے اور اعزاز انسان ہے جس کی بناء پر انسان رشک ملائک بن جاتا ہے۔ دوسری قسم اخلاق رذیلہ، خسینہ اور سینہ کہلاتے ہیں، یہ نگ انسانیت ہیں جو لباس انسانیت میں درندگی، رذالت اور کمینگی کو فروغ دیتے ہیں، اسی کے بارے میں مولانا جامی نے کہا ہے:

آدمیتِ لحم و شحم و پوست نیست!

آدمیتِ جز رضائے دوست نیست

ایں کہ می بینی خلاف آدم اند

عیتند آدم غلاف آدم اند

انہوں نے آدم اور آدمیت یعنی انسان اور انسانیت کا فرق واضح کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بظاہر آدم گوشت پوست کے متحرک و مرتب اور متوازن ڈھانچے کا نام ہے، لیکن محض یہ چیز افتخار آدمیت اور امتیاز انسانیت نہیں ہے، بلکہ محض گوشت پوست اور اس کے مادی تقاضوں کی تکمیل تو انسان کے حیوانی لوازمات ہیں۔ انسانیت تو رضائے الہی اور اطاعتِ رسول کے تحت زندگی گزارنے کا نام ہے اور جو اس سے عاری ہے وہ آدم و آدمزاد تو ہے، مگر افتخار آدم نہیں بلکہ نگ و عارِ آدمیت ہے۔ ایسے لوگوں نے محض لبادہ انسانیت پہنچ رکھا ہے، جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”أُولَئِكَ كَلَّا نَعَمِ بْلُ هُمْ أَصْلُ“۔

ترجمہ: ”وہ چوپا یوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں، (الاعراف: 179)۔

اللہ نے ہر انسان کو فطرت سیمہ پر پیدا کیا ہے، ارشادِ بیوی میں لفظِ عالم ہے:

”مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُلَدُّ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبْوَاهُ يُهُوَدُ إِنَّهُ أَوْ يُنَصِّرَ إِنَّهُ أَوْ يُسْجِنَسَانِهِ“۔

ترجمہ: ”ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا بھوی بنتے ہیں، (صحیح البخاری: 4775)۔“

یعنی قدرتِ کامل نے معرفتِ خیر کا ذوقِ روحانی و ایمانی ہر انسان کو فطری اور جلی طور پر دیعت فرمایا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح فرمادیا کہ ناسازگار معاشرتی عوامل سے اس میں فائدہ بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے، جیسا کہ ناسازگار آب و ہوا اور غذہ اس کی جسمانی صحت کو بچڑھتی ہے۔ چنانچہ قادرِ مطلق نے تعلیماتِ انیاء کے ذریعے انسان کی مسلسل و متواتر املاج کا اہتمام فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعثت کا ایک اہم مقصد ”اخلاق حسنہ“ کی تکمیل کو قرار دیا ہے، ارشاد فرمایا:

”إِنَّمَا بُعْثُتُ لِأَنِّي مَكَارِمُ الْأَخْلَاقِ۔“

ترجمہ: ”میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں، (مندار البر: 8949)۔“ آئندہ صفات میں ہم اسلام کی چند نمایاں اخلاقی تعلیمات کا مختصر اذکر کریں گے جن پر عمل پیرا ہو کر ہم انفرادی و اجتماعی طور پر خیر و برکت سے سرفراز ہو سکتے ہیں اور دنیوی کامرانی اور آخر دنیوی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

صدق

صدق یعنی ”سچائی“، ابدی اور عالمگیر مسلمہ اخلاقی اقدار میں سے ایک ہے، یہ دنیا کے ہر مذہب، ہر ازم اور ہر فلسفہ اخلاق میں سر فہرست ہے، یہ صفاتِ الہی میں سے ایک اہم صفت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَمَنْ أَصْدَقَ مِنَ اللَّهِ حِدْيَةً؟“

ترجمہ: ”اور اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے، (الناء: 87)۔“ اور فرمایا:

”وَمَنْ أَصْدَقَ مِنَ اللَّهِ قِيلًا؟“

ترجمہ: ”اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات صحی ہو سکتی ہے، (النساء: 122)“ -

صدق انبیاء و مسلمین کی بھی نمایاں صفات میں سے ہے، بلکہ دین کی حقانیت کا انحصار ہی نبی کی صداقت پر ہوتا ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم اور حضرت اوریس کو ”نبی صدقیت“ کے لقب سے متصف کیا ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کو ان کی قوم نے تمام تر مخالفت اور عداوت کے باوجود ”الصادق“ اور ”الامین“ کا لقب دے رکھا تھا۔ ابوسفیان نے اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی قیصر روم کے دربار میں حضور کے صادق ہونے کی گواہی دی ہے، ابی ایمان کو مخاطب کر کے قرآن میں ارشاد ہوا:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تَقُولُوا لِلَّهِ وَكُوٰنُوا مَعَ الصَّادِقِينَ“ -

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو، (التوبہ: 119)“ -

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

”عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبَرِّ وَإِنَّ الْبَرِّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَرَأُ الْرَّجُلُ يَضُدُّقُ وَيَسْتَحْرِي الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ صِدْيقًا“ -

ترجمہ: ”سچائی کو لازماً اپناو، کیونکہ سچائی نیکی کی شاہراہ پر گامزن کر دیتی ہے اور نیکی جنت تک پہنچادیتی ہے، جب کوئی شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے تو اللہ کے ہاں اس کا نام ”صدقیت“ میں لکھ دیا جاتا ہے، (صحیح مسلم: 2607)“ -

ایک روایت میں ہے کہ کسی شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، کیا مسلمان بزدل ہو سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، اس نے پھر دریافت کیا، کیا مسلمان بخیل ہو سکتا ہے، فرمایا: ہاں، اس نے پھر دریافت کیا: کیا مسلمان مجھوٹا بھی ہو سکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں، (موطأ امام مالک: 19)“ -

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان و اسلام کی لازمی صفت ہے اور ایمان و کذب ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔

امام غزالی نے صدق کی چھ اقسام بیان کی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) صدق قول:

انسان جوبات کہے سچی کہے، اسے زبان کی سچائی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) صدق نیت:

انسان کی نیت اور ارادے میں اخلاص ہو، للہیت ہو اور ریا کاری نہ ہو، اسے ”صدق قلبی“ سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ایسی باتیں جو بظاہر خلاف واقع ہوں، لیکن ان سے اصلاح مقصود ہوا اور ان کے پیچھے ”خُسنیت“ کا جذبہ کار فرمایا ہو، شرعاً جائز ہوتی ہیں، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”لَيْسَ الْكَاذِبُ مَنْ أَصْلَحَ بَيْنَ النِّسَاءِ وَقَالَ خَيْرًا أَوْ نَمَى خَيْرًا“۔

ترجمہ: ”جو شخص دوآدمیوں کے درمیان صلح کرنے کے لیے خلاف واقع بات کہہ دے تو وہ حقیقتاً کذاب نہیں ہے، (مندابود الدطیاری: 1761)۔“

(۳) صدق عزم:

ارادۂ خیر میں استحکام ہو، تین ہو اور تردد و تذبذب نہ ہو۔ نیکی کا ہر ارادہ اس کامل عزم و یقین کے ساتھ کرے کہ اگر موقع ملا تو اس پر پورا اُترے گا۔

(۴) صدق وفاء بالعزم:

جب اسباب مہیا ہو جائیں اور قول کو عملی جامہ پہنانے کی قدرت حاصل ہو جائے تو اپنے عزم کو پورا کر دکھائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ لَمْ يَرْتَأُوا وَلَجَهُدُوا إِلَيْهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّابِرُونَ“۔

ترجمہ: ”درحقیقت مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے، پھر اس میں کچھ تک و شبہ نہ کیا اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہی لوگ سچے ہیں“۔

(ال مجرات: 15)

(۵) صدق عمل:

انسان کے قول و عمل میں مکمل مطابقت ہو، کسی طرح کا تضاد نہ ہو، کیونکہ حدیث پاک میں قول و عمل میں تضاد کو منافق کی نشانی قرار دیا گیا ہے:

”إِنَّمَا الْمُنَافِقُ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَثَتْ كَذَبَ قَيْدًا وَعَدَ أَخْلَفَ قَيْدًا وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ“۔

ترجمہ: ”منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے، (صحیح البخاری: 33)۔

(۵) صدق دین:

یہ کہ دینِ اسلام اور ایمان پر اللہ سے عہد کرنے کے بعد اس کی راہ میں جو بھی مشکلات اور رکاوٹیں پیش آئیں، انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور ایمان پر قائم رہنے کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُشَرَّكُوا أَنْ يَقُولُوا أَمَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ“۔

ترجمہ: ”کیا تم نے سمجھ رکھا ہے محض ”امَّا“ (هم ایمان لائے) کا زبانی دعویٰ کرنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا، (العنکبوت: 2)۔

صدق کی ان تمام اقسام میں کسی کو ظاہری طور پر جانچنے اور پر کھنے کا معیار ”صدق عمل“ ہے۔ عملی زندگی میں اور باہمی معاملات میں کسی شخص کی سچائی کا معیار یہ ہے کہ وہ عملاً اپنے دعوے پر کس قدر پورا اترتا ہے، باقی نیتوں کا حال اللہ کو معلوم ہے، مثلاً: ایک تاجر کی صداقت اس کے کاروبار اور لین دین میں، معلم کی درس و تدریس میں اور خادم یا ملازم کی فرائض منصبی کی ادائیگی اور خدمت میں جانچی جائے گی۔

توکل

توکل کے معنی ہیں: بھروسہ اور اعتماد کرنا، اصطلاح شرع میں توکل سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی تاسید و نصرت و حمایت پر بھروسہ کرنا، لیکن توکل کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے، جدو جہد اور سعی عمل سے کنارہ کش ہو جائے۔ بس یہ سمجھ کر بیٹھا رہے کہ سب کچھ عالم غیب سے عطا ہو گا اور اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

توکل کا صحیح مفہوم اور حقیق معنی یہ ہے کہ انسان مقدور بھروسی کرے، تمام ممکنہ وسائل اور ماذی اسباب و ذرائع کو اختیار کرے، تمام حکمتوں اور تدبیر کو اپنانے اور اپنی تمام تراہیت و صلاحیت کو بروئے کار لائے اور اس کے بعد مسامی کے بار آور ہونے، بہترین نتیجہ برآمد ہونے اور حسن عاقبت کے لیے وسائل پر بھروسہ کرے، گھمنڈ میں بتلانہ ہو، بلکہ اللہ کی توفیق اور اس کے فضل پر بھروسہ کرے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

”قَالَ رَجُلٌ يَأْرَسُولَ اللَّهِ! أَعْقِلُهَا وَأَتَوَكَّلُ أَوْ أُطْلِقُهَا وَأَتَوَكَّلُ، قَالَ: أَعْقِلُهَا وَتَوَكَّلُ“۔

ترجمہ: ”ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! میں اپنے اونٹ کو کھلا چھوڑ دوں تو یہ توکل ہے یا باندھ کر چھوڑ دوں یہ توکل ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو باندھ دو اور پھر خدا کی ذات پر توکل کر، (سنن ترمذی: 2517)۔“

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَمَنْ يَسْوَلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ“۔

ترجمہ: ”اور جو اللہ پر توکل کرے گا وہی اُس کو کافی ہے، (الطلاق: 3)۔“

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

”فَإِذَا عَزَّ مُتَفَتَّوْكِلٌ عَلَى اللَّهِ طَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُسْوَكِلِينَ“۔

ترجمہ: ”پس (اے رسول!) جب آپ کسی کام کا پختہ ارادہ کر بیٹھیں تو پھر اللہ پر بھروسہ رکھیں، اللہ توکل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (آل عمران: 159)۔“

اسلام نہ تو غفلت، تسائل، کاملی اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے کی اجازت دیتا

ہے اور نہ اسے جائز سمجھتا ہے کہ امور تکوینی میں اساب وسائل ہی کو وثیر حقیقی سمجھ بیٹھے، اساب کی پرستش کرے اور ”مُنْسَبُ الْأَسَابِ“ کو فراموش کر بیٹھے۔ بلکہ اسلام تو یہ کہتا ہے کہ اگر تمام تر اساب و ذرائع مہیا کرنے کے بعد بھی کامیابی نصیب ہو جائے تو اسے اپنی عقلمندی اور حسنِ تدبیر کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اللہ کی توفیق اور اس کے فضل و کرم کا نتیجہ قرار دینا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ”خود پرستی“ کی بجائے ”خدا پرستی“ کی صراطِ مستقیم پر قائم رہتا ہے اور اس کے برکت مسامعی کی ناکامی کی نسبت اللہ کی طرف کرنے کی بجائے اسے اپنی ”ناکام تدبیر“ پر محمول کرے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”مَا أَصَابَكُ مِنْ حَسَنَةٍ فَإِنَّ اللَّهَ وَمَا أَصَابَكُ مِنْ سَيِّئَةٍ فَإِنَّ اللَّهَ تَقْسِيكُ“۔

ترجمہ: ”تمہیں جو خیر پہنچتی ہے وہ اللہ کے فضل کا نتیجہ ہوتی ہے اور تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، (النساء: 79)۔“

تقویٰ

”تقویٰ“ اسلام کی ایک جامع اصطلاح ہے اور یہ اپنی ہمہ گیریت اور وسعت کی بناء پر تمام تعلیمات پر حاوی ہے۔

تقویٰ کے لغوی معنی ہیں: کسی شے کے شر یا ضرر کی وجہ سے اس سے بچنا، پرہیز کرنا اور اصطلاحِ شریعت میں تقویٰ سے مراد عذابِ الہی کے خوف اور خشیتِ الہی کی بناء پر اللہ کی حدود کو توڑنے، اس کے محaram کا ارتکاب کرنے اور اوامر کے ترک کرنے سے باز رہنا ہے، یعنی تقویٰ کا ثابت پہلو ہے اور امر دینی اور احکاماتِ الہیہ کو پابندی سے ادا کرنا اور ممنوعات و محظماتِ دینی سے مکمل طور پر اجتناب کرنا اس کی تعریف کا منفی پہلو ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ تَقُولُوا اللَّهُ حَقٌّ تُقْتَلُهُ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَآتَنَاكُمْ مُسْلِمُونَ“۔

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور وہ تمہیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو، (آل عمران: 102)۔“

”تقویٰ“ اسلام کی تمام عبادات و احکام کا مدعا و مقصود اور نتیجہ و مطلوب ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور قربانی وغیرہ تمام عبادات کا مطلب یا تو صراحتاً اور یا اشارتاً ”تقویٰ“ ہی کو قرار دیا ہے۔ اسی طرح قرآن نے یہ بھی واضح فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندے کی عزت و شرافت اور فضیلت کا معیار تقویٰ ہے (نہ کہ رنگ و نسل یا زبان و دین وغیرہ)، چنانچہ ارشاد فرمایا:

”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْرَبُكُمْ“۔

ترجمہ: ”بے شک تم میں سب سے زیادہ اللہ کے ہاں عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پڑھیز گا رہو، (الحجرات: 13)۔“

اسی طرح قرآن نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ اگرچہ قرآن کا پیغام ہدایت اور دعوت تمام انسانوں کے لیے ہے، مگر اس شمع ہدایت سے درحقیقت وہی تلوب منور و فروزان ہوتے ہیں جو تقویے سے سرشار ہوتے ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

”هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“، ترجمہ: ”یہ متین کے لیے ہدایت ہے، (البقرہ: 2)۔“

قرآن مجید میں ”تقویٰ“ کا ذکر بے شمار مقامات پر مختلف انداز میں کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ”أَنَا أَرْبَبُكُمْ فَاتَّقُونَ“۔

ترجمہ: ”میں تمہارا رب ہوں مجھ ہی سے ڈرو، (المونون: 52)“، نیز فرمایا:

”وَمَنْ يَتَّقِ اللهَ يَجْعَلُ لَهُ مَحْرَجًا ۝ وَيَرْزُقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ“۔

ترجمہ: ”اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے راہنما نت مقدم رفما دیتا ہے اور اسے اسکی جگہ سے اور اس انداز سے رزق پہنچاتا ہے کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو، (الطلاق: 2-3)۔“

علماء حق نے بتایا ہے کہ تقویٰ کے کتنی درجات ہیں:

- ۱۔ کفر و شرک سے بچنا۔
- ۲۔ تمام کبیرہ گناہوں سے بچنا، یہ عوام کا تقویٰ ہے۔
- ۳۔ صغیرہ و کبیرہ تمام گناہوں سے بچنا، یہ خواص کا تقویٰ ہے۔
- ۴۔ ہر اس چیز سے بچنا جو بندے کو لمحہ بھر کے لیے بھی خدا سے غافل کر دے، یہ اخض الخواص کا تقویٰ ہے۔

ایک عارف کا قول ہے: ”زندگی دریا ہے، آخرت اس کا ساحل مراد ہے اور تقویٰ اس کی کشتی“، ایک صحابی سے تقویٰ کی تعریف دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا: ”یوں سمجھو کر ایک تنگ و تاریک خاردار جھاڑی ہے اور تمہیں اس میں سے گزرنا ہے، اگر تم اس میں سے اپنادا من بچا کر گزر جاؤ، اس طرح کہ تمہارا دامن کانٹوں سے نہ انجھے تو یہ تقویٰ ہے“۔

الیقائے عہد

الیقائے عہد سے مراد اپنے قول و اقرار کی پابندی اور اپنے عہد کی پاسداری اور پابندی ہے۔ دنیا میں جتنے بھی مذاہب راجح ہیں اور جتنے بھی فلسفہ ہائے حیات پائے جاتے ہیں، سب کے نزدیک ”پابندی عہد“ انسانی عزت و وقار، شرافت و عظمت اور عزت و تکریم کی علامت ہے۔

”الیقائے عہد“ دراصل صدق ہی کا ایک ذیلی اور نسبتاً اہم شعبہ ہے، کیونکہ صدق سے مراد ہر قول و عمل، کردار اور عزم و ارادت کی صداقت ہے، جبکہ ”عہد“ اس قول یا تحریر کو کہتے ہیں جسے قسم یا شہادت یاد گیر ذرائع سے مزید محکم اور یقینی بنادیا گیا ہو۔ ہر وہ بات جس میں عزت ہو، اقرار ہو اور اعتراف و تسلیم ہو، اسے ”عہد“ کہتے ہیں۔ عہد بندے اور زب کے درمیان بھی ہوتا ہے، بلکہ ہر بندے نے اللہ تعالیٰ سے ”عالیٰ آئشت“ میں اقرار بوبیت کا عہد کر رکھا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَأَذْفُوا بِعَهْدِي أُذْفَ بِعَهْدِكُمْ“۔

ترجمہ: "تم مجھ سے کیے گئے عہد (ایمان و اطاعت) کو پورا کرو، میں تم سے کیے گئے عہد (فلح و نجات اور جنت) کو پورا کر دوں گا، (البقرہ: 40)"۔
اللہ کا عہد یہ ہے:

"إِنَّ اللَّهَ أَسْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ"۔

ترجمہ: "اللہ نے مومنوں سے ان کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے، (التوبہ: 111)"۔
اس معنی کے اعتبار سے ایمان و اسلام بھی ایک عہد ہے اور ہر شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر
اس عہد کا اقرار کرتا ہے یا اس کی تجدید کرتا ہے۔

صحابہ کرام سے بیعت کے وقت رسول اکرم ﷺ عہد لیا کرتے تھے، جس کا
ذکر قرآن مجید میں بھی ہے، مثلاً: مومن صحابیات کا عہد اور صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام صحابہ
کرام کا عہد وغیرہ۔

عہد کی ایک قسم وہ ہے جو دو افراد دنیوی معاملات میں باہم کرتے ہیں، بشرطیکہ وہ
بات شرعاً جائز ہو اور اس کی تکمیل سے شریعت کی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو، اللہ تعالیٰ کا
ارشاد ہے:

"الَّذِينَ هُمْ لَا مُنْتَهُونَ وَعَنْهُمْ لَا يَعْنُونَ"۔

ترجمہ: "اور (وہ مومن کا میاہ ہو گئے) جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا پاس کرنیوالے ہیں،
(المونون: 8)"، ایک اور ممتاز پر فرمایا:

"وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ مَسْئُولًا"۔

ترجمہ: "اور وعدے کو پورا کرو، بیٹھک وعدے کے بارے میں باز پرس ہو گئی۔

(بنی اسرائیل: 34)

اگر کسی مصلحت کے تحت غیر مسلموں سے اجتماعی طور پر کوئی معاہدہ کیا جائے تو اس
کی پابندی بھی لازمی ہے، تاوقتیکہ فریق مخالف اس معاہدے یا میثاق کی خلاف ورزی کا
مرکب نہ ہو جس طرح رسول اکرم ﷺ نے یہودیین سے "میثاق مدینہ" اور مشرکین مکہ

سے ”معاہدہ حدیبیہ“ کیا اور جب تک دوسرے فریق نے معاہدہ توڑنہ دیا یا اس سے دست برداری نہیں کی، آپ اس پر قائم رہے۔

کسی غیر مسلم سے لین دین یا معاملات کا کوئی معاہدہ کوئی مسلمان انفرادی طور پر کرے تو پورا کرنا چاہیے، کیونکہ یہ مومنانہ وقار اور شرافت انسانی کے عین مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ فُؤَادُكُمْ يُقْرَأُونَ“ -

ترجمہ: ”اے ایمان والو! وعدے پورے کیا کرو، (المائدہ: 1)“،

حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”لَا دِينَ لِنَّ لَا عَهْدَ لَهُ“۔

ترجمہ: ”جو عہد کی پابندی نہ کرے اس کا کوئی دین نہیں یا اس کے دین کا بھی اعتبار نہیں، (مسند احمد: 12383)“۔

آپ نے علاماتِ نفاق میں سے ایک ” وعدہ خلافی“ بھی بتائی۔

مزید یہ کہ صرف اس عہد کی پابندی لازمی نہیں جواہم ہو، بلکہ ہر عہد کی پابندی لازمی ہے، خواہ وہ ہماری نگاہ میں معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ نبی ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بچے سے بھی کوئی کھلونا یا کوئی چیز دینے یا لانے کا وعدہ مخف اسے ثالنے یا بہلانے کے لیے کیا جائے تو اسے بھی پورا کرو، جانور کو بھی جھوٹی میں چارے کالائج دے کر دھوکے سے اسے بلا ناجائز نہیں۔

سادگی

سادگی سے مراد رہن، کہن، نشست و برخاست، طرزِ تکلم، رفتار، چال ڈھال لباس و گفتار، میل ملاپ غرض بود و باش اور حیات کا ایسا انداز جو فطرت سے قریب تر ہو اور ہر طرح کی ملع کاری، تکلف، تصنع، بناؤت و سجاوٹ، مصنوعی زیب و زینت، پر تکلف تزئین و آرائش، امیرانہ مٹھائی بائٹھ، حاکما نہ شوکت و سطوت اور متکبرانہ وضع و قطع اور چال ڈھال اور

آسائش دعیش سے بالکل پاک ہو۔

رسول اکرم ﷺ تمام مخلوق میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب تھے، آپ چاہتے
زور دنیا کی ہرنعمت و آسانی آپ کو میرسر آ جاتی، مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں آپ کے دست
مبارک سے اور آپ کے در سے ملتی تھیں، آپ قاسم انعاماتِ الہیہ تھے، لیکن احادیث
مبارکہ اور سیرت پاک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دنیا اور دنیا کی نعمتوں اور
آشاؤں کو اپنا مطلوب و مقصود نہیں بنایا، آپ فرمایا کرتے تھے:

”مجھے دنیا سے کیا تعلق، میرا تعلق اس دنیا سے اتنا ہی ہے جیسے کوئی مسافر کچھ ذیر کے لیے
ورخت کے زیر سایہ رُک جاتا ہے اور چند لمحے گزار کر سوئے منزل روانہ ہو جاتا ہے۔“

(سنن ترمذی: 2377)

آپ نے نظر کو اختیار کیا مگر یہ فقر اختیاری تھا، کسی اضطرار اور مجبوری کا نتیجہ نہیں تھا، علامہ اقبال
نے کہا ہے:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ شیع غربی میں نام پیدا کر

رسول اللہ ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کے حجرے سادگی کی عملی تصویر
تھے، خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں جب یہ حجرے مسجد نبوی ﷺ میں شامل کر لیے گئے تو
ہمیل بن حنیف فرمایا کرتے تھے:

”کاش وہ حجرے اسی طرح چھوڑ دیے جاتے تاکہ لوگ دیکھتے کہ جس رسول محترم ﷺ کو
دنیا کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں وہ کیسے جھروں اور کیسے چھپروں کے نیچے زندگی
گزارتے تھے۔“

سرورِ عالم ﷺ کی غذا بالکل سادہ تھی، اَتَمُّ الْمُؤْمِنِينَ عَائِشَةَ صَدِيقَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا
فرماتی ہیں:

”إِنَّ كُلَّا لَنْتَظُرُ إِلَى الْهِلَالِ، ثُمَّ الْهِلَالِ، ثَلَاثَةَ أَهْلَةٍ فِي شَهْرٍ، وَمَا أُوْقَدَثُ فِي

أَبْيَاتٍ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَوْزَلَتْ بِهَا خَالَةُ مَا كَانَ يُعِيشُكُمْ قَاتَلَتْ: أَلَا سُودَانٌ
الشَّمْرُ وَالْمَاءُ إِلَّا أَنَّهُ قَدْ كَانَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِيدًا مِنَ الْأَنْصَارِ، كَانَتْ لَهُمْ
مَنَائِحُ، وَكَانُوا يَسْنَحُونَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَلْبَانِهِمْ، فَيَسْقِينَا“۔

ترجمہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں (یہ حال تھا کہ) ہم ایک چاند دیکھتے، پھر دوسرا دیکھتے، پھر تیسرا دیکھتے، اسی طرح دو دو مہینے گزر جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں (کھانا پکانے کے لیے) آگ نہ جلتی تھی، میں نے پوچھا: خالہ جان! پھر آپ لوگ زندہ کس طرح رہتی تھیں، آپ نے فرمایا: صرف دو کالی چیزوں کھجور اور پانی پر، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند انصاری پڑوئی تھے، جن کے پاس دو دو دینے والی بکریاں تھیں اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی ان کا دو دو تحفہ کے طور پر پہنچا جایا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اے ہمیں بھی پلا دیا کرتے تھے، (بخاری: 2567)۔

بقول شاعر:

کل جہاں ملک اور جو کی روٹی غذا
اس شکم کی قناعت پر لاکھوں سلام
امت کے لیے بھی آپ نے اسی طریقے کو پسند فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

”سَيَكُونُ رِجَالٌ مِنْ أُمَّتِي يَا كُلُونَ الْوَانَ الطَّعَامِ وَيَسْبُونَ الْوَانَ الشَّرَابِ،
وَيَلْبَسُونَ الْوَانَ الشَّيَابِ، يَتَشَدَّقُونَ فِي الْكَلَامِ، أُولَئِكَ شَرَارُ أُمَّتِي“۔

ترجمہ: ”میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو طرح طرح کے کھانے کھائیں گے، قسم قسم کی چیزیں پیئیں گے، رنگ برلنگے کپڑے پہنیں گے اور خوب باتیں بنائیں گے، یہ میری امت کے بدترین لوگ ہوں گے، (المعجم الاوسط: 2351)۔

لباس میں بھی آپ کو سادگی پسند تھی، جیسا ملتا پہن لیتے، جہاں جگہ ملتی زمین پر پیش جاتے، آپ کا فرمان ہے:

”مَنْ لِيْسَ تَوْبَ شُهْرَةَ الْجَسَدِ اللَّهُ يَوْمُ الْقِيَامَةِ تَوْبَ مَذَلَّةٍ“۔

ترجمہ: ”جو شخص دنیا میں شہرت کا لباس پہنے گا، اللہ اسے قیامت میں ذلت کا لباس پہنانے گا، (ابن ماجہ: 3606)۔“

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے: ”وَمَنْ تَرَكَ تَوْبَ جَنَاحَ وَهُوَ قَادِرٌ عَلَيْهِ الْجَسَدُ اللَّهُ تَعَالَى أَوْ كَسَاءُ رِدَاءِ الْإِيمَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“۔

ترجمہ: ”جو شخص استطاعت کے باوجود عدمہ لباس نہیں پہنتا اور سادگی اختیار کرتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے خلعت ایمان پہنادے گا، (حلیۃ الاولیاء: ج 8 ص 47)۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر کھجور کی چٹائی تھی، جس پر مسلسل سونے سے جنم مبارک پر

ثنانات بن جاتے تھے، آپ نے شوکت و حشمت کی علامات کو ناپسند فرمایا، خواہ ان کا تعلق خوراک سے ہو، لباس سے ہو یا عالی شان مکانات و محلات سے، کیونکہ ایک تو ان سے انسان کی طبیعت میں تکبر و غرور پیدا ہوتا ہے اور دوسرے ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز مٹ جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر و مسکن ن اور تواضع و انساری کے طریقے کو ہمیشہ اختیار فرمایا

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مشہور دعا ہے:

”اللَّهُمَّ أَخِينِي مُسْكِينًا وَأَمْتَنِي مُسْكِينًا وَاحْسِنْنِي فِي زُمْرَةِ الْمُسَاكِينِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“۔

ترجمہ: ”اے اللہ! تو مجھے حالت مسکینی میں زندہ رکھ اور اسی حالت میں دنیا سے اٹھا اور قیامت کے دن میرا حشر مسکینوں کی جماعت میں فرمانا، (ترمذی: 2352)۔“

والدین اور بزرگوں کا احترام

اسلام انسان اور انسانیت کے وقار اور احترام کا علمبردار ہے اور خسپ مراتب ہر ایک کی عزت نفس کا پاس رکھنے کا درس دیتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”لَيْسَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَمْ يُوقِنْ كَبِيرَنَا وَلَمْ يَرَهُمْ صَغِيرَنَا“۔

ترجمہ: ”جن نے ہمارے بڑوں کی عزت نہ کی اور ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے، (منhadīr: 6937)۔“

یعنی اس کا یہ طرزِ عمل ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسلامی سوسائٹی کا ایک باوقار فرد نہیں ہے۔

حدیث پاک میں ”کبیر“ یعنی بزرگ کا لفظ عام ہے اور اس کا اطلاق ہر درجے اور ہر مرتبے کے بزرگوں پر ہوتا ہے، مثلاً:

۱۔ والدین اور وہ تمام اکابر جو رشتے اور نسب کے اعتبار سے ”قرابت دار“ اور ”ذوی الارحام“ کہلاتے ہیں۔

۲۔ وہ تمام بزرگ جن سے انسان رفتہ مصاہیرت (سرالی) کے ذریعے مسلک ہو جاتا ہے۔

۳۔ اساتذہ کرام بلا واسطہ یا بالواسطہ یعنی استاذ الاستاذ۔

۴۔ وہ جو عمر میں بڑے ہیں۔

۵۔ وہ جو علم و فضل اور تقویٰ و دین داری کی وجہ سے لائق احترام ہیں۔

۶۔ وہ جو کسی قابل احترام منصب پر فائز ہیں اور اس منصب و عہدہ کی وجہ سے لائق احترام ہیں۔

۷۔ وہ جو کسی معزز و موقر نسبت کی وجہ سے عزت و احترام کے اہل ہیں، جیسے صحابیت رسول، حضور اکرم ﷺ کے اہل بیت ہونے کی نسبت یا کوئی اور دینی نسبت وغیرہ۔

اللہ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے بعد اسلام میں انسان پر سب سے زیادہ حق والدین کا ہے اور والدین میں سے بھی ماں کا حق مقدم ہے۔ حضور ﷺ سے جب ایک موقع پر دریافت کیا گیا کہ اللہ اور رسول کے بعد انسان پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا: ”تمہاری ماں کا“ اور چوتھی بار دریافت کرنے پر فرمایا:

اٹھا کر واپس گھر لے آؤ، مقام والدین کی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ سے لگایا جاسکتا ہے:

۱- نبی ﷺ سے مقام والدین کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:
”هُنَاجَتْتُكَ وَنَارُكَ“، ترجمہ: ”وہ دونوں تمہاری جنت اور دوزخ ہیں، (ابن ماجہ: 3662)۔
یعنی اگر تم نے اللہ کے فضل و کرم سے ان کی اطاعت و فرماں برداری کی تو جنت کے متحق قرار پاؤ گے اور اگر خدا نخواستہ ان کی نافرمانی کی توجہ نہیں قرار پاؤ گے۔

۲- آپ ﷺ نے فرمایا: ”الْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ“۔
ترجمہ: ”جنت ماوں کے قدموں کے نیچے ہے، (مندا الشہاب القضاۓی: 119)۔

۳- آپ ﷺ نے فرمایا:
”رَغْمَ أَنْفُ مَنْ أَذْرَكَ أَبُوئِهِ أَوْ أَحَدَهُمَا عِنْدَ الْكِبِيرِ، فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ“۔
ترجمہ: ”جس شخص کے والدین زندہ ہوں اور وہ ان کی خدمت کر کے جنت کا حقدار نہ بن سکے، اس کی ناک خاک آلو ہو، (مسلم: 2551)۔

۴- آپ ﷺ نے فرمایا:
”مَا مِنْ وَلَدٍ بَإِيمَانُهُ نَظَرٌ نَظَرَةً رَحْمَةً إِلَّا كَتَبَ اللَّهُ بِكُلِّ نَظَرٍ حَجَّةً مَبْرُورَةً، قَالُوا: فَإِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةً، قَالَ: نَعَمْ! اللَّهُ أَكْبَرُ وَأَطْيَبُ“۔
ترجمہ: ”جونیک خصلت بیٹا اپنے باپ کے چہرے کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا، اللہ اس کے نامہ اعمال میں ایک جج مقبول کا ثواب لکھ دے گا، اس پر صحابی نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ اگر وہ دن میں سو مرتبہ دیکھے، آپ نے فرمایا: ”ہاں“، اللہ کی ذات بہت بڑی ہے، (یعنی اس کے ہاں اجر و ثواب کی کمی نہیں ہے)، (شعب الایمان: 7472)۔

۵- حضور انور ﷺ نے فرمایا:
”إِنَّ مِنْ أَكْبَرِ الْكَبَائِرِ أَنْ يَلْعَنَ الرَّجُلُ وَالِّدَنِيهِ، قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَكَيْفَ يَلْعَنُ الرَّجُلُ وَالِّدَنِيهِ، قَالَ: يَسْبُ الرَّجُلُ أَبَا الرَّجُلِ، فَيَسْبُ أَبَاهُ وَيَسْبُ أُمَّهَ“۔

ترجمہ: ”کبیرہ گناہوں میں سے ایک اپنے ماں باپ کو گالی دینا ہے، صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ملئِ شکاریت کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دے سکتا ہے، آپ نے فرمایا: ”ہاں“ ایک شخص دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اور جواب میں اُس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے، (بخاری: 5973)۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”رِضَى الرَّبِّ فِي رِضَى الْوَالِدِ، وَسَخْطُ الرَّبِّ فِي سَخْطِ الْوَالِدِ۔“

ترجمہ: ”اللہ کی رضامندی والد کی رضامندی میں ہے اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے، (ترمذی: 1899)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف نبی ماں باپ ہی کے احترام کا سبق نہیں دیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان تمام رشتتوں، قرابتوں اور نسبتوں کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے جو انسان کے لیے بزرگی اور بڑائی کا درجہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح احادیث پاک میں اس امر کی بھی صراحت موجود ہے کہ والد کے بعد چچا کا درجہ ہے اور والدہ کے بعد خالہ کا، نیز درجہ بدرجہ سب بزرگوں کا احترام لازم ہے۔

مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ کیجئے:

(۱) ”ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نے ایک کبیرہ گناہ کیا ہے، اس کا کفارہ کیا ہو سکتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: تمہاری ماں زندہ ہے، عرض کی: نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمہاری خالہ زندہ ہے، اس نے عرض کیا: ”جب ہاں“، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس کے ساتھ حُسن سلوک کر، یہی تیری توبہ ہے، (سنن ترمذی: 1904)۔

(۲) اسی طرح ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

”لَا تُؤذُونِي فِي عَبَاسٍ فَإِنَّهُ بَعِيْدَةُ آبَائِنِ، فَإِنَّ الْعَمَّ صِنُّوْأِيْبِهِ۔“

ترجمہ: ”مجھے حضرت عباس کے متعلق ایذا نہ دو، کیونکہ وہ میرے آبا و اجداد کی نشانی ہے اور

چپا شل باب کے ہوتا ہے، (فضائل الصحابة لاحمد بن حنبل: 1781)۔

(۳) احترام و اطاعت والدین کے بارے میں یہ حدیث حرف آخر ہے، ایک مرتبہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی سے فرمایا:

ترجمہ: ”جس مسلمان کے والدین زندہ ہوں اور وہ ان کے ساتھ احسان کرتے ہوئے (اور وہ اس حال میں) صحیح کرتا ہے (کہ وہ اس سے راضی ہوں) تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھولتا ہے اور اگر ایک زندہ ہو تو ایک دروازہ اور اگر ان میں سے کوئی ایک ناراض ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے (اس وقت تک) راضی نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ ان سے راضی ہو جائیں، اس پر صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر وہ اس پر ظلم و زیادتی کریں، اس پر آپ نے تین مرتبہ فرمایا: ”خواہ وہ اس پر زیادتی ہی کیوں نہ کریں“۔

(الادب المفرد للخماری: 7)

رواداری اور وسعت نظر

اپنے مسلک، دین، نظریہ حیات اور موقف پر تصلب، ثابت قدمی، اولو العزی اور استقلال انسان کی ایک اچھی صفت اور خوبی ہے اور دین و ایمان تو نام ہی ان عقائد، تصورات اور نظریات کا ہے جو کبھی متزلزل نہ ہوں اور کسی نظریے کے لیے قربانی و ہی شخص دے سکتا ہے، جسے اپنے نظریے پر غیر متزلزل یقین ہو۔

لیکن اس کے ساتھ یہ امر بھی اشد ضروری ہے کہ تعصُّب اور تنگ نظری کی بجائے انسان رواداری اور وسعت نظر سے کام لے۔ رواداری اور وسعت نظر سے مراد یہ ہے کہ انسان تحمل اور بردباری سے کام لے۔ اپنے مخالف کے نظریات و خیالات اور عقائد و افکار کو جبر و طاقت، زور و زیادتی اور جبر و ظلم سے دباؤنے اور مٹانے کی کوشش نہ کرے، کیونکہ جبر و اکراه کے ذریعے مخالف کی زبان بندی تو کی جاسکتی ہے، اس کے جذبات کو دبایا تو جا سکتا ہے، مٹایا اور کچلا جا سکتا ہے، لیکن اس کے ذہن کو بدلا نہیں جا سکتا، اس کی سوچ اور فکر کے سوتون کو

بند نہیں کیا جاسکتا، اس کے سر کو جھکایا جاسکتا ہے مگر قلب و نظر اور دل و دماغ کی تحریر ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سر زمین عرب میں تمام تر بند شوں، مظالم، نا انصافیوں، زیادتیوں، ستم رانیوں اور سفا کیوں کے باوجود اسلام کے پھیلتے چلے جانے کا سبب یہی تھا۔

اس کے عکس اگر فریق مخالف کو اپنا موقف، اپنا نظریہ اور اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کا موقع دیا جائے اور پھر واضح دلائل و براہین کے ذریعے اس کی خامیوں، ستم اور بودے پن کو واضح کیا جائے اور اپنے نظریے کی برتری کو عقل و خروکی روشنی میں ثابت کیا جائے تو نتیجہ بالکل مختلف ہو گا، وہ اذہان و قلوب جو توب و تفگ اور سیف و سناء سے سخن نہیں ہو سکتے، دلائل حقہ سے ان شاء اللہ خود مخدوم و مخزن ہوتے چلے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَلَا تُسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ إِذْقُنْ بِالْأَيْمَنِ هُنَّ أَخْسَنُ فَإِذَا الَّذِينَ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةً كَانُوا وَلِيُّ حَمِيمٍ“۔

ترجمہ: ”نیکی اور بدی یکساں نہیں ہو سکتیں، برائی کا مقابلہ صیں دلائل اور لشین انداز سے کیجیے (اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ) وہ شخص کہ تمہارے اور اس کے مابین عداوت ہے، تمہارا گہرا دوست بن جائے گا، (حمد السجدۃ 34)۔“

مقابلہ، مناظرہ، مباحثہ اور مجادله اگر دلائل سے ہو رہا ہو تو ہمیں پریشان ہونے اور گھبرا نے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ”هُلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ“۔

ترجمہ: ”کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں، (الزمر: 9)۔“

”قُلْ هُلْ يَسْتَوِي الْأَعْلَمُ وَالْبَصِيرُ أَمْ هُلْ تَسْتَوِي الظُّلْمَاتُ وَالنُّورُ۔“

(۲) ”قُلْ هُلْ يَسْتَوِي الْأَعْلَمُ وَالْبَصِيرُ أَمْ هُلْ تَسْتَوِي الظُّلْمَاتُ وَالنُّورُ“۔

ترجمہ: ”کیا انداہا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں یا نور اور ظلمت یکساں ہو سکتے ہیں، (الرعد: 16)۔“

ہرگز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کن فرمان ہے:

”جَاءَ الْحَقُّ وَرَأَهُوا الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ رَهُوقًا“۔

ترجمہ: ”حق آیا اور باطل مٹ گیا، بلاشبہ باطل کو منا ہی ہے، (الاسراء: 81)۔“

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی بے مثال کامیابی اور اسلام کے اتنی سرعت سے پھیلا دکا سبب ہی ان کا تحمل، برداشت کیا اور رواداری کا رو یہ تھا، انہوں نے مخالفین کے ہروار کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا، ان کے ہر ظلم کو برداشت کیا اور پنے کردار اخلاقی عالیہ اور برائیں قاطعہ کے ذریعے دلوں کی دُنیا کو فتح کرتے چلے گئے اور جگہ مراد آبادی کے بقول:

”جُودُ الْوَلُوْنَ كَيْ فَتَحَ كَلَّ وَهِيَ فَاتِحَ زَمَانَهُ“

آپ ﷺ نے اپنی مدافعت اور اسلام کی حمایت میں تلوار اس وقت اٹھائی جب اس کے سوا کوئی چارہ کا رہنا رہا۔ لیکن میدان جنگ میں اور فیصلہ کن فتح کے بعد بھی آپ نے رواداری کا مظاہرہ کیا اور اخلاقی اصولوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

چنانچہ حالتِ جنگ میں بھی آپ نے بچوں، عورتوں، ضعیفوں، امان چاہنے والوں اور لشکرِ اسلام سے تعرض نہ کرنے والوں پر تلوار اٹھانے سے منع فرمایا۔ آپ نے ذمیوں کو مذہبی آزادی دی اور ان کی عبادت گاہوں کے قدس کو برقرار رکھا، نصاریٰ نجران کے ساتھ آپ نے جو معاہدہ کیا، اُس کی اہم دفعات یہ ہیں:

”نجران اور اس کے اطراف کے باشندوں کی جانبیں، ان کا مذهب، ان کی زمینیں، ان کا مال، ان کے حاضر و غائب افراد، ان کے کارروائی، ان کے اصنام (بت) اللہ کی امان اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، (سلیمان الہدی والرشاد: ج 11، ص 393)۔“

اماں و تحفظ عیسائیوں کو دیا، اُس کے الفاظ یہ ہیں:

”یہ وہ امان ہے جو امیر المؤمنین نے ایلیا (بیت المقدس) کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جان و مال، گرجا و صلیب، تند رست و بیمار اور ان کے تمام اہل مذہب کے لیے ہے، (تاریخ طبری: ج 3 ص 309)۔“

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر عیسائیوں کی اجازت کے باوجود

گرچے میں اس لیے نماز نہیں پڑھی کہ مسلمان آگے چل کر کہیں اُسے نظر نہ بنالیں۔

فتح کمک کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے اسی رواداری کا مظاہرہ فرمایا اور اپنے جانی و شمنوں، خون کے پیاسوں، قتل کا منصوبہ بنا نہ والوں، ترکِ طن پر مجبور کرنے والوں کو عفو عام عطا فرمائی۔ یہودیوں کے ساتھ بھی آپ نے حسنِ سلوک فرمایا، حدیث میں ہے:

ترجمہ: ”ایک یہودی کا لڑکا جو مائل بے اسلام تھا، آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اسے اسلام کی دعوت دی، اُس نے باپ کے طرف اجازت طلب نظر وہ سے دیکھا، باپ نے کہا: آپ ﷺ جو فرماتے ہیں، اس کی تعلیم کرو، چنانچہ اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا، (سنن ابو داؤد: 3095)۔“

اسلام یہ چاہتا ہے کہ یہ رواداری اور سخت نظر خود مسلمانوں کے درمیان بھی فروع پائے، دین کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت کے دائرے کے اندر اختلافِ رائے کو برداشت کیا جائے۔ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کو یہودی قبیلے بنو قریظہ سے جہاد کے لیے روانہ فرماتے وقت حکم دیا کہ نمازِ عصر بنو قریظہ میں پڑھیں، بعض لوگوں نے اسے ظاہر پر محظوظ کیا، اللہذا انہوں نے نمازِ عصر تا خیر سے اس وقت ادا کی، جب وہ بنو قریظہ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ بعض صحابہ نے نمازِ عصر راتے ہی میں صحیح وقت پر ادا کی، انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ رائے قائم کی کہ رسول اللہ ﷺ کا بنو قریظہ میں نماز ادا کرنے کا حکم اس امر کے ساتھ مشروط تھا کہ نماز قضاۓ ہونے پائے۔ جب یہ معاملہ حضور کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے دونوں کی تصویب فرمائی یعنی دونوں کے عمل کو درست قرار دیا۔

ایسی طرح ایک موقع پر دو صحابہ کرام نے پانی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پاک مٹی سے تمیم کر کے نماز پڑھ لی، بعد میں جب وقت کے اندر ہی پانی میسٹر آگیا تو ایک صحابی نے وضو کر کے نماز دھرا لی اور دوسرے نے نہیں دھرا لی۔ جب دونوں حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعے کا تذکرہ آپ سے کیا تو جس نے نماز نہیں دھرا لی تھی اُس سے آپ نے فرمایا کہ تمہارا عمل شریعت کے مطابق ہے اور تمہیں نماز کی پوری جزا ملے گی۔ اس

جس نے نماز دہرالی تھی اس سے آپ نے فرمایا کہ تمہارے لیے دو اجر ہیں یعنی دو بارہ وضو کر کے جو نماز پڑھی اس پر نفل کا ثواب ملے گا۔

مندرجہ بالا دو واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے اگر کوئی شخص کسی مسئلہ میں اجتہاد کرتا ہے اور اپنی دیانت دارانہ رائے پر عمل کرتا ہے تو کسی کو اسے ملامت یا لعن طعن نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ آپ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے: جس نے اجتہاد کیا اور صحیح رائے قائم کی تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جس نے اجتہاد کیا مگر صحیح رائے قائم نہ کر سکا تو اس کے لیے بھی اپک اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام، سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین اذتلاف رائے کے باوجود آپس میں انتہائی محبت، الفت اور اخلاص سے پیش آتے تھے اور ان کے ذہنوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا شاسبہ تک نہیں تھا۔ وہ اپنی رائے پر قائم رہتے تھے مگر دوسرے کی رائے اور دیانت کا بھی احترام کرتے تھے اور یہی رویہ اسلام کی ترقی اور عروج کا باعث بنا۔

مگر رواداری یا وسعتِ نظر کا وہ مفہوم بالکل لغو اور غلط ہے، جو آج کل بعض حلقوں میں سمجھا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک رواداری کے معنی اصولوں کی بنیاد پر فرقیں مخالف سے مفاہمت ہے، یعنی اگر دوسرا آپ کی خاطر اپنا نظر یہ ترک نہیں کر سکتا تو آپ اس کی خاطر اپنا عقیدہ اور نظریہ قربان کر دیں تاکہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔ اسلام کا کوئی بنیادی عقیدہ اور اساسی اصول بدل نہیں سکتا۔

اسلامی معاشرہ

کسب و حلال:

اسلام کسب و معاش اور پیداواری عمل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ آدمی دوسروں پر بوجھ بننے کی بجائے خود محنت کرے، بلکہ اگر ممکن ہو تو دوسروں کے کام آئے۔ البتہ اسلام کسب معاش کے طریقوں پر پابندی عائد کرتا ہے اور مسلمانوں کے لیے

صرف حلال و طیب اور جائز طریقوں کو روکھتا ہے، اس طرح ذہرا فائدہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آدی مال حرام کی نحوس ت، بخیث اور ناپاکی سے محفوظ رہتا ہے اور دوسرا یہ کہ کسب حلال کی پابندی کے بعد چند افراد کے پاس دولت کا ارتکاز نہیں ہوتا اور دولت معاشرے کے افراد میں گردش کرتی رہتی ہے۔

اسلام میں کسب حلال کے حکم کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ ان اموال کو حاصل کرنے اور جمع کرنے سے قطعی طور پر اجتناب کیا جائے، جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ دوم یہ کہ مال کمانے اور حاصل کرنے کے ان تمام طریقوں سے بچا جائے جو شرعاً حرام اور ناجائز ہیں مثلاً: سود، سٹہ، جوا، رقص و سرود کا پیشہ، بدکاری، رشوت یا کار و بار و تجارت میں احکام و ذخیرہ اندوزی یا لین دین اور ناپ تول میں کمی یا بیشی اور خیانت کرنا وغیرہ۔ سوم یہ کہ کسی کے مال کو باطل طریقوں، جبر، غصب، زبردستی یا دھوکہ دہی سے نہ لیا جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْتَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

ترجمہ: ”اور آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ اور حکام کو (براء راست یا بالواسطہ) رشوت نہ دو، (البقرۃ: 188)۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں رسولِ عظام اور اہل ایمان کو حلال کھانے کے حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ مُلْكُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا مِنَ الصَّالِحَاتِ

ترجمہ: ”اے میرے رسول! طیب اور حلال چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو، (المونون: 51)۔“

انبیاء کرام تو حلال ہی کھاتے تھے، یہ دراصل ان کے توسط سے ان کی امتیوں کو

تعلیم دینے کے لیے ہے، دوسرے مقام پر فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَصْنُوا مُلْكَوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ مَا هَرَبَ قَنْتَمْ

ترجمہ: ”اے ایمان والو! جو حلال اور طیب چیزیں ہم نے تمہیں عطا کی ہیں، انہی میں سے کھاؤ، (البقرۃ: 172)۔“

رزق حلال کی جو برکات حدیث پاک میں مردی ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

- ۱۔ رزق حلال سے انسان کا قلب اللہ کے انوار و تجلیات سے معمور رہتا ہے۔
- ۲۔ کسب حلال عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی برکت سے اللہ راضی ہوتا ہے اور گناہوں کی مغفرت فرماتا ہے۔
- ۳۔ رزق حلال کی برکت سے عبادت اور دعاء کی صحیح لذت نصیب ہوتی ہے۔

ایک حدیث پاک میں فرمایا:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ وَلَا يَتَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا، وَإِنَّ اللَّهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الرُّسُلِينَ، فَقَالُوا: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ كُلُّا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ“ وَقَالَ: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُّا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ“ قَالَ: وَذَكَرَ الرَّجُلُ بُطِينُ السَّفَرِ أَشْفَعَ أَغْبَرَ يَدُّهُ يَدَهُ إِلَى السَّنَاءِ يَا رَبِّ، يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبُسُهُ حَرَامٌ، وَغُذَّيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنِّي يُسْتَجَابُ لِذِلِّكَ“

ترجمہ: ”لوگو! اللہ پاک ہے اور حلال و پاک چیزوں کو ہی پسند کرتا ہے اور اللہ نے مومنین کو انہیں چیزوں کا حکم دیا ہے جن چیزوں کا حکم اس نے اپنے رسولوں کو دیا ہے، اللہ نے فرمایا: اے میرے رسول کرام طیب اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرتے رہو بے شک جو بھی کام تم کرتے ہو، میں اس کو خوب جانے والا ہوں، (المونون: 51)، اور اللہ نے یہ بھی فرمایا: اے ایمان والو! جو حلال اور طیب چیزیں ہم نے تمہیں عطا کی ہیں انہی میں سے کھاؤ“؛ (البقرہ: 172)، (پھر) آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، پریشان حال اور غبار آلود ہے۔ آسمان کی طرف پاٹھ پھیلا کر دعا سخیں مانگتا ہے: اے میرے رب! اے میرے رب! اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام کا ہے، اس پیانا حرام کا ہے، اس کا پہنچانا حرام کا ہے اور اس کی پروردش ہی حرام سے ہوئی ہے، پھر اس کی دعا کیوں کر قبول ہوگی؟“

(ترمذی: 2989)

انسانی وقار

شرف انسانیت کا مفہوم:

اس سے مراد یہ ہے کہ تمام شخصات، امتیازات اور خصوصیات (مثلاً رنگ، نسب، خاندان، قبیلہ اور قومیت وطنیت وغیرہ) سے قطع نظر انسان محض انسان ہونے کی بحیثیت سے اشرف الخلق، معزز، محترم اور مکرم ہے۔

قرآن کا تصویر انسان:

اسلام نے انسان کی حرمت و فضیلت کا تحفظ کیا ہے اور انسانیت کی محکم و تعظیم اور احترام کا درس دیا ہے۔ قرآن نے عظمت انسان کا اعلان واشگاف الفاظ میں کیا، ارشاد ہوا:

(۱) ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَ حَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَأَزْ قَنَاهُمْ مِنَ الطَّيْلَتِ وَ فَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كُثُرٍ مِّنْ خَلْقَنَا تَفْضِيلًا۔“

ترجمہ: ”ہم نے اولادِ آدم کو عزت و عظمت سے سرفراز کیا، ان کو خشکی و تری میں سواری دی (یعنی اقتدار، غلبہ اور سلطنت عطا کیا) اور پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور اپنی مخلوقات میں اکثر پر فضیلت عطا کی، (بنی اسرائیل: 70)۔“

(۲) ”لَقَدْ خَلَقْنَا إِلَإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۔“

ترجمہ: ”ہم نے انسان کو (شکل و صورت، عقل اور جامت کے اعتبار سے) بہترین تناسب اور اعتدال پر پیدا کیا، (الشیخ: 4)۔“

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی نوع کے اعتبار سے بحیثیت مجموعی دیگر انواع مخلوقات سے افضل ہے۔ ملائکہ بلاشبہ اللہ کی نہایت برگزیدہ مخلوق ہیں اور قرآن میں ان کا ذکر کر کر امیر (معزز)، بزرگ (نیک) اطاعت گزار، عصیان سے پاک، امین اور اس جیسے دیگر اوصاف والقاب کے ساتھ کیا گیا ہے مگر ایک اطاعت گزار انسان اور فرمان بروار

فرستے میں فرق یہ ہے کہ فرشتے کی تخلیق ہی اسی لیے کی گئی ہے کہ صرف اور صرف اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس میں گناہ، عصیان اور حکم عدوی کا مادہ یا الہیت ہی نہیں رکھی، جبکہ انسان کو خیر کے ساتھ ساتھ شر پر بھی قدرت عطا کی ہے۔ نیکی کے ساتھ ساتھ بدی کا بھی اختیار دیا ہے اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور خوشنودی کی خاطرا پنے نفس اپارہ کے تقاضوں کو قربان کر کے اطاعت کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تو پھر یہ مصروف صادق آتا ہے: ”فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا۔“

خلافت و نیابتِ الہی:

اسلام کی رو سے انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے، لیکن یہ خلافت اور نیابت مطلق اور غیر مشرف طبقیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ انسان اللہ کی زمین پر اللہ کے دینے ہوئے اختیار سے اس کے دین کو نافذ کرے اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی اللہ کی شریعت اور اس کے انبیاء کرام کی سنت کے تابع بنائے، اسی بناء پر اُسے مسحود ملائک بنایا گیا ہے اور اسے علم و عقل کی امتیازی نعمت سے سرفراز کیا گیا۔

لیکن اگر انسان حمل کی بندگی اختیار کرنے کی بجائے شیطان، ہجت نفس اور حب مال اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر غالب آجائے تو پھر وہ اپنے منصب خلافت و نیابتِ الہی کے استحقاق کو کھو بیٹھتا ہے اور اعزاز شرافت و تکریم اور احترامِ آدمیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

انسان کے بارے میں اسلام کا نظریہ:

انسان کے بارے میں اسلام کا نظریہ انسانی وقار پر بنی ہے، جبکہ دیگر مذاہب اور تاریخ انسانی کی ارتقائی اور مادی تجدیب کرنے والوں کے نظریات انسانی وقار کی نقی کرتے ہیں۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ اللہ نے انسان اول آدم علیہ السلام کو علم سے آراستہ و مزین کر کے زمین پر بھیجا، پھر انبیاء کرام اور رسول عظام و قائم فوقاً مبعوث کیے جاتے رہے تاکہ بھکی ہوئی انسانیت کو علم و تہذیب کے نور سے آراستہ کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن کریں۔

اسلام کا نظریہ یہ بھی ہے کہ ہر انسان دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، کوئی بھی فرد

پیدائشی پاپی یا گناہ گار نہیں ہوتا۔ البتہ معاشرہ اس کے اصلاح یا بگاڑ میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اور انسان اپنے عقل و شعور اور ارادہ و اختیار کے تحت ہی ہدایت یا گراہی کی راہ کو اختیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں نابالغ یا سن شعور سے پہلے آدمی پر شرعی احکام بالخصوص عبادات کے سلسلہ میں کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

انسان کے بارے میں دیگر مذاہب کے نظریات:

اس کے برعکس عیسائیوں کے نزدیک انسان پیدائشی طور پر پاپی اور گناہ گار ہے تاوقتیکہ چرچ میں جا کر اس کا پتکہ نہ ہو جائے۔ ہندو مت اور بدھ مت میں روحانی ارتقاء کے لیے بے انتہا جسمانی مشقت اور ریاضت لازمی ہے۔ ان کے نزدیک جسم زوح کے لیے ایک قید خانہ ہے جب تک اس کی گرفت اور ایندھن مسلسل ریاضت سے کمزور نہ کر دیئے جائیں۔ روحانی تکمیل و ارتقاء اور معرفت حق حاصل نہیں ہو سکتی۔ تاریخ انسانی کی مادی تعبیر پر یقین کرنے والوں کے نزدیک انسانیت کا سفر جہالت، برہنگی، دحشت و دردگی اور غاروں سے شروع ہو کر مسلسل ارتقائی عمل سے اسی منزل تک پہنچا ہے۔ ڈارون اور اس کے پیروکاروں کے نزدیک انسان بندرو اور بن ماں کی ارتقائی شکل ہے، جبکہ ہندوؤں کے نزدیک انسان کی روح مکافاتِ عمل کے طور پر جانوروں اور درندوں میں بھی حلول کر سکتی ہے۔

اسلام انسانی مساوات اور وحدت کا علمبردار:

اسلام کی رو سے تمام انسان ایک جیسے ہیں، برابر ہیں اور رنگ و نسل، زبان، قبیلہ یا علاقائیت کی بنیاد پر کسی کو کسی پر کوئی فضیلت یا برتری حاصل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِيلٍ لِّتَعَاشُوا فِي الْأَرْضِ إِنَّمَا مَكَّمِنُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْتَلُمْ“۔

ترجمہ: ”اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت پیدا کیا ہے لور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ

عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پر ہیز گار ہو، (الحجرات: 3)۔

رسول اللہ ﷺ نے مشہور خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ فَإِنَّ أَبْأَكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا! لَا فَضْلَ لِعَرَبٍ عَلَى عَجَّابٍ وَلَا لِعَجَّابٍ عَلَى عَرَبٍ، وَلَا لِأَخْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرٍ إِلَّا بِالشُّقُوقِ، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتُقَاتُكُمْ“۔

ترجمہ: ”اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے (تم سب آدم کی اولاد ہو)، کسی عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، ہاں اگر کسی بات پر فضیلت و برتری کا مدار ہے تو وہ تقویٰ ہے، (شعب الایمان: 4774)۔

اسلام میں احترام نسوان

تاریخ انسانی میں اسلام نے پہلی مرتبہ عورتوں کو عزت و احترام کا مقام دیا۔ زمانہ جاہلیت میں بیویوں کو عار سمجھا جاتا تھا، لیکن پیغمبر اسلام نے بیویوں کی کفالت اور تربیت کرنے والے کو جنت کی بشارت دی۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو یہاں عزت کا مستحق قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”وَلَهُنَّ مُثْلُ الْذِينَ عَلَيْهِنَّ بِالْمُعْرُوفِ“۔

ترجمہ: ”اور ان (بیویوں) کے بھی (تم پر) ایسے حقوق ہیں جیسا کہ (تمہارے) ان پر ہیں، (البقرة: 228)۔

اسلام نے شوہر اور بیوی کے حقوق میں توازن قائم کیا۔ شوہر کی جسمانی قوت و اہلیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پر معاش اور ننان نفقة کی ذمہ داریاں عائد کیں اور بیوی کی نزاکت و لطافت کو ملاحظہ رکھتے ہوئے اس پر تربیت اولاد، اپنی عصمت و عفتنی اور شوہر کی امانت کی حفاظت کی ذمہ داریاں عائد کیں، ماں، بیوی، بیٹی اور دیگر مختلف حیثیتوں میں اسے وراثت کا حق دار بنایا۔ اگر ناگزیر حالات میں شوہر کو حقی طلاق دیا ہے تو بیوی کو حقی خلع دیا

ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد اور طلاق کی صورت میں اسے نکاح تانی کا اختیار دیا ہے اور اس شخص کو سب سے بہتر قرار دیا ہے جو اپنے گھروالوں کے ساتھ اچھا بوفر دیا ہے:
”خَيْرُكُمْ خَيْرٌ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرٌ لِأَهْلِي“۔

ترجمہ: ”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھروالوں کے لیے اچھا ہے اور میں اپنے گھروالوں کے لیے بہترین ہوں، (ترمذی: 3895)۔“

نیز مرض الموت میں آپ نے عورتوں کے حقوق کا خیال رکھنے کے بارے میں تاکید اور شاد فرمایا۔

غلاموں کا احترام

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت عرب معاشرے اور اس وقت کی دیگر تمام اقوام میں غلامی کا سلسلہ راجح تھا، گویا اسلام کو ہندی پرانی انسانی کے ورثے کے طور پر رسم غلامی سے واسطہ پڑا، اس دور میں غلاموں کو انسانی حقوق حاصل نہیں تھے، ایک بے جان اور جذبات و احساسات سے عاری مشین کی طرح ان سے کام لیا جاتا تھا اور بس! پھر غلامی کا سلسلہ نسل در نسل جاری رہتا تھا۔

اسلام نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے رسم غلامی کو تسلیم کیا اور آہستہ آہستہ اسے شرفِ انسانیت سے ہمکنار کیا، کفر و اسلام کی جنگ میں ہاتھ آنے والے جنگی قیدیوں کے علاوہ باقی تمام صورتیں بتدربن ختم ہوتی چلی گئیں، مثلاً:

۱۔ ایک آزاد آدمی کی باندی سے اولاد پیدا ہو جائے تو وہ ”امِ ولد“ کہلاتی، وہ بچہ پیدا ہوتے ہی آزاد قرار پایا اور آگے چل کر ماں کی بھی آزادی کا ذریعہ بنتا۔

۲۔ جنگی قیدیوں کو بھی فدییے لے کر یا خدمات کے عوض آزاد کیا گیا، جو اس دور میں ایک انقلابی اقدام تھا۔

۳۔ غلاموں میں ”مکاتبت“ کو متعارف کرایا گیا کہ وہ آزادانہ کار و بار یا روزگار اختیار کر سکے، باہمی رضامندی سے طے شدہ ایک متعین رقم مالک کو دے کر آزاد ہو سکتے ہیں۔

- ۴۔ انسانی بنیادوں پر غلام آزاد کرنے کو اعلیٰ ترین نیکی قرار دیا گیا۔
- ۵۔ مختلف غلطیوں اور گناہوں کے لفڑارے (ملافی) کے طور پر غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا
اگر اپنی ملکیت میں غلام نہیں تو کسی سے خرید کر آزاد کرے۔

”خطبہ جمعۃ الدواع“ میں غلاموں سے حسن سلوک کی رسول اللہ ﷺ نے تحقیق نے تحقیق
فرمائی، ان کو اپنے معیار کے مطابق خوراک و لباس فراہم کرنے کا حکم دیا، ماضی کی غلامی یا
غلام زادہ ہونا کسی عار کا باعث نہیں سمجھا گیا۔

چنانچہ نبی ﷺ نے بذاتِ خود اپنے آزاد کردہ غلام صحابی زید بن حارث رضی اللہ
عنہ کے صاحبزادے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کی
موجودگی میں اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا۔

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلاں جبشی رضی اللہ عنہ کو
خرید کر آزاد کیا تھا، حضور ﷺ نے انہیں اپنے موذن کے منصبِ خصوصی پر فائز فرمایا اور
تمام صحابہ کرام ان کے بے انتہا تکریم فرماتے تھے۔

اجتمائی عدل

عدل سے مراد: ”کسی چیز کو اس کے اصل مقام پر رکھنا، ہر حق دار کو اس کا حق پورا
دینا“ ہے، انفرادی و اجتماعی معاملات میں راہِ اعتدال پر قائم رہنا اور افراط و تفریط سے
بچنا“ ہے۔

عدل کے مقابلے میں ظلم ہے اور ظلم کے معنی ہیں: کسی چیز کو اس کے صحیح موقع محل
میں نہ رکھنا، افراط و تفریط سے کام لیتا، کسی حق دار کو اس کا حق نہ دینا یعنی حق تلفی کرنا۔ یہی وجہ
ہے کہ قرآن میں شرک کو ”ظلم عظیم“ (سب سے بڑا ظلم) قردادیا گیا ہے، کیونکہ بندگی اور
عبدیت خالق کل، معبد و مطلق اللہ جل شانہ کا حق ہے جو اس میں کلی یا جزوی طور پر کسی اور کو
شریک نہ ہوتا ہے، وہ ظالم ہے۔

اسلام میں عدل اجتماعی حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں پر شامل ہے اور اس کے شددشے ہیں، مثلاً: معاشرتی عدل، قانونی عدل، سیاسی اور معاشرتی عدل وغیرہ۔

معاشرتی عدل:

اس سے مراد یہ ہے کہ معاشرے کے ہر شے، ہر طبقے اور ہر فرد کو عدل و انصاف فراہم کیا جائے۔ رنگ و نسل، علاقائیت، انسانی عصیت اور ذات پات کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے اور کوئی اونچ تجھ نہ ہو۔ اعزاز و اکرام اگر ہو تو محض علم، کردار اور تقویٰ کی بنیاد پر۔

اسی طرح معاشرے کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کا سب کو یکساں موقع ملنا چاہیے۔

تعلیم و تربیت کے دروازے سب کے لیے یکساں طور پر کھلے رہے چاہیں۔ معاشرے کے پسمندہ اور سماجی طور پر دبے ہوئے افراد کو ابھرنے کا یکساں موقع ملنا چاہیے۔ تجارت اور لین دین میں بھی عدل سے کام لینا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ”وَأَوْفُوا الْكِيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ“۔

ترجمہ: ”اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کرو، (الانعام: 152)۔“

(۲) ”وَيُلْلَهُمْ كَفِيفِينَ لِلْأَنْبِينَ إِذَا كُتَّلُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كُلُّهُمْ أَوْ ذَرَنُهُمْ يُحْسِرُونَ ۝“

ترجمہ: ”ناپ تول میں کمی کرنے والے (ان افراد) کے لیے خرابی اور ہلاکت ہے، جو خود تو پورا پورا ناپ تول کر لیتے ہیں لیکن جب دوسروں کو وزن کر کے دیتے ہیں تو ڈنڈی مارتے ہیں، (المطففين: 1-3)۔“

زیر دست اور ماتحت افراد کے حقوق کے بارے میں بھی عدل کا حکم دیا گیا ہے۔

ثر عا حسب ضرورت اور حسب حال ایک سے زائد چار تک شادیوں کی اجازت تو ضروری مگر ساتھ ساتھ یہ لازمی شرط بھی عائد کر دی:

”فَإِنْ خَفْتُمُ الْأَنْعَابَ لَوْا فَوَاجِدَةً“۔

ترجمہ: ”اگر تمہیں خدشہ ہو کہ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان انصاف نہ کر پاؤ گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو، (النساء: 3)۔“ - نیز فرمایا:
”وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَّمَ إِلَيْهِ“ -

ترجمہ: ”تیمبوں کے معاملات میں انصاف کو محفوظ رکھو، (النساء: 127)۔“

مشہور خطبہ جنتۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے بالخصوص عورتوں، غلاموں اور زیر دست لوگوں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی اور رنگ و نسل کے امتیازات، لسانی عصبیتوں اور نسلی تفاخر کا آپ نے قلع قع فرمادیا۔

قانونی عدل:

قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ حاکم، قاضی یا نجج کے سامنے کوئی مظلوم فریاد لے کر آئے تو اسے انصاف مل سکے۔ کسی شخص کی غربت، معاشرے میں کمتر حیثیت انصاف کے حصول میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ یہ بھی نہ ہو کہ کوئی شخص اپنے جاہ و منصب، دولت و ثروت اور اختیار کی وجہ سے انصاف پر اثر انداز ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہمیشہ قاضی کی حیثیت نمایاں، با اختیار اور ممتاز ہی ہے اور اسے یہ اختیار دیا جاتا رہا ہے کہ وہ خلیفہ وقت کو بھی عدالت کے کٹھرے میں طلب کر سکے۔ نسلی، خاندانی اور قبائلی برتری بھی بھی انصاف کی راہ میں حائل نہیں ہونی چاہیے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب قریش کے قبلیہ بنو مخزوم کی ایک خاتون فاطمہ نے چوری کی اور قریش نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں حضرت اسامہ بن زید کو سفارشی بناؤ کر بھیجا کہ اس خاتون کو چھوڑ دیا جائے اور اس پر ”حد برقہ“ (یعنی ہاتھ کا نہ کی سزا) نافذ نہ کی جائے، کیونکہ اس سے تمام قریش کی ناک کٹ جائے گی، اس پر آپ ﷺ کا چہرہ مبارک غصے سے ٹرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا:

”إِنَّهَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، أَتَهُمْ كَانُوا يُقْيِيمُونَ الْحَدَّ عَلَى الْوَضِيعِ وَيَتُرُكُونَ الشَّرِيفَ، وَالَّذِي نَفِقُوا بِيَدِهِ، لَوْأَنَّ فَاطِمَةَ فَعَلَتْ ذَلِكَ لَقَطَعْتُ يَدَهَا“ -

ترجمہ: ”(کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو)، تم سے پہلے امیں اسی لیے ہلاک

ہو سیکہ با اثر لوگوں کے لیے اللہ کی حدود میں رعایت کر دی جاتی تھی اور غریب لوگوں پر قانون کا نفاذ زور شور سے کیا جاتا تھا، خدا کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا، (صحیح البخاری: 6787)۔

اسلامی عدل کا یہ حیثیت جاگتا ثبوت ہے کہ ”یثاق مدینہ“ کی رو سے مدینہ منورہ کے یہود اور تمام قبائل نے باہمی تنازعات کے لیے رسول اکرم ﷺ کو حکم تسلیم کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ إِنْ تُحْكِمُوا إِلَيَّ الْعَدْلُ“۔

ترجمہ: ”جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے بیٹھو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، (النہام: 58)۔

سیاسی عدل:

کسی بھی مملکت یا حکومت کا کام معاشرے میں توازن و اعتدال قائم رکھنا ہے۔ معاشرے کے مختلف عناصر، طبقات، قبائل اور گروہوں کے ساتھ انصاف کرنا، ان کے حقوق کو ادا کرنا اور انہیں فرائض کی بجا آوری کے لیے تیار کرنا اور عدل و انصاف کی ایسی فضاقام کرنا جس میں یہ محسوس ہو کہ واقعی انصاف کیا جا رہا ہے۔ اس طرح شخصی یا گروہی عصیت کو عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَلَا يَجِدُونَكُمْ شَتَانٌ قَوْمٌ عَلَى أَكْلِاتِهِمْ لَوْا إِعْدَلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلشَّفَوْءِ“۔

ترجمہ: ”اور کسی قوم کی عداوٹ تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم بے انصافی کرنے لگو، عدل کرو، یہی روح تقویٰ سے قریب ترین ہے، (المائدہ: 8)۔“

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کا ایک نمایاں ترین پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے کبھی کسی سے اپنی ذات کی خاطر انتقام نہیں لیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ وسیع

سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک موقع پر مسلمانوں کو مصلحت وقت کے تحت اپنے کچھ مفتوحہ علاقے سے واپس آنا پڑا۔ اس موقع پر مسلمانوں نے مفتوحہ علاقے کے کچھ غیر مسلموں سے ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی ذمہ دای قبول کرتے ہوئے ان سے جزیے لے رکھا تھا۔ جب مسلمان واپس روانہ ہونے لگے تو مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے حکم دیا کہ جزیے کی رقم ان لوگوں کو واپس کر دی جائے، کیونکہ اب ہم ان کے تحفظ کی ذمہ داری نباہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، جبکہ جزیے ہم نے اسی مقصد کے تحت لیا تھا۔ عدل و انصاف اور خدا ترسی کا یہ بے مثال مظاہرہ دیکھ کر وہ مفتوحہ غیر مسلم دنگ رہ گئے اور بے اختیار دعا کرنے لگے: ”اللَّهُ تَعَالَى مِنْ هَمَّٰنِ هَمَّٰنْ“ ہمارے علاقے میں واپس لائے، اگر ہمارے ہم ذہب بھی حکمران ہوتے تو وہ رقم لوٹانے کی بجائے ہمارا بچا کھچا مال بھی ہڑپ کر جاتے۔ ایک اور موقع پر جب مسلمانوں نے عدل و انصاف کا ایسا ہی مظاہرہ کیا تو یہودی بے اختیار پکارا ہے یہی وہ عدل و انصاف ہے جس پر زمین و آسمان قائم ہیں۔

ایک حدیث پاک میں قیامت کے روز سات اشخاص کو اللہ کے سامنے رحمت کا حق دار قرار دیا گیا ہے، جب کہ اس کے سامنے کے علاوہ کسی اور کام سامنے نہ ہوگا، ان میں سرفہرست عادل حکمران ہے، ایک اور حدیث میں فرمایا:

”إِنَّ أَحَبَّ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَدُنَّاهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا إِمَامٌ عَادِلٌ وَأَبْغَضُ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ وَأَبْعَدَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا إِمَامٌ جَائِرٌ“

ترجمہ: ”قیامت کے دن عادل حکمران اللہ کو سب سے محبوب اور قریب ہوگا اور ظالم حکمران اللہ کے نزد کم سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور دور ہوگا، (سنن ترمذی: 1329)۔“

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”ثَلَاثٌ لَا تُرْدَدُ دَعْوَتُهُمْ، الْإِمَامُ الْعَادِلُ“

ترجمہ: ”تین آدمیوں کی دعا مقبول ہوتی ہے، ان میں سے ایک انصاف پسند حکمران ہے،

(سن ترمذی: 2526) "۔

معاشری عدل:

معاشری عدل کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ مال خرچ کرنے میں افراط و تفریط اور اسراف
و بخل کی بجائے اعتدال سے کام لیا جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَالَّذِينَ إِذَا آتَفْعَلُوا مِمْسَرٍ فُزُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَأَنَّ بَعْدَنَ ذَلِكَ فَوَّا مَا"۔

ترجمہ: "(اللہ کے خاص بندے) جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل
سے کام لیتے ہیں، (ان دونوں انتہاؤں کے درمیان) اعتدال کی راہ پر قائم رہتے ہیں"۔

(الفرقان: 67)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "مَاعَالَ مَنِ اقْتَصَدَ"۔

ترجمہ: "جس نے اپنی معیشت میں میانہ روی کو اختیار کیا وہ کبھی فقر و فاقہ اور تنگی میں بنتا
نہ ہوگا، (منhadīr: 4269)"۔

معاشری عدل کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وسائل رزق اور معیشت افراد کی اجازہ داری
نہیں ہونی چاہیے، بلکہ معاشر کی راہیں سب کے لیے یکساں طور پر کھلی رہتی چاہیں۔ اسلامی
نظام زکوٰۃ و صدقات اور وراثت کے لازمی احکام اور غلی صدقات و عظیمات کے ترغیبی احکام
کے علاوہ دیگر منصانہ اقدامات کے ذریعے تقسیم دولت کامناسب انتظام ہونا چاہیے۔

بعض لوگ سیاسی نظرے کے طور پر معاشری مساوات کی بات کرتے ہیں، جو کلی طور
پر نہ تو قابل عمل ہے، نہ ہی تاریخ انسانی میں اس کی نظریہ ملتی ہے اور نہ ہی یہ مقاصد فطرت سے
قریب تر معلوم ہوتا ہے، اگر اس کا مفہوم یہ سمجھ لیا جائے کہ وسائل معیشت اور دولت کو تمام
انسانوں میں سو فیصد برابر تقسیم کر دیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو احکام زکوٰۃ و صدقات ناقابل عمل
ہو کر رہ جاتے اور ایسے بھی مظاہر کائنات میں اور خود انسانوں میں رنگت، صورت، سیرت،
حسن و جمال، قد و قامت، الہیت و صلاحیت اور ذہانت میں مساوات نظر نہیں آتی۔ ہاں البتہ
اگر مساوات کا مفہوم یہ لیا جائے کہ سب لوگوں کو محنت، تغیر و ترقی، تعلیم اور حصول رزق کے

موقع سے استفادہ کرنے کا موقع نیکاں طور پر ملنا چاہیے تو یہ اسلام کا بھی مقصود ہے اور نظر سے بھی مناسب رکھتا ہے۔ مگر اسے ہم معاشرتی و معاشرتی عدل سے تعبیر کریں گے۔ یعنی اگر اسلامی ریاست میں کوئی فرد محض غربت اور پسمندگی کی وجہ سے الہیت، صلاحیت اور ذہانت کے باوجود تعلیم حاصل کرنے کے موقع سے محروم رہ جاتا ہے تو اسے معاشری ظلم سے تعبیر کیا جائے گا جس کی اسلام نفی کرتا ہے۔

شوریٰ

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ انسان اس زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ مگر یہ نیابت یا خلافت کسی خاص فرد، قبیلے، خاندان یا قوم کا حق نہیں ہے، بلکہ انسانیت کا یہ اجتماعی اعزاز ہے اور اس نیابت اور خلافت کا مقصد یہ ہے کہ اس زمین پر اللہ کے دین کو نافذ کیا جائے اور اللہ کے رسول مکرم ﷺ کے قائم کردہ نجح پر مسلمانوں کے امور مملکت و حکومت کو چلا یا جائے۔

چنانچہ اسلام میں کسی بھی طرح کی آمریت مطلق العنانی اور ملوکیت کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح اسلام میں اس طرز کی پاپائیت کی بھی کوئی گنجائش نہیں جواز منہ وسطی میں کلیسا نے قائم کر کھی تھی، یہ بھی ایک طرح سے مذہبی طبقے کی گروہی اور طبقاتی مطلق العنانی تھی، جس میں اللہ کے دین کی حکمرانی کی بجائے مذہبی طبقے کی خواہشات کی حکمرانی تھی اور جس کے رو عمل کے نتیجے میں مغرب میں لا دینیت نے فروغ پایا۔

اسلام کی رو سے مسلمانوں کی اجتماعی ہیئت حاکمہ، نظام حکومت اور افراد حکومت کو مسلمانوں کی اجتماعی رائے اور مرضی سے منتخب کیا جائے گا، جسے قرون اولی میں بیعت سے تعبیر کیا جاتا تھا اور دورِ جدید میں یا اظہارِ رائے سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن اسلامی طرز جمہوریت اور مغربی طرز جمہوریت کا فرق یہ ہے کہ اسلام میں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور تمام قوانین اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق بنیں گے جبکہ مغربی طرز جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ عوام کو حاصل ہے اور عوام کے برآ راست منتخب نمائندے جس چیز کو چاہیں جائز قرار دیں اور جسے چاہیے ناجائز قرار دیں۔ اسلام کہتا ہے وہ امور جو قرآن و

ست کی رو سے قطعی طور پر طے شدہ ہیں انھیں من و عن نافذ کیا جائے، کسی کو بھی اللہ کے دین کے صریح، قطعی اور طے شدہ حکم کو بدلنا چاہیں تو ان کو یہ اختیار حاصل نہیں، بلکہ اسلام کی رو سے حکومت و اقتدار اللہ کی امانت ہے اور تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ تمام افراد مل اجتماعی جدوجہد کے ذریعے اللہ کے دین کو نافذ کریں اور ان امور میں اجتہاد کی تجویز ہے، ان میں اجماع و اتفاق رائے یا کثرتِ رائے سے فیصلہ کیا جائے گا۔

اس چیز کو قرآن نے شورائیت (Advisory) سے تعبیر کیا ہے اور ارشاد فرمایا:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ يَبِينُهُمْ

ترجمہ: ”اور ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پائیں گے، (الشوری: 38)“
اس میں امر سے تمام معاملات مراد ہیں، رسول اکرم ﷺ کو حکم ہوا جو دراصل تعلیم امت کے لیے تھا: **وَشَارِهُمْ فِي الْأَمْرِ**

ترجمہ: ”اور ان سے معاملات میں مشورہ کیا کیجیے، (آل عمران: 159)“
باہمی مشاورت میں ہمیشہ اتفاقِ رائے لازمی نہیں ہے، بلکہ اختلاف بھی ممکن ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَآطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَئِكُمْ أَنْتُمُ الْمُنْتَهَىٰ فَإِنْ تَشَاءُ عَذْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرْدُوْهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

ترجمہ: ”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی بھی جن کے ہاتھ میں تمہارے معاملات کی باغ ڈور ہے، لیکن اگر تمہارا کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو پھر معاملہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، (الناء: 59)“

یعنی غیر مشروط اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی لازم ہے، حاکم وقت کی اطاعت اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ اگر وہ کتاب و سنت کے تقاضوں کے مطابق ہے تو فہماورنہ اسے مسترد کر دیا جائے گا۔

اگر اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے طے کیے جائیں گے تو ان میں خیر و برکت ہو گی، نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

”إِنَّ أُمَّقِي لَا تَجْتَبِعُ عَلَى ضَلَالَةٍ، فَإِذَا رَأَيْتُمُ اخْتِلَافًا فَاعْلَمُكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ“۔

ترجمہ: ”میری امت مگر اسی پر ہرگز جمع نہیں ہوگی، پس جب تم لوگ اختلاف دیکھو تو تم پر سواد اعظم (بڑی جماعت) کو لازم پکڑو، (ابن ماجہ: 3950)۔“

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

”فَإِنَّ يَدَ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ“۔

ترجمہ: ”جماعت کو اللہ کی تائید اور نصرت و حمایت حاصل ہے، (سنن النسائی: 4024)۔“

یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”فَاتَّبِعُوا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ، فَإِنَّهُ مَنْ شَدَّ شَدَّدِي النَّارِ“۔

ترجمہ: ”سواد اعظم (بڑی جماعت) کی اتباع کرو جو جماعت سے الگ ہوا، وہ جہنم میں گیا، (المستدرک للحاکم: 391)۔“

فرد واحد خواہ کتنا ہی ذہین و فطیین کیوں نہ ہو، وہ غلطی سے مبرأ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، چنانچہ مشہور مقولہ ہے: ”اجتماعی عقل انفرادی عقل سے بہتر ہے“، جس طرح اجتماعی معاملات میں مشاورت ضروری ہے اسی طرح انفرادی اور شخصی معاملات میں بھی مشاورت بہتر ہے اور جس سے کسی بات میں مشورہ کیا جائے، اسے چاہیے کہ اپنی رائے نہایت دیانت داری سے دے، کیونکہ حدیث پاک میں ہے:

”الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَهِنٌ“۔

ترجمہ: ”جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے، (ترمذی: 2822)۔“
اگر وہ بات راز ہے تو اس کی رازداری کو افشا نہ کرے۔



اہم سوالات

اسلام کی اخلاقی اقدار اور اسلامی معاشرے کے بنیادی اوصاف

- ۱۔ اخلاق کے معنی و مفہوم واضح کیجیے اور اسلام میں اخلاق پر روشنی ڈالیے۔
- ۲۔ صدقہ کی اہمیت پر ایک نوٹ لکھیے۔
- ۳۔ اسلام میں توکل کا صحیح مفہوم بیان کیجیے نیز بتائیے کہ توکل بے عملی اور کامی کا نام نہیں، بلکہ جہد کا نام ہے۔
- ۴۔ ”تقویٰ“ سے کیا مراد ہے؟
- ۵۔ ”ایفاے عہد“ ایک اعلیٰ انسانی وصف ہے، بحث کیجیے۔
- ۶۔ سادگی کا صحیح مفہوم اور فوائد بیان کیجیے۔
- ۷۔ ”اسلام والدین اور بزرگوں کا احترام سکھاتا ہے“، ثابت کیجیے۔
- ۸۔ ”رواداری اور وسعتِ نظر“ کا صحیح مفہوم اور فوائد بیان کیجیے۔
- ۹۔ ”معاشرت کا مفہوم“ بیان کیجیے اور بتائیے کہ ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل میں کون سے عناصر بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔
- ۱۰۔ اسلام میں عدل کا مفہوم کیا ہے۔ عدل اجتماعی کے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالیے:
 - (الف): معاشرتی عدل، (ب) سیاسی عدل، (ج): قانونی عدل
- ۱۱۔ اسلام کے تصور شورائیت“ کو واضح طور پر بیان کیجیے۔

تہذیب انسانی کی تعمیر میں اسلام کا حصہ

تہذیب کا معنی مفہوم:

”تہذیب“ عربی لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ”درخت کی غیر ضروری، فاضل اور غلط جہت میں اُگ جانے والی بے مقصد شاخوں کو تراشنا اور کاٹنا تاکہ صحیح سمت میں صحیح مند انداز میں اور متناسب طور پر درخت کی نشوونما ہو سکے اور اس کی کاشت (Plantation) کا مقصد پورا ہو سکے۔“

اسی سے تہذیب انسانی کی اصطلاح (Term) مأخوذه ہے جس کے معنی ہیں ”غمران“، تمدن اور (Civilization) یعنی اصلاح عقائد و اخلاق، نظام عبادات، نظام عدل اجتماعی اور تعلیم و تربیت کے ذریعے انسانیت کو اس طرح سُدھارنا اور سنوارنا کہ انسانی فرد (Individual) اور معاشرہ (Society) اخلاق رذیلہ، عاداتِ خبیثہ، جور و جبر، ظلم و تعدی، لوٹ کھسوٹ اور اوج نجح سے پاک و صاف ہو جائے اور انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی اوصافِ حمیدہ اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے مزین و مرصع ہو کر عدل و انصاف، امن و آشتی، اخوت و مساوات اور انسانی عظمت و وقار کا گھوارہ بن جائے اور انسانیت کو ایسا پر سکون اور صاف سُتھرا ماحول میتر آئے جس میں اس کی جسمانی اور روحانی ارتقاء متناسب اور متوازن انداز میں ہو سکے۔

حکماء و فلاسفہ نے تہذیب انسانی کے تین مدارج متعین کیے ہیں۔

۱۔ تہذیب النفس: جو فرد کی داخلی و خارجی اصلاح اور صحنت مندانہ نشوونما اور ارتقاء سے متعلق ہے۔

۲۔ تدبیر منزل: جو ایک گھر انے یا خاندانی نظام کی اصلاح و فلاح سے متعلق ہے۔

۳۔ سیاست مُدَن: جو ملکی، ملی، قومی اور اجتماعی تحفظ و بقا، نظم و ضبط، فلاح و کامرانی، عدل و انصاف اور مادی و روحانی ارتقاء سے متعلق ہے۔

تہذیب انسانی کے ارتقاء کا مادی یا تاریخی تجزیہ:

انسان کے تہذیبی سفر اور تہذیبی ارتقاء کیے بارے میں مادہ پرستوں کا نظریہ ہے کہ انسان اور انسانی تہذیب کا سفر نادانی، جہالت، برہنگی، درندگی اور دھشت و بربرتیت سے شروع ہوا اور مرحلہ بہ مرحلہ ترقی کے منازل طے کرتا ہوا انسان تہذیبی ارتقاء کی موجودہ منزل پر پہنچا ہے اور وہ اسے مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں جو زمانہ قبل تاریخ اور پھر وہ اور غاروں کے دور سے موجودہ سائنسی اور صنعتی دور تک ہے۔ تہذیبی ارتقاء کا یہ تصور (CONCEPT) اس نظریے پر مبنی ہے کہ انسان خود ہی اپنا ہادی، معلم اور رہبر ہے اور وہ اپنے علم، تجربے اور فطری صلاحیتوں کے مسلسل استعمال سے اس مقام تک پہنچا ہے۔

تہذیب انسانی کے ارتقاء کا اسلامی نظریہ:

جہاں تک انسان کی خالص مادی، فنی، صنعتی اور سائنسی ترقی کا تعلق ہے اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ یہ ایک ارتقائی عمل ہے اور جوں جوں انسانی معاشرہ آگے بڑھتا چلا گیا، اپنے طبعی اور فطری تقاضوں کی تکمیل کے لیے انسان نے نت نتی را ہیں تلاش کیں۔ قدرت کی ولایت کی ہوئی (Gifted) عقل کی عظیم نعمت کو کام میں لا کر اس نے نت نتی ایجادات کیں، اللہ کی کائنات کے مخفی دفینوں اور خزانوں سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اور انسانیت کا یہ سفر ان شاء اللہ جاری و ساری رہے گا۔

لیکن اسلام یہ تسلیم نہیں کرتا کہ قدرت نے انسان کو علم سے قطعی بے بہرہ، اخلاق سے عاری تہذیب سے نا آشنا اور با دی ورہنما سے محروم کر کے اس دنیا میں بھیجا۔ بلکہ اسلام یہ بتاتا ہے کہ انسانیت کا سفر جہالت کی تاریکی سے نہیں بلکہ علم کے نور سے شروع ہوا ہے اور قرآن بتاتا ہے کہ اللہ جل شانہ نے انسان اول حضرت آدم علیہ السلام کو زیور علم سے آراستہ فرمایا اور اس کی فضیلت و برتری کو ثابت کر کے فرشتوں کو اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ خالق کا مکوم ہے اور کائنات کا حاکم ہے۔ وہ کائنات اور مظاہر کائنات کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ کائنات کی ہر نعمت کو اللہ کی بندگی میں استعمال کرنے کے لیے آیا

ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنی معرفت بھی عطا کی اور ان تمام امور کی معرفت، وجدان اور علم بھی عطا کیا جن پر اس کی بقاء، نشوونما اور ارتقاء کا اختصار ہے اور ہر دور میں انبیاء کرام و رسولِ عظام کی صورت میں ایسے رہبرا اور ہادی مسجوث فرمائے جو اللہ سے ہدایت لیتے اور مخلوق تک پہنچاتے رہے اور اللہ کے بندوں کی رہبری فرماتے رہے۔

قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان زمین پر آنے سے پہلے اپنی غذائی ضروریات، ستر پوشی کی فطری ضرورت اور معبدِ حقیقی کی معرفت رکھتا تھا اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے ”خلیفۃ اللہ فی الارض“ تو بنادیا گیا ہو لیکن خلافت کے آداب، تقاضوں اور ضرورتوں سے محروم رکھا ہو، یہ تو تکلیف مالا یطاق (بے جا تکلیف) ہوتی جو قدرت اپنے بندوں پر نہیں ڈالتی۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت پر انسانیت کے عقلی، ذہنی اور فطری ارتقاء کا سفر بھی اپنے تکمیل دور میں داخل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بھی پایہ تکمیل تک پہنچ گئی۔ اس لیے اب نہ کسی نئی ہدایت کی ضرورت ہے اور نہ کسی اور ہادی کی۔ اب قیامت تک ہادی کامل حضرت محمد ﷺ کی اعتماد مبارک رہے گا۔

تہذیب انسانی کی تعمیر میں اسلام کا حصہ:

جب ہم اس عنوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ سامنے آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے تہذیب انسانی میں کیا انقلابی تبدیلیاں رونما ہو یعنی اور نورِ مصطفوی کے فیضان سے مستفیض و مستقید ہو کر مسلمانوں نے تہذیب انسانی کو کن رفعتوں سے ہمکنار کیا۔ علم و عمل کی فکر و نظر کے کن نئے زاویوں اور نئی جہتوں سے آشنا کیا، کن اعتقادی، روحانی و اخلاقی امراض اور کن تباہیوں، ہلاکتوں، بر بادیوں اور لعنتوں سے پاک کیا۔ اختصار کے پیش نظر ہم صرف چند عنوانات کی طرف اشارہ کر سکیں گے کیونکہ یہ صفات تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

مقام انسانیت کا عرفان:

انسان کے ذہن میں شعوری یا لاشعوری طور پر ہمیشہ سے یہ سوالات اٹھتے رہے

اور انسان ان کے حل کا متلاشی رہا کہ یہ کائنات کب سے وجود میں آئی اور اس کا انجام کیا ہے، انسان اور کائنات کی تخلیقِ محض ایک حادثہِ اتفاقی ہے یا اس کے پچھے کوئی مقصد کا فرما ہے، انسان کا مقصدِ تخلیق کیا ہے اور اس کا اپنے خالق اور اس کائنات سے کیا رشتہ ہے۔

انسان نے جب بھی اپنی عقل کی روشنی میں ان سوالات کا حل تلاش کیا، وہ راوی اعتدال بھٹک گیا اور افراط و تفریط کا شکار ہو گیا۔ کبھی اُس نے مظاہر کائنات کی پرسش کی اور اپنے مقام سے اتنا گر گیا کہ اپنے ہاتھ سے ترشے ہوئے پتھر کے بے جان اور بے حس و حرکت انصاف کو اپنا خدا، مالک و مختار اور معبد بنایا۔ کبھی اپنے مقام کے تعین میں حد سے اتنا آگے بڑھ گیا کہ خود خدا بن بیٹھا۔ کبھی اس نے اس دُنیا سے نفرت اور لاتعلقی میں نجات کی راہ تلاش کی اور کبھی اس کائنات اور یہاں کی حیات فانی ہی کو اُس نے سب کچھ سمجھ لیا اور اس کی حدود سے آگے دیکھنے اور سوچنے سے آنکھیں بند کر لیں۔

اسلام نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کیا اور بتایا کہ وہ اپنے ہاتھ سے ترشے ہوئے بُجُون یا انصافِ خیالی کی پرسش کے لیے نہیں، بلکہ خالقِ حقیقی کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے جو اس کا اور تمام کائنات کا خالق، قادر اور مختارِ مطلق ہے۔

اسلام نے بتایا کہ انسان اس کائنات اور مظاہر کائنات کی غلامی کے لیے نہیں، بلکہ اس پر حکمرانی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

(۱) ”وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالقَمَرَ“۔

ترجمہ: ”اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو سخّر و مطبع کیا، (الحل:

(۱۲)“۔

لَمْ تَرَأَنَ اللَّهَ يُولَجُ الظَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولَجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

(۲) ”أَلَمْ تَرَأَنَ اللَّهَ يُولَجُ الظَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولَجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَ

القمر۔"

ترجمہ: "کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تمہارے لیے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے مسخر کر دیا ہے، (لقمان: 29)۔" لیکن ساتھ ساتھ اسلام نے یہ بھی بتایا کہ تخلیق انسان کا مقصد وحید صرف یہی نہیں کہ وہ اس کائنات کا ہو کر رہ جائے اور اس کی ذہنی اور فکری پرواز اس کی گہرائیوں، و سعتوں اور بلندیوں سے آگے نہ بڑھ سکے، يقول علامہ اقبال:

قیامت نہ کر عالم رنگ و بو پر

چمن اور بھی آشیان اور بھی ہیں

بلکہ اسلام نے یہ بتایا:

جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

یعنی تخلیق انسان کا مقصد اور انسان کی منزل یہ ہے کہ وہ حیات و کائنات کی ان بے کراں نعمتوں سے استفادہ بھی کرے اور ان نعمتوں کا حق بھی ادا کرنے اور ان نعمتوں کا حق یہ ہے کہ وہ اپنے منبیع یعنی اللہ وحدہ لا شریک کی بندگی اختیار کرے اور اس کائنات میں اس کی خلافت و نیابت کا حق ادا کرتے ہوئے اس کی مرضی و منشاء کو سمجھے اور نافذ کرے اور وہ اپنے مدعا و مقصود اس زندگی کو بنائے جو آخرت کی زندگی ہے اور جوابدی و لاقانی ہے اور جس کا آغاز اس کائنات کے انجام پر ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے انسان کو کائنات اور مظاہر کائنات اور اپنے جیسے انسانوں کی بندگی اور غلامی سے نجات دلا کر کائنات کی حکمرانی اور اشرف الخلق کے مقام پر فائز کر دیا۔

شرف انسانیت:

اسلام نے انسان کو رنگ و سل، ذات پات اور علاقائیت کے امتیازات سے قطع نظر شرافت، تعظیم، تکریم اور فضیلت کا حق دار قرار دیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَلَقَدْ حَرَمْنَاهُنَّ أَدَمَ وَهَامَلَتُهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَأَكُلَّ مِنْهُمْ قَوْنَ الْكَنْتِلِتِ وَفَصَلَتُهُمْ عَلَى
جِنَّةٍ فَمَنْ خَلَقَنَّ لَعْنَيْلَا“ -

ترجمہ: ”ہم نے اولاد آدم کو عزت و عظمت عطا کی اور ان کو ذکری و تری میں سواری عطا کی (یعنی کائنات کو بنی آدم کے لیے سخرا کر دیا) اور پا کیزہ چیزوں سے روزی دی اور اپنے ملحوظات میں سے اکثر پرانہیں فضیلت عطا کی، (الاسراء: 70)۔“

اسلام کے عطا کردہ تصور شرف انسانیت کے چند نمایاں پہلو درب ذیل ہیں۔

اسلام نے بتایا کہ انسان پیدائشی اور موروثی طور پر پاپی اور گنہگار نہیں ہے جیسا کہ عیسائیت یا بعض دیگر مذاہب کا نظریہ ہے، بلکہ اسلام کا تصور یہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر پاک ہے، بے خطاء ہے اور صحیح فطرت پر پیدا ہوا ہے، نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

”مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَإِبَّوَاهُ يُهُودَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمْجِسَانِهِ“ -

ترجمہ: ”ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، آتش پرست یا نصرانی بنادیتے ہیں، (صحیح البخاری: 1359)۔“

لہذا کوئی بھی فرد قابل نفرت نہیں اور کسی کی بھی تحریر و تذلیل روائیں۔ اسلام نے بتایا کہ انسانی شرافت کا معیار رنگ و نسل یا کوئی مخصوص خطہ و علاقہ نہیں ہے، بلکہ ہر انسان کا ایمان و عمل اور اس کا کردار ہی شرافت کی کسوٹی ہے۔

وحدت انسانیت اور اخوتِ اسلامی:

اسلام نہ تو نسلی مذہب ہے اور نہ ہی کسی خاص قوم یا نسل کی برتری کا حاصل ہے، بلکہ یہ ایک تبلیغی مذہب ہے اور اس کے دروازے انسانیت کے ہر فرد کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

دین اسلام کے تمام پیروکار ایک اعتقاد اور ایک نظریہ حیات کے مانندے والے ہیں اور ان پر کاربند رہنے والے تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں خواہ ان کی رنگ، نسل، وطن اور زبان مختلف ہی کیوں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:



”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذَا خَلَقْنَاكُمْ قُنْدَ كُرْبَلَةِ أَنَّهُمْ شُعُورٌ بِأَوْقَاتِهِمْ فَلَمْ يَتَعَاوَذُوا إِنَّمَا أَكْرَمَنَا مَكْلُومٌ عِنْدَ اللَّهِ أَشْفَلُوكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِمْ حَمْدٌ“

”اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قبلے اور خاندان بنادیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقدم ہے، (الجبرات: 13)۔“

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

”لَا فَضْلَ لِعَرَبٍ عَلَى عَجَمٍ، وَلَا لِعَجَمٍ عَلَى عَرَبٍ، وَلَا أَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالشَّقْوَى“ -

ترجمہ: ”کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں نہ کسی کالے کو گورے پر نہ کسی گورے کو کالے پر، فضیلت کا معیار صرف تقوی ہے، (مندادحمد: 23489)۔“

غلامی کا بتدریج خاتمه:

غلامی کا تصور اور غلامی کی روایت اسلام کو درست میں ملی۔ اس دور کی تمام متمددن اقوام کی طرح عربوں میں غلامی کا رواج عام تھا۔ یونان کا مشہور دانشور اور فلسفی تصور غلامی کی وکالت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”پچھلوگ باطیح غلام پیدا ہوتے ہیں اور پچھا آزاد۔ اس لیے ظاہر ہے جس کسی کو غلامی سے فائدہ پہنچ سکتا ہے اسے غلام بنالینا ہی بہتر ہے اور عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔“

اسلام نے اسے تہذیبی درست کے طور پر قبول کیا اور اس کی خرابیوں کی فوری اصلاح اور ترمیح خاتمے کا طریقہ اختیار کیا۔ مثلاً:

(۱) اس دور میں غلاموں سے ان کی استطاعت سے بڑھ کر خدمت توں لی جاتی تھی، مگر ان کے حقوق پچھنہ نہ تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے غلاموں کو انسانی حقوق اور پدرانہ شفقت کا حقدار قرار دیا، خطبہ حجۃ الوداع میں آپ نے فرمایا:

إِنَّهُمْ جَعَلُوهُمْ أَيْدِيهِمْ، فَأَطْعَمُوهُمْ مِمَّا تَأْكُلُونَ، وَأَلْبِسُوهُمْ مِمَّا تَلْبِسُونَ، وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنَّ كَلْفَتُهُمْ فَأَعْيُنُوهُمْ“۔

ترجمہ: ”(حقیقت میں لوندی اور غلام) تمہارے بھائی ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے زیرِ گھر کیا ہے، اس لیے جو تم کھاتے ہو وہ انہیں بھی کھلا دے اور جو تم پہنتے ہو وہ انہیں بھی پہنا دے اور انہیں ایسے کام کی تکلیف نہ دو جو ان کی قوت و طاقت سے باہر ہو اور اگر بھی ایسا کام ان پر ڈال تو تم بھی اس میں شریک رہ کر ان کی مذکروں، (ابن ماجہ: 3690)۔“

(۲) وصال مبارک سے پہلے جو آخری کلمات آپ کی زبان مبارک سے سنے گئے وہ یہ تھے:
”الصَّلَاةُ، وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ“۔

ترجمہ: ”نماز کی پابندی کرنا اور غلاموں (ما تھتوں) کا خاص طور پر خیال رکھنا“۔

(ابن ماجہ: 1625)

(۳) اس دور میں جنگی قیدی غلام بنایے جاتے تھے اور مال غنیمت کے طور پر تقسیم ہوتے تھے بلکہ غلامی کی بنیادی شکل یہی تھی۔ مگر غزوہ بدر میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے یا قتل کر دینے یا قیدی بنانے کی بجائے فدییے کر آزاد کر دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا اور جو فدییہ کی رقم دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے انہیں ان کی خدمات (مثلاً مسلمانوں کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا) کے صلے میں آزاد کر دیا گیا۔

(۴) اس کے علاوہ ”مکاتبت“ کا تصور راجح کیا گیا، یعنی یہ کہ غلام کو محنت و مشقت کرنے یا تجارت وغیرہ کرنے کی آزادی دی جائے اور وہ ایک معینہ رقم (جبابہی مفاہمت سے طے پائے) آزاد نہ طور پر کام کراور جمع کر کے مالک کو دے دے تو مکمل طور پر آزاد ہو جائے گا۔

(۵) مختلف کوتاہیوں اور گناہوں کے کفارے کے طور پر (یعنی تلافی کے لیے) غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا، اگر خود غلام نہ رکھتا ہو تو خرید کر آزاد کرے، مثلاً: (۱) قتل خطا کا

کفارہ (۲) کفارہ ظہار (۳) کفارہ بیمین (قسم) (۴) کفارہ صوم، وغیرہ۔

(۶) ویے حصول ثواب کے لیے غلام آزاد کرنے کو اعلیٰ ترین نیکی قرار دیا گیا اور اس کی

ترغیب دی گئی۔

(۷) غلام یا غلامزادہ ہونے کو نگ و عار اور ذلت کا سبب قرار دینے کے بجائے ان کو دینی اعتبار سے آزاد انسانوں کے مساوی رتبہ دیا گیا، بلکہ بعض صورتوں میں ان کے ایمان و گردار کی بلندی کی وجہ سے انہیں دوسروں سے بھی بڑھ کر عزت و تکریم سے نوازا گیا۔ اسماعیل بن زید رضی اللہ عنہ کو جلیل القدر صحابہ کرام کی موجودگی میں اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا گیا اور حضرت بلاں رضی اللہ عنہ کی عقیدت و محبت آج بھی ہر مسلمان کے سینے میں موجود ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسے کئی روشن ستارے نظر آتے ہیں جو غلام تھے یا غلاموں کی اولاد، مگر ان کی عظمت کے نقش آج بھی صفحہ ہستی پر ثابت ہیں اور ان کے نور کی شمع آج بھی رویہ اول کی طرح فروزان ہے۔

عورتوں کے حقوق کی پاسداری:

اسلام سے پہلے عورت انسانیت کا ایک مظلوم اور ستم رسیدہ طبقہ تھا۔ عورت کو باعثِ نگ و عار سمجھا جاتا تھا۔ مختلف معاشروں اور سماج میں ان پر مظالم کی نوعیت مختلف تھی مثلاً:

(۱) عربوں میں تعداد و احتجاج پر پابندی نہ تھی، (۲) ہندوستان میں بیوہ یا تو مردہ شوہر کے ساتھ زندہ چتا میں چل کر مر جاتی اور یا ساری عمر بیوگی میں گزارتی، نکاح ثانی معیوب تھا، (۳) بعض معاشروں میں عورت کی حیثیت مملوک کی سی تھی، (۴) وراثت کی حق دار نہیں تھی، (۵) قرآن میں ہے کہ بعض عرب بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے اور بعض قبائل میں بیٹی کا پیدا ہونا باعثِ نگ و عار تھا۔

اسلام نے عورت کو عظمت عطا کی، ماں کی حیثیت سے حقوق میں اسے باپ پر بھی فضیلت دی، اسلام نے عورت کو حقوق عطا کیے اور استعمال سے نجات دلائی، مثلاً:

(۱) ایک سے زیادہ شادیوں کی (چار تک) اجازت دی مگر اسے "عدل" کے ساتھ مشروط کر دیا۔ (۲) بیوہ کو عقدِ ثانی کی نہ صرف اجازت دی بلکہ خود پر غیر اسلام نے اس سنت کو اپنی ذات سے جاری فرمایا۔

- (ن) خورت کو مہر کا حق دار قرار دیا اور اس کے مصارف کا بازار شوہر کے ذمہ قرار دیا۔
- (و) اس، بیوی، بیٹی اور دیگر حیثیتوں میں اسے دراثت کا حق دار بنایا۔
- (ز) علم کا دروازہ ان پر بند نہیں کیا بلکہ حصول علم کا حکم دیا، اور آپ خود بھی خورتوں کو احکام دین کی تعلیم دیتے تھے۔

مزہبی رواداری:

اسلام نہ اس امر کی اجازت دیتا ہے نہ اسے مستحب سمجھتا ہے کہ کسی کو جبرا اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ تَقْدِيرٌ تَبْيَانٌ الرُّسُدُ مِنَ الْعَقْلِ"۔

ترجمہ: "دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گرا ہی سے متاز ہو چکی ہے، (البقرۃ: 256)"۔

کیونکہ دین و مذہب کا تعلق انسان کے ذہن اور قلب و نظر سے ہے اور طاقت سے سرکو تو جھکا یا جاسکتا ہے، قلب کو نہیں۔ اسلام اس امر کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ دوسروں کے مذہب یا مذہبی پیشواؤں کی تذلیل کی جائے تاکہ ان کے لیے اسلامی اقدار اور پیغمبر اسلام کی تفہیص کا جواز پیدا نہ ہو۔ اسلام اپنی قلمرو میں غیر مسلموں کو اپنے مذہبی اقدار، عبادات اور شعائر پر کار بند رہنے کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنی حدود کے اندر رہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے نہ ہوں، یا کھلے بندوں مسلمانوں کو اپنے دین سے بر گشۂ کرنے کی کوشش نہ کریں۔

فروع علم:

اسلام نے انسان کو علم کی عظمت سے آشنا کیا۔ قرآن نے بتایا کہ علم ہی کی بدولت آدم علیہ السلام محبود ملائکہ بنے۔ قرآن کی پہلی وحی "إِقْرَا" سے شروع ہوتی ہے جو تعلیم و علم اور علم کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ حدیث میں عالم کو عابد پر فضیلت دی گئی ہے، علم دینی ہو یا دنیاوی، بہر حال اہم ہے۔ دینی علم کے بارے میں قرآن نے فرمایا:

"إِنَّمَا يَحْشُى اللَّهَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِلْمِ"۔

ترجمہ: "اللہ کی خشیت (او مرافت صحیح معنوں میں) علماء ہی کو نصیب ہوتی ہے۔" - (الفاطر: 28)

فارسی کا مشہور مصروف ہے: "بے علم تو اس خدار اشاخت" یعنی بے علم اور جامل خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔

دنیوی علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے "کلب معلم" یعنی شدھائے ہوئے اور سکھائے ہوئے کتے کے شکار کو حلال قرار دیا ہے کیونکہ کتاب اگرچہ ناپاک چیز ہے، لیکن چونکہ وہ سکھایا ہوا اور تربیت یافتہ ہوتا ہے، اس لیے اس کے بارے میں تصور کر لیا جاتا ہے کہ اس نے شکار کو ناپاک نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) "فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ" -

ترجمہ: "پس زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ (حق کو) جھلانے والوں کا انجام کیا ہو" - (الخل: 36)

(۲) "قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا أَكْثَرُهُمْ مُسْرِكِينَ" -

ترجمہ: "زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ پہلوں کا انجام کیا ہوا ان میں سے اکثر مشرک تھے، (الروم: 42)" -

مندرجہ بالا آیت اور اس طرح کی دیگر آیات میں سیر و سیاحت کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن محض تعیش اور تفعیج اوقات کے لیے نہیں، بلکہ گزشتہ اقوام کے حالات کا مشاہدہ کرنے اور ان کے عروج و زوال کے اسباب کو معلوم کرنے کے لیے۔ یہ علم تاریخ، فلسفہ، تاریخ اور علم آثار قدیمہ کی طرف اشارات نہیں تو اور کیا ہے۔

اسی طرح قرآن کی متعدد آیات میں انسان کو اپنے گردوپیش، حیات و کائنات، آفاق، سمندروں، فضاوں، خلاوں اور زمین و آسمان کی وسعتوں اور ان میں اللہ کی ظاہری اور مخفی قدرتوں اور حکمتوں پر غور فکر اور تدبیر و تکری کی تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَآخْتِلَافِ النَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ

مَوْتَهَا وَهُنَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ ذَآئْفَةٍ ۝ لَأَتَصْرِيفُ الزَّيْرَ وَالسَّحَابَ الْمُسْخَرَ ۝ بَلَىٰ إِنَّ السَّمَاءَ وَ
الْأَرْضَ لَا يَرْتَقِي مَوْعِدُهُنَّ ۝

ترجمہ: ” بلاشبہ زمین و آسمان کی تخلیق میں، گردش لیل و نہار میں اور ان کثیروں (یا جہازوں میں) جو لوگوں کو نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ تعالیٰ آنکھوں سے آمارتا ہے اور جس سے زمین مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانوروں کے پائے جانے میں، ہواویں کے چلانے میں اور ان بادلوں میں جوز میں و آسان کے درمیان اٹکے رہتے ہیں، ایسی نشانیاں ہیں جن پر اہل نظر غور کرتے ہیں، (البقر: 164)۔“

لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اس تدبیر و فکر کا مقصد محض دینیوی لفظ اندوزی اور راحتِ جسم و جان اور لذتِ کام و دہن نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اللہ کی قدرت و عظمت کا اعتراف ہونا چاہیے، چنانچہ فرمایا:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاحْتِلَافِ الْأَيْلِ وَالنَّهَارِ لَا يَرْتَقِي إِلَيْهِ الْأَذْبَابُ^٦
الَّذِينَ يَدْكُرُونَ اللَّهَ قَيْمًا وَقَعْدًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَسِيرُهُمْ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ سَرَبَنَامًا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْطَنَكَ فَقِنَاعَنَابَ الْكَارِ^٧۔

ترجمہ: ” بلاشبہ آسمان اور زمین کی پیدائش اور گردش لیل و نہار میں ان عقائد و دینوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹئے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں اور بے اختیار پکارا ٹھہتے ہیں:) اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، ہمیں آگ کے عذاب سے بچا“۔
(آل عمران: 191)

مسلمانوں کی علمی خدمات:

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”الْحَكْمَةُ الْحِكْمَةُ صَالَةُ الْمُؤْمِنِ، فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا“۔

ترجمہ: ” حکمت مومن کی متارع گمگشیہ (کھوئی ہوئی میراث) ہے، جہاں سے بھی ملے وہ

اے لے، کیونکہ وہی اس کا زیادہ حقدار ہے، (سنن ترمذی: 2687)۔

چنانچہ اپنے دور عروج میں مسلمانوں نے گرانقدر علمی خدمات انجام دی ہیں، جن کا اعتراف آج بھی متعدد ڈنیا کرتی ہے، چند مثالیں بطور نمونہ درج ہیں:

✿ سلم حکماء فلاسفہ نے فلسفہ یونان کو عربی زبان میں منتقل کیا اور پھر خالص علمی انداز میں اس کا روکیا اور اس کے لئے "علم الكلام" وضع کیا گیا۔

✿ علم ریاضی میں بعض مسلم ریاضی دانوں نے نمایاں خدمات انجام دیں، مثلاً: محمد بن موسیٰ الخوارزمی، عمر خیام، نصیر الدین طوسی، ابن الهیثم کے نام سر فہرست ہیں۔ خوارزمی الجبرا کو متعارف کرنے والی اولین شخصیات میں سے ہیں۔

✿ علم کیمیا کی ابتداء کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہے، مسلم کیمیا دانوں میں خالد بن یزید، امام جعفر صادق اور جابر بن حیان کے نام سر فہرست ہیں۔ نظری طبیعت میں فارابی، بوعلی سینا، محمد بن زکریا اور دیگر علماء نے نمایاں کام کیا۔

مندرجہ بالا علوم میں بہت سی چیزوں میں مسلمانوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے اور بہت سی چیزوں کے اولین موجہ مسلمان ہیں۔ اس کے علاوہ علم طب، علم جغرافیہ، سمندروں اور فلکیات کے بارے میں مسلمانوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

اہم سوالات

۱۔ تہذیب انسانی کی تعمیر میں اسلام کا حصہ (Contribution) کیا ہے، تفصیل سے بیان کیجیے۔

۲۔ فروع علم کے حوالے سے اسلام کی تعلیمات بیان کیجیے۔

۳۔ سائنسی علوم و فنون کے فروع میں مسلمانوں کی علمی خدمات کو بیان کیجیے۔

